ہمارا ادب

ہم عصر ڈراما نمبر

جموں اینڈ کشمیر

اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سالنامہ

ہمارا ادب

سرینگر، کشمیر

ہم عصر ڈراما نمبر	2016-17

نگراں : ڈاکٹر عزیز حاجنی

مدیر اعلیٰ : محمد اشرف ٹاک

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ/سرورق : فیروز احمد کمار

قیمت : ۵۰ روپے

اشاعت : ۲۰۱۶ـ۱۷

ISSN نمبر : 2277-9841

''ہمارا ادب میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آرا سے اکیڈیمی کا کُلًا یا جُزوًا اتفاق ضروری نہیں''۔

☆......خط وکتابت کا پتہ:

مدیر ''ہمارا ادب'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز

سرینگر/جموں

ای میل: salimsalik2012@gmail.com, saleemsaghar123@gmail.com

فون نمبرات: 9419711330, 9419072288

فہرست

حرفِ آغاز

ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے ہم عصر اردو شعری انتخاب نمبر، ہم عصر افسانہ نمبر اور ہم عصر ناولٹ نمبر کی اشاعت کی کامیاب کوششوں کو ہمارے قارئین نے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور اب ہم عصر ڈرامہ نمبر کی سوغات لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آج سے چار برس قبل ہم عصر تھیٹر نمبر قارئین کی نذر کیا تھا اور تب سے ہم عصر ڈراما کی اشاعت کی فرمائشیں موصول ہو رہی تھیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں ڈراما کا فن بہت سی آزمائشوں سے دوچار ہے۔ نئے ڈراما نگار بہت کم سامنے آ رہے ہیں اور معیار میں بھی وہ بات نہیں رہی جس کے لئے ریاست کے ڈراما نگار جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ زیرِ نظر اشاعت میں ہم نے ریاست کے بعض سرکردہ ڈراما نگاروں کی سوغاتیں شامل کی ہیں تاکہ ایک اجمالی خاکہ سامنے آ سکے۔ موقع و محل کے اعتبار سے کئی اور ڈراموں کے شامل کرنے کی بھی گنجائش تھی لیکن جو کچھ بدست ہے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

ادارہ اُن تمام ڈراما نگار حضرات کا بے حد ممنون ہے جنہوں نے ہماری گزارش کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے ہمیں اپنی نگارشات سے نوازا ہے۔ اردو شعبہ کے اراکین کا شکریہ ادا کرنا ایک خوشگوار فریضہ ہے جنہوں نے اِس وقیع پروجیکٹ کو کامیابی سے ہم کنار کرایا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اِس کوشش کو نظرِ تحسین سے دیکھا جائے گا۔ اِس سلسلے میں ہمیں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

☆......محمد اشرف ٹاک

☆......نور شاہ

میری دھرتی، میری جنت

صبح کا وقت!

(پسِ منظر میں گولیوں کی گھن گرج دور سے سنائی دیتی ہے اور پھر بچوں اور عورتوں کی چیخ وپکار...... یہ آوازیں آہستہ آہستہ فیڈ اوٹ ہو جاتی ہیں اور دھیمی سی موسیقی ابھرتی ہے)

سجاد: (خود کلامی) یہاں کچھ بھی نہ ہوگا یہ کبھی نہ سوچا تھا۔ موت کی سی ویرانی ہے، ہر سمت دھول اُڑ رہی ہے، دھوئیں کے کثیف بادل اُٹھ اُٹھ کر فضا میں بکھر رہے ہیں۔

(......موسیقی میں تیزی آجاتی ہے اور پھر مدھم پڑ جاتی ہے......!)

سجاد: کل تک وہ چھوٹا سا بنگلہ ہلکی دھوپ کی چھاؤں میں کھڑا میری روح کی تسکین کا باعث تھا اور اب یہاں جھلستی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کا ایک اُنبار ہے اور بے کراں سناٹا......اور میری بجھی بجھی سی آنکھیں مٹی اور راکھ کے اس انبار تلے جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں......(لمبی آہ بھرتا ہے) آس پاس کے چند مکانوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہے اور ان کے مکین......کہاں گئے یہ سارے......

(......خوفناک موسیقی ابھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے......)

سجاد: لیکن مجھے اپنے گھر کے مدفن کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ جن پھولوں سے کبھی مہک ابھرتی تھی، خوشبو آتی تھی وہ پھول اب مُرجھا چکے ہیں، جل چکے ہیں۔ بالکل یہیں، اسی جگہ پھولوں کی کیاریاں تھیں اور اب یہاں کچھ بھی نہیں...... اِن کیاریوں میں پانی دیتے وقت جب نازش ہنستی تھی تو اُس کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہوتا تھا۔

(......نازش کے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی ہے...... ایک طویل ہنسی...... اور پھر موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......)

سجاد: اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی نیند سے بھرپور انگڑائیاں مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے لپکی تھیں۔ میرا مکان...... میرا گھر...... ہم دونوں کے رہنے کی جگہ...... ہم دونوں کا گھر...... میرا اور نازش کا گھر......

......میرا اور نازش کا گھر......

(موسیقی اُبھرتی ہے اور جیسے دور سے نازش کی آواز اُبھرتی ہے۔)

نازش: آ گئے۔

سجاد: ہاں۔

نازش: بہت دیر کر دی آتے آتے......

سجاد: تم انتظار کر رہی تھی۔

نازش: ہاں حسبِ معمول...... روز کی طرح......

سجاد: اب اندر آنے کو نہیں کہو گی......

نازش: آتے کیوں نہیں......

سجاد: تم جو دروازے پر کھڑی، ہو میرا راستہ رو کے......

(......دونوں ہنستے ہیں اور آہستہ سے یہ ہنسی فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......)

(......موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے......)

سجاد: ہاں...... ہاں یہی تو ہمارا گھر تھا، ہمارے رہنے کی جگہ...... کیا نہیں تھا اس گھر میں......اس کی اُدھ جلی دیواروں میں اب بھی میری اور نازش کی محبت کے کتنے ہی ان گنت لمحات پوشیدہ ہیں...... مجھے یاد آ رہا ہے......نازش اس گھر میں میری شریک سفر بن کر آئی تھی اور یہاں اس گھر میں ہماری محبت کو ابدیت مل گئی تھی...... مجھے یاد آ رہا ہے یونیورسٹی کا وہ زمانہ...... وہ ماحول جہاں ہم پہلے دوست بنے تھے اور یہ دوستی آہستہ آہستہ محبت میں بدل گئی۔

(تیز موسیقی کی ایک لہر)

سجاد: پیار کی قندیلیں جلا کر تم نے میری تاریک راہوں میں زندگی کی روشنی بکھیر دی ہے۔

نازش: محبت کی شمعیں جلتی ہیں اور جل کر ہی روشنی بکھیرتی ہیں۔

سجاد: ہاں نازو......محبت کی یہ شمعیں اب ہمیشہ ہمیشہ جلتی رہیں گی۔ ہماری زندگی اس روشنی سے تاباں رہے گی لیکن......

نازش: لیکن کیا

سجاد: تم جانتی ہو کہ ہماری تعلیمی زندگی کا دور ختم ہو رہا ہے، چند دنوں میں فائنل رزلٹ آنے والے ہیں اور پھر......؟

نازش: پھر کیا......

سجاد: تم جانے کہاں چلی جاؤ گی......

نازش: جانتی ہوں کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔

سجاد: میں بھی تو کچھ جان لوں۔

نازش: میں......میں

سجاد: ہاں ہاں کہو......رُک کیوں گئیں

نازش: (ہنستے ہوئے) میں تو اپنے گھر جاؤں گی......

سجاد: گھر۔

نازش: ہاں گھر اور جانتے ہو میرا گھر کہاں ہے

سجاد: نہیں تو......

نازش: بتادوں......

سجاد: ہاں ہاں اب تو بتا ہی دو......دل گھبرا رہا ہے۔

نازش: تو سنو...... ذرا اپنا کان ادھر لے آؤ...... ہاں...... ہاں...... ایسے ہی اور اب سنو......میرا گھر وہی ہے جو تمہارا گھر ہے۔

سجاد: (خوش ہوکر) سچ

نازش: بھلا میں جھوٹ کیوں بولوں۔

سجاد: You are great...... یہ کہہ کر تم نے میری محبت کو ابدیت بخشی ہے، ایک لافانیت عطا کی ہے۔کبھی نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ You are great, the greatest

نازش: (ہنستے ہوئے) Really؟

(دونوں بھر پور قہقہہ لگاتے ہیں۔ موسیقی اُبھرتی ہے اور پھر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے۔شادی کا منظر......شوروغل......اور پھر مولوی صاحب کے قرآن پڑھنے کی آواز اُبھرتی ہے۔ جیسے نکاح خوانی کی تقریب ہو رہی ہو اور پھر یہ آواز بھی فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......)

سجاد: (ہنستے ہوئے) ارے تم شرما رہی ہو...... اور وہ بھی مجھ سے...... اپنے سجاد سے......کچھ بولو تو سہی......تمہاری یہ خاموشی اچھی نہیں لگی...... چلئے آج میں ہی بولتا ہوں......میری بات سننے کے لئے تیار ہو......تو سنو...... تمہیں اپنے اتنے قریب دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے......

نازش: جیسے کیا......

سجاد: ارے تمہارے ہونٹوں کو بھی زبان مل گئی...... میں تو سوچ رہا تھا کہ ساری عمر مجھے ہی بولنا پڑے گا۔

نازش: (ہنستے ہوئے) اور ساری عمر مجھے سننا پڑے گا...، یہی نا......

Change Over

(جیپ چلنے کی آواز......اور پھر رُکنے کی آواز......قدموں کی آہٹ......دروازہ کھٹکھٹانے کی صدا۔ اور پھر دروازہ کھولنے کی آواز اُبھرتی ہے)

نازش: آگئے۔

سجاد: جی ہاں۔

نازش: کیا لاؤں آپ کے لئے.....ٹھنڈا گرم......چائے......کافی۔

سجاد: نہیں، ابھی کچھ نہیں۔

نازش: پھر بھی کچھ۔

سجاد: جی ہاں۔

نازش: کیا۔

سجاد: آپ کا کرم......آپ کی عنایت، آپ کی محبت۔

نازش: لیکن ان سے بھوک نہیں مٹتی۔

سجاد: جی ہاں، جانتا ہوں لیکن آپ کی صورت میں نہ جانے کیسا جادو ہے کہ دیکھتے ہی پیٹ کی بھوک مٹ جاتی ہے اور......

نازش: اور کیا......

سجاد: آنکھوں کی بھوک بڑھتی ہے

نازش: دیکھئے کیپٹن صاحب، آپ اپنی فوجی یونیفارم اُتار دیجئے۔ سیولین لباس میں شریفوں کی طرح ہمارے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ گرم گرم کافی پی لیجئے۔

سجاد: فوجی یونیفارم میں کیا ہم شریف نظر نہیں آتے۔

نازش: نہیں ایسی بات نہیں، گھر میں گھریلو لباس ہی بھلا لگتا ہے اور یہ ہمارا گھر ہے جنگ کا کوئی میدان تو نہیں۔

سجاد: آپ کے سامنے جو کتاب پڑی ہے یہ تو جنگ کے بارے میں ہے۔ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......

نازش: جی ہاں جنگ کے پس منظر میں ایک بڑی درد بھری کہانی کو قلم کار نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سجاد: مجھے شاید جانا پڑے۔

نازش: (گھبرا کر) جانا پڑے......کہاں......

سجاد: کسی Foreign Country میں۔

نازش: کسی ٹرینگ کے سلسلہ میں۔

سجاد: نہیں تو۔

نازش: پھر۔

سجاد: ایک Peace Mission ترتیب دیا جا رہا ہے۔انٹرنیشنل لیول پر۔ ہمارے ملک سے بھی کچھ فوجی اور غیر فوجی آفیسرز کو اس مشن میں شامل ہونے کے لئے Nominate کیا جا رہا ہے۔ میرا بھی Selection ہو چکا ہے۔ It is being done at the highest level۔ بہت بڑا اعزاز ہے میرے لئے......کیپٹن سجاد کے لئے......لگتا ہے کہ تم میرے اس اعزاز سے خوش نہیں ہو۔

نازش: نہیں تو......لیکن جانا کہاں ہے، کون سی کنٹری ہے وہ

سجاد: اس کے بارے میں ابھی اطلاع نہیں دی گئی ہے۔ We have been told to be ready اور سنو۔

نازش: کیا۔

سجاد: اس Delegation میں دنیا کے اُن دوسرے ممالک سے بھی فوجی اور غیر فوجی آفیسرز کو شامل کیا جا رہا ہے جو تشدد، خون خرابہ اور دہشت گردی میں یقین نہیں رکھتے ہیں۔

نازش: لیکن وہاں......I mean to say۔اس ملک میں آپ کا رول کیا ہوگا۔

سجاد: Very Important Role۔امن اور شانتی کو فروغ دینا، بھائی چارے کا ماحول پیدا کرنا...... ملک کی معیشت کو سنبھالنا اور سنوارنا...... وہاں کے لوگوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا۔ سنا ہے کہ اس ملک کو دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے مگر ہم سب کو مل جل کر ایک ایسا لائحہ عمل اپنانا ہوگا کہ دہشت گردی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو۔

نازش: کیا ایسا ممکن ہے......

سجاد: ہاں ایسا ممکن ہے۔ لیکن اس کے لئے Sincereity اور Dedication کی ضرورت ہے۔

نازش: کب جانا ہوگا اور کتنے دنوں کے لئے......

(موسیقی کی ایک تیز لہر اُبھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

سجاد: کسی بھی وقت جانے کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ کب تک وہاں رہنا ہوگا ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے ہر پل ہر گھڑی اپنے قریب پاؤ گی۔

نازش: (افسردہ انداز میں) کیسے......

سجاد: میں تمہارے دل کی دھڑکن بن کر تمہارے پاس رہوں گا (ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے)......تمہارے ذہن کی سوچ بن کر تمہارے وجود میں پوشیدہ رہوں گا اور......

نازش: (بات کاٹتے ہوئے) جانے بھی دیجئے کیپٹن سجاد...... کیا معلوم وہاں جا کر ہماری یاد بھی آئے گی۔ چلئے اب Change کر لیجئے۔ تب تک میں کافی بنا لیتی ہوں۔

(موسیقی میں شدت آتی ہے اور فیڈ آؤٹ......)

Change Over

سجاد: (خود کلامی) بس ایک خواب تھا جو لمحہ بن کر ٹوٹ گیا، ٹوٹ کر فنا ہو گیا۔ اب کچھ بھی نہیں، ہاں راکھ اور مٹی ہے اور یہ ٹوٹا ہوا جلا ہوا کھلونا...... نازش اور میرے پیار کا سنگم ٹوٹ چکا ہے۔ وہ کلی مسلی جا چکی ہے...... وہ پھول مرجھا چکا ہے۔

(موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی سجاد کے رونے کی آواز اُبھرتی ہے۔)

سجاد: (روتے ہوئے) میرا بیٹا...... میری خوشیوں اور تمناؤں کا مرکز، میرے مستقبل کی تعبیر، مجھے دیکھے بغیر ہی جانے راکھ کے کس ڈھیر کے نیچے سو چکا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، پھر کبھی نہ دیکھنے کے لئے، پھر کبھی نہ ملنے کے لئے۔

سجاد روتے روتے رُک جاتا ہے اور پھر موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

سجاد: مجھے یاد آرہی ہے وہ شام...... اُس شام کی پیاری پیاری باتیں، نازش اور میری باتیں، وہ شام جیسے سارے جہاں کی خوشیاں میرے لئے سمیٹ کر لائی تھی...... ہاں نازش نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ ماں...... میرے بچے کی ماں...... ہم دونوں کا بچہ......

(......وقفہ......)

(......کوئی پیکٹ کھولنے کے تاثرات......)

سجاد: اب آ...... وُ بھی نا

نازش: بڑے بے قرار نظر آرہے ہیں آپ...... کوئی خاص بات......

سجاد: ہاں بڑی خاص بات ہے۔ ایک دم Confidential۔ آؤ تو سہی

نازش: کہیے، کیا ہے۔

سجاد: بس دیکھتی جاؤ۔

نازش: ارے یہ کیا......

سجاد: کھلونے......

نازش: کس کے لئے......

سجاد: مُنے کے لئے......

نازش: مُنے کے لئے (ہنستی ہے) ابھی سے۔سندر ہیں......

سجاد: کون......

نازش: یہ کھلونے......

سجاد: میں سوچ رہا تھا میری تعریفیں ہو رہی ہیں......

نازش: جی نہیں، آپ کی نہیں......

سجاد: میرا مُنا بھی خوبصورت ہوگا......سندر ہوگا......

نازش: آپ کیسے کہتے ہیں کہ لڑکا ہی ہوگا......

سجاد: میرا دل کہتا ہے......

نازش: اور میں کہتی ہوں کہ لڑکی ہوگی......ایک پیاری سی منی......

سجاد: دیکھتے ہیں کہ مُنے کا باپ جیت جاتا ہے یا منی کی ماں......

(......دونوں ہنستے ہیں......اوراسی ہنسی کے دوران ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز اُبھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے......)

Change Over

(......فون کی گھنٹی بجتی ہے، ریسور اٹھانے کی آواز......)

سجاد: Captain: Sajad Speaking

Sir - That has been done - After the meeting was over, I had a talk with Maj: Peter - Yes Sir - we will jointly sort out the matter - Right Sir .... Thank You Sir..........

(.....فون کا ریسور نیچے رکھنے کی آواز......)

سجاد: (خود سے) ارے یہ کیا......نازش کا خط......

(خط کھولنے کی آواز......)

سجاد: میرے اچھے ساتھی

(.....اور پھر سجاد کی آواز نازش کی آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نازش کی آواز میں......) ہاں میں ہار گئی اور تم جیت گئے......لڑکا ہوا ہے ہمارے ہاں......تمہارے جیسا، تم کب آرہے ہو اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے......اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی معصوم آنکھیں تمہیں تلاش کر رہی ہیں جیسے وہ اپنے کومل نرم نرم ہونٹوں سے تمہیں پاپا کہنے کی کوشش کر رہا ہے......بولو کب آرہے ہو۔

(.....نازش کی آواز......سجاد کی آواز کے بدلے......)

تمہاری اپنی......نازش۔

(اور پھر دور سے بچے کی آواز سنائی دیتی ہے......)

پاپا......پاپا......اور فیڈ آؤٹ

سجاد: (ہنستے ہوئے) I am a father now......میں آؤں گا نازش......ضرور آؤں گا......تم سے ملنے......اپنے پیارے بیٹے کو دیکھنے......

(فون ڈائل کرنے کی آواز......)

سجاد: Capt: Sajad this end, could I come to see the Boss: Thank You

فون کا ریسور رکھنے کی صدا اور فیڈ آؤٹ)

......وقفہ......

(آہستہ سے کمرہ کھٹکھٹانے کی آواز اور پھر دروازہ کھولنے کی صدا)

آفیسر: Yes Come in

سجاد: Thank You, Sir

آفیسر: How are you Captain

سجاد: Fine Sir

آفیسر: Pl. sit down

سجاد: Thank You Sir

آفیسر: کیسے آنا ہوا۔ صبح تو ہم مل چکے ہیں، کوئی خاص بات...... آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔

سجاد: سر یہ لیٹر ہے، میرے نام

آفیسر: Oh, I see

سجاد: یہ میری مسز کا لیٹر ہے۔ کشمیر سے آیا ہے۔ میرے گھر سے......

آفیسر: (ہنستے ہوئے) ہاں ہاں جانتا ہوں کہ آپ جموں و کشمیر سٹیٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا گھر کشمیر میں ہے۔ ویسے آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں I mean excited کوئی خاص بات......

سجاد: Yes, Sir میں باپ بن گیا ہوں، ایک بیٹے کا باپ......

آفیسر: Congratulations...... بہت بہت مبارک......

سجاد: Sir, I have a request

آفیسر: ہاں ہاں بولئے......

سجاد: میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ کشمیر...... For a brief visit

آفیسر: کشمیر؟ (آہ بھرتا ہے) کشمیر...... جنت کشمیر......

سجاد: Kindly allow me

(......بہت شدت کی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے......)

سجاد: سر میں چلا جاؤں

آفیسر: کیپٹن میں جانتا ہوں کہ آپ کا گھر جانا ضروری ہے لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ آپ اپنے گھر، اپنے شہر اور اپنے ملک سے دور یہاں ایک مقصد لے کر آئے ہیں اور وہ مقصد ہے اس دیش میں امن وشانتی قائم رکھنا، اس ملک کی سالمیت کی حفاظت کرنا، اس مقصد کی بقاء کے لئے نہ صرف ہمارے ملک سے فوجی آفیسرز یہاں آئے ہیں بلکہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ دوسرے ملکوں سے بھی فوجی اور غیر فوجی آفسریں یہاں موجود ہے

سجاد: سر میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ I am a part of this team۔ میں جانتا ہوں کہ یہ فیصلہ انٹرنیشنل لیول پر ہوا ہے لیکن میرا

آفیسر: (بات کاٹتے ہوئے) آپ ایک اچھے آفیسر ہیں، اس ملک میں امن وشانتی قائم کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، یہاں کے بے سہارا اور لاچار لوگوں کے ساتھ مل جل کر اُن کی اُمیدوں میں رنگ بھر دیا ہے۔

سجاد: سر مجھے اس بات کا پورا پورا احساس ہے لیکن میرا گھر، میرا شہر، میرا ملک وہاں بھی تو میری ضرورت ہے۔ میں صرف اپنے بچے کو دیکھ کر لوٹ آؤں گا...... بہت جلد

آفیسر: اور وہاں (خاموش ہو جاتا ہے)......

سجاد: سر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں

آفیسر: ہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے شہر کو حالات نے ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے جہاں زندگی ریزہ ریزہ ہو چکی ہے اور وہاں خود کو تلاش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ میں ایک آفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست، ایک رہبر کے حیثیت سے کچھ کہنا چاہوں گا۔

سجاد: کہیے سر

آفیسر: آپ اپنی بیوی اور بچے کو وہاں سے لے آؤ۔ I shall provide you all the facilities

سجاد: وہاں سے لے آؤں مگر کیوں؟ سر ہمارا بچہ ہوا ہے۔ نازش اور میرا بچہ، اُس کو اسی جنت میں پلنا ہے، پنپنا ہے، پڑھنا لکھنا ہے، آگے بڑھنا ہے، اُسی جنت میں، اُسی دھرتی میں اپنے مستقبل کو سجانا اور سنوارنا ہے۔

آفیسر: اور وہ جنت، آپ کی وہ دھرتی......آپ شاید بھول رہے ہیں، آپ کی وہ جنت آہوں اور کراہوں سے ہم کنار ہو چکی ہے، اُس جنت میں موت اور ویرانی کا سناٹا ہے، اُداسیوں نے گھیر رکھا ہے سارے کشمیر کو......وہاں ہلچل تو ہے لیکن بے جان، آواز تو ہے لیکن خوف سے سہمی ہوئی، ڈری ہوئی۔

سجاد: جانتا ہوں سر، لیکن آپ ہی بتایئے اس کا ذمہ دار کون ہے۔

آفیسر: I don't know

سجاد: آپ شاید واقعی نہیں جانتے۔ میں بھی نہیں جانتا لیکن کبھی نہ کبھی ایک مورخ ضرور پیدا ہوگا جو اس کی تاریخ لکھے گا......اور تاریخ......کسی بھی ملک کی ہسٹری ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

آفیسر: تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی آفیسر:

سجاد: اب میرے لئے کیا حکم ہے۔

آفیسر: ٹھیک ہے، آپ جانے کے لئے بضد ہیں، میں چھٹی منظور کرتا ہوں۔ آپ اپنا چارج کیپٹن ورما کو دیجئے......

سجاد: Right Sir

آفیسر: You can now proceed on one months earned leave...

سجاد: Thank you Sir

آفیسر: آپ جانے کی تیاریاں کر لیجئے......Ask my PA to book your seat

سجاد: Thank you very much, Sir

آفیسر: My good wishes are with you

(......وقفہ......موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے......)

(......ہوائی جہاز چلنے کے تاثرات......اور فیڈ آؤٹ)

Change Over

سجاد: (خود کلامی)......اور یہ میرا ملک ہے، میرا شہر ہے......میرا گھر ہے...... یہ میری دھرتی ہے، میری جنت ہے۔ کل تک یہاں زندگی تھی، زندگی کی رونق تھی، گہما گہمی تھی اور آج......آج یہاں کچھ بھی نہیں، کوئی زندگی نہیں۔ صرف دھواں ہے، میں چیخنا چاہتا ہوں، چلانا چاہتا ہوں، اتنی اونچی آواز میں کہ اس ہولناک سناٹے کا دل کانپ کر رہ جائے...... اور ان سنسان اور ویران کھنڈروں میں میری اس چیخ کی ایسی بازگشت سنائی دے کہ سارا عالمِ انسانیت درد و غم سے پھٹ کر رہ جائے......لیکن میں خاموش ہوں۔

(......تیز ہوائیں چلنے کے تاثرات...... اور ان ہواؤں کے پسِ منظر میں خاموش خاموش کی آواز اُبھرتی ہے...... پاپا...... پاپا......ہواؤں میں اور شدت آجاتی ہے اور وقتاً نازش کی آواز ابھرتی ہے......!!)

نازش: آپ آگئے۔

سجاد: ہاں......

نازش: لیکن آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی......میں اور آپ کا بیٹا کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے تھے......آپ کے آنے سے پہلے ہی وہ آگئے۔

سجاد: وہ کون

نازش: میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھے......سب کچھ اجاڑ کر چلے گئے......آپ کی دنیا آپ کی کائنات، آپ کی جنت کو اجاڑ کر چلے گئے...... کچھ نہیں بچا آپ کے لئے......نہ میں اور نہ ہی آپ کا بیٹا......

(......آواز بند ہو جاتی ہے اور سجاد پاگلوں کی طرح رونے لگتا ہے......!)

سجاد: (روتے ہوئے) نازش۔نازش کہاں ہوتم...... کہاں ہے میرا بیٹا، نازش سامنے تو آؤ...... میرے لئے، صرف میرے لئے...... (آہستہ سے) کوئی نہیں آیا میری اس جنت کو بچانے کے لئے...... کوئی بھی نہیں۔

(تیز موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

نازش کی آواز۔ نہیں، کوئی نہیں آیا...... ہمارے دیکھتے دیکھتے کوئی نہیں آیا...... شاید ہمارے جانے کے بعد آئے ہوں لیکن کیا فائدہ...... ہماری رکھوالی کرنے والے ہمیں بچانے والے...... اگر آئے بھی ہوں گے تو انہیں کیا ملا ہوگا...... ہماری جھلسی ہوئیں لاشیں...... بےحس بے جان، بے کفن......!

(ہواؤں میں شدت آجاتی ہے اور نازش کی آواز فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے......!!)

سجاد: (روتے ہوئے) شام کو اندھیرا پھیلے گا تو کون میرا انتظار کرے گا، کون میرے قدموں کی چاپ کا منتظر ہوگا۔ چاندنی راتوں میں کون مجھ سے محبت بھری باتیں کرے گا...... کوئی نہیں...... کوئی نہیں...... اب کوئی نازش دلہن بن کر نہیں آئے گی، کوئی نازش میرے بچے کی ماں نہیں بنے گی، بچوں کا کوئی کھیل نہ ہوگا۔

(......وقفہ......اور پھر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے......!)

سجاد: میں جا رہا ہوں۔ ایک طوفان لئے، ایک خلش لئے...... ہاں سوچ رہا ہوں، میں اپنے ملک اپنے شہر اور اپنے گھر سے بہت دور اُن کی جنت کی رکھوالی کر رہا تھا، وہ جنت میری تو نہ تھی، اُن لوگوں سے میرا کوئی رشتہ تو نہ تھا، وہ میرے ہم وطن نہیں تھے، ہم زباں اور ہم ذات نہ تھے پھر بھی میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اُن کی جنت کی رکھوالی کر رہا تھا، امن اور شانتی کا پیغام دے رہا تھا، اُن کے ملک کو سنوارنے اور سجانے میں ایک اہم رول ادا کر رہا تھا...... اور یہاں...... میرے وشال ملک میں، میرے اپنے کشمیر میں میری جنت کی رکھوالی کرنے والوں نے اِسے ویرانے میں بدل دیا۔ کیوں، کس کے لئے......؟!

(موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے)

سجاد: میں نہیں جانتا...... یہ سب کیوں ہوا، کیوں ہوا...... میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، شاید کس کے پاس بھی نہیں۔ اُن کے پاس بھی شاید نہیں جو میری جنت کو اجاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔

(موسیقی کی ایک لہر)

سجاد: ہاں میں جارہا ہوں، لیکن کہاں...... کہاں ہے میری منزل۔ کون لکھے گا میری جنت کی کہانی......کون جوڑے گا اِتہاس کی کڑیاں...... کشمیر...... میرا کشمیر...... کون لکھے گا میرے کشمیر کی کہانی......

(موسیقی کی ایک اور لہر)

دور سے ایک آواز اُبھرتی ہے......

اگر فردوس بروئے زمین است............

............فیڈ آوٹ............

............☆☆☆............

☆......ظہورالدین

موت کا جزیرہ

یہ جزیرہ ایک آزاد جمہوری ملک ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران اس جزیرے میں عورتوں کو جس طرح سے ذہنی وجسمانی، جنسی وجذباتی اور اخلاقی واقتصادی استحصال کا نشانہ بنایا جارہا ہے اُس سے پوری قوم میں بے اطمینانی کی ایک ایسی لہر پیدا ہوگئی ہے کہ سارے سیاسی وسماجی اور قانونی وانتظامی اداروں پر سے لوگوں کا یقین اُٹھتا جارہا ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود پولیس عورتوں پر ہورہے مظالم کا سدباب تو دور کی بات ہے اُنہیں کم کرنے کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں کرپارہی ہے۔ تیزابی حملے، جنسی درندگی، گھریلو تشدد اور اقتصادی استحصال کا جس طرح ملک میں کھلم کھلا مظاہرہ ہورہا ہے اور مجرموں کو سزا دینے میں عدالتیں جس طرح سے خود کو ناکام ہوتی پارہی ہیں اُس سے خواتین میں جہاں ایک طرف خوف وہراس پھیلتا جارہا ہے وہیں ایک ایسی بیداری کی لہر بھی پیدا ہوتی جارہی ہے جو لگتا ہے مستقبل قریب میں کوئی سنگین صورت اختیار کرنے والی ہے۔ اس بیداری کی وجہ سے انہوں نے مقامی وقومی دونوں سطحوں پر خود کو منظّم کرنا شروع کردیا ہے۔ جس نے بالآخر ایک قومی تنظیم کی شکل اختیار کرکے تحریک کا روپ اختیار کرلیا ہے۔ اس تنظیم کا نام ''متحدہ محاذ برائے تحفظ خواتین'' ہے۔ اس کی قیادت میں پورے ملک میں مظاہرے ہورہے ہیں تاکہ حکومت کو ایسے موثر اقدامات کرنے پر مجبور کیا جاسکے تاکہ کسی کو صنف نازک کی طرف بُری نظر سے دیکھنے کا حوصلہ نہ ہو۔ آج اسی تنظیم کے مرکزی دفتر میں قومی مجلسِ مشاورت کا ہنگامی اجلاس ہورہا ہے۔ جو اگرچہ حال ہی میں ہوئے ایک

جنسی درندگی کے واقعے پر غور کرنے کے لئے بلایا گیا ہے لیکن دوسرے اہم امور پر بھی غور وخوض کئے جانے کا امکان ہے۔ مجلسِ مشاورت میں ملک بھر سے آئی ہوئی مندوب خواتین شرکت کر رہی ہیں۔ مرکزی تنظیم کی صدر اجلاس سے خطاب کرتی ہوئی فرما رہی ہیں:۔

صدر: ...... مجھے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا، وہ میں کہہ چکی، اگرچہ مجھے یہ بھی علم ہے کہ میں نے جو کچھ کہنا ہے اُس میں سے بہت سا آپ پہلے سے جانتی ہیں۔ کیوں کہ ہم چاہے دیہات میں رہتی ہوں یا شہروں میں، ہمارے مسائل ایک سے ہیں۔ عصمت دری چاہے کسی کھیت کھلیان میں ہو، کسی سڑک پر چلتی بس میں یا کسی گھر کی چار دیواری میں، وہ عصمت دری ہی ہوتی ہے۔ عورت کو ایک ہی طرح کی ذلت، ایک ہی طرح کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ اُس پر تیزاب بھرے بازار میں پھینکا جائے یا کسی بند کمرے میں، تیزاب کا اثر ایک ہی طرح سے ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم متحد ہو کر اس مسئلے کے سدباب کے لئے جدوجہد کریں۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ مرد اساس سماج میں انصاف حاصل کرنا بہت مشکل اور بڑے حوصلے کا کام ہے۔ قدم قدم پر نئی ذلتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کئے بغیر اب چارہ بھی نہیں ہے۔ اگر ہم نے اس سیلاب کے آگے اب بھی بند باندھنے کی کوشش نہیں کی تو پوری صنف نازک اس میں غرق ہو کر رہ جائے گی۔ اب آپ میں سے جو کوئی بھی بولنا چاہتی ہیں، باری باری اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

خاتون مندوب ۳: آپ جو کچھ فرما رہی ہیں وہ درست ہے لیکن اس سیلاب کو کس طرح روکا جا سکتا ہے، خاص طور سے جب ہمارے اپنے طبقے کی کچھ خواتین خود اس طرح کے حملوں کو تحریک دینے کا باعث بن رہی ہیں۔ عورت جب خود اپنے آپ کو چوراہے پر بے پردہ وعریاں کر رہی ہے تو پھر وہ سب کچھ تو ہونا ہی ہے جو ہو رہا ہے۔

خاتون مندوب ۴: آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کون کہاں خود کو عریاں کر رہا ہے؟

مندوب ۳: آج آپ سڑکوں، گلیوں بازاروں میں دیکھیں ہماری نوجوان خواتین نہ

صرف ایسا باریک لباس پہنے نظر آتی ہیں جس سے سارے اعضا چھلکتے نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر خود ہم عورتوں کی نظریں جھک جاتی ہیں۔ اس حالت میں الزام کس پر دھریں۔ عورت جب خود اپنی نمائش کرنے پر تل گئی ہے تو مرد کے منہ سے رال ٹپکنا فطری بات ہے۔ آپ خود کو سنبھال کر رکھیں تو کوئی آپ کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ذرا اس اجلاس پر ہی نگاہ ڈالیے، کچھ محترمائیں تو مانو ریمپ پر چلنے کے لئے تیار ہو کر آئی ہیں۔

(اس پر چاروں طرف سے زوردار احتجاج ہوتا ہے۔ دیر تک مندوب ۳ سے اپنے الفاظ واپس لینے کے لئے کہا جاتا ہے مگر پر وہ ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ جس کے نتیجے میں آدھے گھنٹے کے لئے اجلاس ملتوی کر دیا جاتا ہے۔)

آدھے گھنٹے کے بعد جب اجلاس پھر شروع ہوتا ہے تو مجلسِ شوریٰ دو دھڑوں میں بٹ چکی ہوتی ہے۔ معمر خواتین ایک طرف اور نوجوان دوشیزائیں دوسری طرف تصادم کے لئے پر تول رہی ہوتی ہیں۔ اجلاس کو شروع کرنے کے لئے جب صدر موصوف مندوب ۵ کو اپنے خیالات پیش کرنے کی دعوت دیتی ہیں تو اس سے پیشتر کہ مندوب ۵ گفتگو کا آغاز کرے نوجوان دوشیزاؤں کی طرف سے ایک دوشیزہ اٹھ کر اس تقاضے کو پھر دہراتی ہے جو التوا سے پہلے کیا گیا تھا کہ خاتونِ مذکور اپنے الفاظ واپس لیں۔ اس سے پہلے کہ صدر صاحبہ کچھ فرمائیں مندوب ۳ خود ہی کھڑے ہو کر اجلاس سے مخاطب ہوتی ہیں۔

مندوب ۳: اپنے الفاظ واپس لینے سے پہلے میں آپ سب سے التماس کرتی ہوں کہ ذرا انہیں محترمہ کو دیکھئے۔ آج تک ہم صرف اوباش مردوں کو ہی چھاتی کے بٹن کھلے رکھ کر اپنے سینوں کی نمائش کرتے دیکھتی آئی ہیں۔ آج انہیں دیکھئے، ان کے سینے کا کون سا حصہ ایسا ہے جسے انہوں نے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ مرد تو مرد ہیں یہاں اُنہیں دیکھ کر تو میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ اچھل کر اس چشمہ حیواں کے دو چار گھونٹ میں بھی پی ڈالوں۔

(اس پر ایک بار پھر شدید احتجاج کی لے بلند ہوتی ہے۔ جب شور کم ہوتا ہے تو خاتون مندوب۳ پھر گویا ہوتی ہے۔)

خاتون مندوب۳: بہر حال میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔

شکریہ!!!

(اس کے بعد وہ اپنی نشست پر بیٹھ جاتی ہیں۔ صدر صاحبہ ایک بار پھر سب کو مخاطب کرتی ہیں)۔

صدر صاحبہ: میں سب سے گزارش کرتی ہوں کہ کسی کی ذات کو موضوع نہ بنایا جائے۔ ہم جس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے جمع ہوئیں ہیں اُس پر بات کی جائے۔

(اس کے بعد وہ مندوب۵ کو اظہار خیال کی دعوت دیتی ہیں۔)

مندوب۵: پیاری بہنو! میں نے دونوں خواتین کے خیالات کو غور سے سنا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دونوں نے پوری صدق دلی سے اپنے اپنے خیالات پیش کئے ہیں، لیکن میں اُن سے جزوی طور پر ہی اتفاق کرسکتی ہوں۔ جہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے طبقے میں بہت سی ایسی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، جن کی وجہ سے خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عورتوں کے جنسی، ذہنی واخلاقی استحصال کی وجہ محض عُریانی وفحاشی نہیں ہے جو یورپی قوموں کی اندھی تقلید میں ہمارے سماج میں در آئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر وہ خواتین بالکل محفوظ ہوتیں جو آج بھی سات پردوں میں رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ سورج کی روشنی کو بھی اپنا بدن چُھونے کی اجازت نہیں دیتیں۔ عصمت دری یا بے حرمتی کے واقعات صرف انہیں خواتین کو پیش نہیں آتے جو واقعی الٹرا ماڈرن زندگی گزارتی اور بذاتِ خود اپنی نمائش کر کے ایسے حادثات وواقعات کو دعوت دیتی ہیں۔ بلکہ وہ خواتین بھی ان کا شکار ہوتی رہی ہیں جو گھر کی چار دیواری میں رہتی اور بکتر بند زندگی گزارتی ہیں۔

بہنو! اس مسئلے کو کچھ حقائق کی روشنی میں سمجھنے اور پھر کوئی ایسا لائحہ عمل تلاش کرنے کی

ضرورت ہے جو واقعی اس طرح کے استحصال کے امکانات کا اگر سدِ باب نہیں تو کم سے کم اُن پر کچھ حد تک روک لگا سکے۔ اگر ہم یہ سوچتی ہیں کہ اس طرح کے استحصال کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کیا جا سکتا ہے تو یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر ممکن نہیں۔ عورت اور مرد ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آگ اور تیل کی طرح ہیں۔ اُن کی آپسی کشش کو روکا نہیں جا سکتا۔ ان دونوں کے تصادم سے جو الاؤ روشن ہوتا ہے وہ اس کائنات کے بنیادی حقائق میں سے ایک ہے۔ مرد فطرتاً Aggressive ہے۔ خصوصاً وہ عورت کے معاملے میں دہشت گرد ہے۔ مرد کے وجود میں جنسی اشتہا کا جو لاوا ہر وقت کھولتا رہتا ہے اُس سے کہیں زیادہ لاوا عورت کے وجود میں ہر وقت طوفان بپا کئے رہتا ہے۔ لیکن قدرت نے اُسے نکاس کی ایسی راہیں فراہم کی ہیں جو اس لاوے کو مسلسل سرد کرتی رہتی ہیں۔ ماہواری آنا، بچے جننا، دودھ پلا کر افزائش نسل کا فریضہ انجام دینا، یہ نکاس کی وہ راہیں ہیں جو اس لاوے کو معتدل کرتی رہتی ہیں۔ مرد کے پاس ایسی کوئی راہِ نکاس نہیں ہے۔ اُس کے پاس صرف وہی راہ ہے جس کا مظاہرہ کبھی وہ سماجی طریقوں سے اور کبھی غیر سماجی، غیر قانونی اور غیر فطری طریقوں سے، اس لاوے کی شدت سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔ میں یہ سب بیان کر کے مرد کو بری الذمہ قرار نہیں دے رہی ہوں اور نہ اُس کا دفاع کر رہی ہوں بلکہ اُس حقیقت کو پیش کر رہی ہوں جس کو جانے بغیر شاید ہم کوئی صحیح راہ اختیار نہ کر سکیں یا کوئی درست لائحہ عمل تلاش نہ کر سکیں۔ ہم اس لاوے کو پھوٹ بہنے سے نہیں روک سکتے نہ وہ ہمارا مقصد ہی ہے بلکہ اُسے صحیح طور پر پھوٹ بہنے کی راہ پر چلنے کی طرف راغب کرنا چاہتی ہیں۔ یہ راہیں کوئی ہماری بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ صدیوں سے سماجی واخلاقی ومذہبی نظام ہائے حیات کی سمجھائی ہوئی ہیں۔ ہم دونوں جنسوں کو اُن راہوں کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتی ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں اس مسئلے پر ان امور کی روشنی میں غور کرنا چاہئیے۔

(خاتون مندوب ۵ کی تقریر کو سنتے ہوئے نوجوان دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں بار بار

احتجاج کی لہریں اُٹھتی رہتی ہیں، لیکن صدر صاحبہ بڑی جرأت سے نظم وضبط قائم رکھتی ہیں۔ اب موقعے کا تقاضا ہے کہ دوشیزاؤں میں سے بھی کسی کو اظہارِ خیال کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ صدر صاحبہ اُن میں سے ایک کو اظہارِ خیال کی دعوت دیتی ہیں۔ نام کا پکارا جانا تھا کہ خاتون موصوف اچھل کر کھڑی ہوتے ہوئے بڑے ہی جارحانہ انداز میں بولنے لگتی ہیں:)

دوشیزہ ۷: میں نے آج تک اس موضوع پر اس قدر فضول اور بے تکی باتیں نہیں سنی۔ ہم آج یہاں عصمت دری کے ایک خاص واقعہ پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئیں ہیں اور یہاں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تقریروں کا کوئی مقابلہ ہو رہا ہے۔ موقع اتنی لمبی تقریریں کرنے کا نہیں ہے۔ ایک نوجوان خاتون کو چلتی بس میں نصف درجن وحشی درندوں نے نہ صرف ریپ کیا ہے بلکہ اپنے طور پر اُس کو اور اُس کے نوجوان ساتھی کو مار کر سڑک پر پھینکنے کا جرم بھی کیا ہے۔ ہم یہاں اس پر غور کرنے اور کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے جمع ہوئیں ہیں جو مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ آئندہ اس طرح کے واقعات نہ ہوں اس کی بھی کوئی سبیل پیدا کر سکے۔

(بزرگ دھڑے کی ایک خاتون بیچ میں بول اٹھتی ہے۔)

بزرگ مندوب: آپ نے بھی تقریر کرنا شروع کر دیا۔ مشورہ دیجئے کہ کیا کرنا چاہئیے۔

نوجوان دوشیزہ: جب تک ہم اس مرد اساس سماج کا حصہ ہیں اور اس کے زیرِ نگیں جی رہی ہیں کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ جس ملک کی سیاسی جماعتوں میں آدھی سے زیادہ تعداد ایسے ممبران پر مشتمل ہو جن پر ریپ، قتل، رشوت اور نہ جانے کیسے کیسے اخلاقی جرائم کے مقدمے چل رہے ہیں، اُس سے یہ توقع کرنا کہ وہ کوئی ایسے قوانین بنائیں گی جو عورتوں کو عملی تحفظ ہی نہیں عزت ووقار کی ضمانت بھی دے سکے، ممکن نہیں ہے۔

بزرگ مندوب: تو کیا ایک اور نیا ملک بنائیں جس میں صرف عورتیں بستی ہوں؟

(ایک زوردار قہقہہ پورے ہال میں گونجتا ہے۔)

نوجوان دوشیزہ: (چڑتے ہوئے)۔ یہ قہقہے اڑانے کا وقت نہیں، میں یہ مشورہ تفنن طبع کے لئے نہیں دے رہی ہوں۔ جب مرد اس سماج سے کچھ انصاف حاصل ہونے کی امید نہیں ہے تو ہم اُن کے ساتھ کام کیوں کریں۔ ہماری اپنی پارلیمنٹ، اپنا قانون، اپنی عدلیہ اور دوسرے ادارے کیوں نہ ہوں۔ ایک نیا آئین کیوں نہ ہو......

بزرگ مندوب: چلو مان لیتے ہیں کہ ایسا ہو گیا تو فیملی کا کیا ہوگا۔ گھر، خاندان، ان سب کو کیسے تقسیم کریں گے۔

دوسری بزرگ خاتون: کیا ہم مردوں سے شادی بیاہ کرنا بھی چھوڑ دیں گے؟

نوجوان دوشیزہ: عورت عورت سے شادی کیوں نہیں کر سکتی۔ کئی ملکوں میں تو اس کی آزادی قانوناً دی جا چکی ہے۔

تیسری بزرگ خاتون: بچے کیسے پیدا ہوں گے؟ انسانی نسل آگے کیسے بڑھے گی؟

نوجوان دوشیزہ: اب تو ٹیوبز میں بھی بچے پیدا ہو رہے ہیں۔

چوتھی بزرگ خاتون: ہاں ہو رہے ہیں مگر وہ نطفہ کہاں سے آئے گا جو عورت کے انڈے سے متصادم ہو کر افزائش نسل کا باعث بنتا ہے۔

پانچویں بزرگ خاتون: میری جان! شاید جانوروں سے میل سپرم حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہی ہیں۔

(ایک بار پھر قہقہہ پھوٹ بڑتا ہے۔)

نوجوان دوشیزہ: مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری بزرگ نسل آج بھی اٹھارہویں صدی میں جی رہی ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ انسان نے مصنوعی جرثومہ یعنی میل اسپرم بنانے کے تجربے کرنا بھی شروع کر دیئے ہیں۔

چھٹی بزرگ مندوب: محترمہ! انہیں پہلے کامیاب تو ہونے دو پھر یہ سب کچھ سوچنا۔ بالفرض عورتوں کی الگ پارلیمنٹ اور اپنا الگ قانون بھی بن جاتا ہے تو اس

کے بعد آپ کے خیال میں ظلم واستحصال ہونا بند ہو جائے گا۔

(یہ بحث جب زیادہ طول کھینچنے لگی تو صدر صاحبہ کو ایک بار پھر مداخلت کرنا پڑتی ہے۔)

صدر صاحبہ: میرا خیال ہے ہم اصل مقصد سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ (دوشیزہ سے) آپ برائے کرم تشریف رکھیں۔ آج کے اجلاس کا مقصد مجلس شوریٰ کو دو دھڑوں میں تقسیم کرنا نہ تھا۔ مل کر یہ سوچنا تھا کہ کس طرح خواتین کے خلاف ہو رہے طرح طرح کے مظالم کا سد باب کیا جائے لیکن آپ لوگ تو آپس میں ہی گتھم گتھا ہونے لگیں۔ اس طرح تو ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔

(اس کے بعد آدھی رات تک مختلف تجاویز پر بڑے زور وشور سے بحثیں ہوتی ہیں اور بالآخر ایک ایسے ریزولیوشن کو متفقہ طور پر منظوری دی جاتی ہے جس کو سن کر پوری عالمِ انسانیت خصوصاً مرد اساس سماج دہل جاتا ہے۔ اگلے دن اخباروں کے فرنٹ پیجز پر جو خبر جلی حروف میں لیڈ کے طور پر شائع ہوتی ہے وہ حسبِ ذیل ہے۔)

عورتوں کی الگ پارلیمنٹ قائم کی جائے......

متحدہ محاذ برائے تحفظ خواتین کا حکومت سے پُر زور مطالبہ۔

فیڈ آؤٹ

(پورے جزیرے میں عورتوں کی مرکزی تنظیم کی قیادت میں خواتین پر ہو رہے مظالم کے خلاف تحریک تو پہلے ہی چل رہی ہے۔ نئے نعرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ اب بڑے زور وشور سے عورتوں کی الگ پارلیمنٹ قائم کرنے کے تقاضے کئے جانے لگے ہیں۔ حکومت کو اس نئی صورت حال نے ایک نئی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ لیکن پوری طاقت سے ان مظاہروں کو دبانے کی کوشش کے باوجود احتجاجات میں کوئی کمی نہیں ہو رہی ہے بلکہ تحریک میں مزید تیزی آتی چلی جا رہی ہے۔ اس صورتِ حال سے کس طرح نمٹا جائے اس پر غور وخوض کرنے کے لئے ملک کے وزیر اعظم نے سب ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی میٹنگ بلائی ہے۔ آج اس میں زیرِ بحث مسئلے پر غور وخوض ہو رہا ہے۔ وزیر اعظم اجلاس سے مخاطب ہیں۔)

وزیر اعظم: یہ مسئلہ بہت ہی سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد اس کا کوئی حل تلاش کرنا ہے ورنہ ایک چھوٹے سے ملک میں دو پارلیمنٹس کا قیام ایک عجیب صورت حال پیدا کرے گا۔ دو پارلیمنٹس کا مطلب ہے قدرت کی بنائی مخلوق کی دو دھڑوں میں تقسیم۔ یہی نہیں، ایک ہی ملک میں دو صدر، دو وزرائے اعظم، عدلیہ، پولیس، فوج، تعلیم، تجارت وصنعت وحرفت، یہاں تک کہ گھروں اور کنبوں کا بھی دوہرا انظام قائم کرنا۔ اگر ذرا گہرائی میں جا کر غور کریں تو یہ ایک طرح سے جزیرے کی ایسی تقسیم ہوگی جس کی کوئی سرحد نہ ہوگی۔

ہوم منسٹر: ہمیں شادی شدہ خواتین پر اُن کے خاوندوں سے دباؤ ڈلوا کر انہیں تحریک سے الگ کرنے کی کوشش کرنا چاہئیے۔ یہ تقسیم تنظیم کو کمزور کردے گی۔

وزیر مالیات: ہم اگر اس میں کامیاب ہو بھی گئے جب بھی مجھے نہیں لگتا تحریک میں کوئی کمی آئے گی۔ کیونکہ تحریک تو حقیقت میں نوجوان خواتین کے ہاتھ میں ہے۔ بزرگ اور شادی شدہ خواتین کو تو محض اُن کے تجربے کی وجہ سے تنظیم کے مختلف عہدوں پر فائز کیا گیا ہے۔ فیصلے تو نوجوان خواتین کرتی ہیں جن کی مجلسِ شوریٰ میں اکثریت ہے۔

وزیر دفاع: جو خواتین مختلف سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں ملازمت کرتی ہیں اُنہیں وہاں سے غیر حاضر یا رخصت پر رہنے کی اجازت نہ دی جائے بلکہ اُن پر کام کا اتنا زیادہ بوجھ ڈال دیا جائے کہ انہیں سر اٹھانے کی فرصت ہی نہ ملے چہ جائے کہ وہ جلسے جلوسوں میں شریک ہوں۔

وزیر تعلیم: پُر امن احتجاج کرنا اُن کا قانونی حق ہے۔ اس سے انہیں روکنا ٹھیک نہ ہوگا۔

ہوم منسٹر: ملک کے تئیں بھی تو اُن کی کئی ذمے داریاں ہیں۔ اپنی تحریک کی خاطر ملک وقوم کو نقصان پہنچانے کی انہیں اجازت نہیں دی جاسکتی۔ خاص طور سے جب کہ وہ اُس کے خزانے سے تنخواہ پا رہی ہوں۔ وہ جس راہ پر گامزن ہیں وہ درحقیقت فوجی بغاوت سے بھی کہیں سنگین معاملہ ہے۔

وزیراعظم: اس بغاوت کو بڑے محتاط انداز میں روکنا ہوگا ورنہ جزیزہ ہی نہیں ہمارا ہر گھر تقسیم ہو جائے گا۔ صدیوں کی محنت سے حاصل کی ہوئی میراث تباہ ہو جائے گی۔ ہمارا اقتصادی ڈھانچہ ہی نہیں ذہنی و جذباتی رشتوں کی کارگاہ بھی بکھر جائے گی۔

وزیر تعلیم: میرا خیال ہے ہمیں طاقت کی بجائے روپے پیسے یا عہدوں میں ترقی کے لالچ کے ہتھیار کو زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ بے روزگار دوشیزاؤں کو روزگار دے کر ایسی جگہوں پر تعینات کر دینا چاہئیے جہاں سے وہ ان جلسے جلوسوں میں شرکت کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔

ہوم منسٹر: یہ تجویز بھی اچھی ہے۔اس پر سب سے پہلے عمل کرنا چاہئیے۔

وزیر دفاع: گھریلو اور سماجی دباؤ کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ ذمے داریوں کا دباؤ، ملازمت کھو جانے اور عہدے میں تنزلی واقع ہونے کا خوف بھی وہ موثر ہتھیار ہیں جو طاقت استعمال کرنے کی نوبت ہی نہ آنے دیں گے۔ تحریک چلانا آسان کام نہیں ہے خصوصاً خواتین کے لئے۔اس لئے میرا خیال ہے نفسیاتی دباؤ ہی کافی ہوگا جو اس تحریک کی کمر توڑ دے گا۔

وزیر سماجی بہبود (جو خود بھی خاتون ہیں): ایک موثر ہتھیار اور بھی ہے لیکن اُسے اُسی صورت میں برتا جانا چاہئیے جب باقی ہتھیار ناکا ثابت ہوں۔

وزیراعظم: مثلاً؟

وزیر سماجی بہبود: ابھی اس کا ذکر قبل از وقت ہوگا۔

وزیر دفاع: پھر بھی؟

وزیر سماجی بہبود جنسی خوف (Sexual Harassment)!

وزیراعظم: آپ خود خاتون ہو کر ایسا کہہ رہی ہیں۔

وزیر سماجی بہبود: میں اس وقت خاتون کی حیثیت سے نہیں ایک منتظم کی حیثیت سے سوچ رہی ہوں۔

وزیراعظم: اسی بدعت کے خلاف وہ جنگ کر رہی ہیں اور آپ اس کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہیں۔

وزیرسماجی بہبود: جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔

وزیراعظم: (سرزش کے طور پر) دوبارہ اس کا ذکر نہ کیجئے گا۔

وزیرسماجی بہبود: I am sorry !

وزیراعظم: (بڑی گہری سوچ سے ابھرتے ہوئے) یہ بہت ہی نازک مسئلہ ہے۔ خواتین کے خلاف کسی بھی طرح کے طاقت، زور زبردستی کے ہتھیار کو استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہر خاتون کسی نہ کسی گھر کی ماں، بہن، بہو یا بیٹی ہے۔ اُن کے خلاف طاقت کے استعمال کا کوئی بھی ہتھیار اُن کے کنبے کے مرد اراکین کو بھی دھیرے دھیرے ہم سے دور لے جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں یہ جنگ ہر گھر میں لڑنا ہوگی جو کسی جمہوری حکومت کے لئے ممکن نہیں ہے۔ سب سے موثر ہتھیار تو یہی ہوگا کہ ہم ہر گھر کے میل ممبران (مردوں) کو ہی اپنی خواتین پر دباؤ ڈالنے، انہیں سمجھانے اور اس تحریک سے دور لے جانے کے لئے استعمال کریں۔ ہماری خواتین پیروں، فقیروں، سادھوسنتوں اور قسمت کا حال بتانے والے نجومیوں سے بھی بہت متاثر ہوتی ہیں۔ انہیں بھی اس کام پر مامور کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے جلسے جلوسوں پر طاقت کا استعمال سارے کھیل کو بگاڑ دے گا۔ اس لئے انہیں روکنے کے لئے پانی برسایئے، دھواں چھوڑیئے، جسم میں خارش پیدا کرنے والی جڑی بوٹیاں استعمال کیجئے مگر لاٹھی یا بندوق ہرگز نہ استعمال کیجئے ورنہ ساری دنیا اُن کے ساتھ صف آرا ہو جائے گی اور ہمیں کہیں جائے پناہ نہ ملے گی۔

(وزیراعظم کی ہدایات کے مطابق ایک لائحہ عمل تیار کیا جاتا ہے جس کے بعد خصوصی اجلاس کی کاروائی ختم ہو جاتی ہے۔ سبھی وزرائے اعلیٰ کو متذکرہ لائحہ عمل پر سختی سے عمل کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔)

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

حکومت کو نئے مطالبات پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرنے کی خاطر خواتین کی تحریک دن بدن زور پکڑتی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی خواتین پر ہونے والے مظالم کی رفتار میں بھی کمی کی بجائے اور تیزی آجاتی ہے۔ آئے دن اخباروں میں چھپنے والی ایسی سرخیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جن میں کہیں تو کسی خاتون کو ماں باپ اس لئے موت کے گھاٹ اتارتے دکھائی دیتے ہیں کہ اُس نے بغاوت کر کے کسی دوسری جاتی کے نوجوان سے شادی کرلی ہے۔ کہیں کسی بچی کو کوکھ میں ہی اس لئے مار دیا جاتا ہے کہ انہیں لڑکی نہیں لڑکا چاہیئے۔ کسی محبوبہ کا حلیہ اس لئے بگاڑ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے عاشق کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انحراف کرتی ہے۔ کہیں کوئی دوشیزہ اپنی عصمت سے اس لئے محروم کردی جاتی ہے کہ اُس نے اپنے ساتھی پر بھروسہ کر کے کسی ویران راہ پر اُس کے ساتھ چلنے کا حوصلہ کیا تھا۔ گھر کی چار دیواری کے اندر ہونے والے جنسی وجسمانی استحصال سے تعلق رکھنے والی خبروں کا تو خیر شمار ہی نہیں۔ اپنے رشتے داروں کے ہاتھوں لٹنے والی عصمتوں کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ جرائم سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی دل کو دہلاتی چلی جاتی ہیں۔ ان واقعات سے عورت سماج میں غم و غصے کی لہر اور بھی تیز ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی تحریک کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرنا شروع کردیتی ہیں جس سے پورے سماج کا نظام درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے۔ خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندے گھوم گھوم کر آئے دن ہونے والی سرگرمیوں کی خبریں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباروں کو فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ غیر ملکی اور بین ریاستی خبر رساں ایجنسیوں کی بھی پورے ملک میں ریل پیل نظر آتی ہے۔ کسی خبر رساں ایجنسی کے دو نمائندے ایک ہی شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے یوں بات چیت کرتے نظر آتے ہیں۔)

نمائندہ:۱ اس بیکری کے سامنے اس قدر بھیڑ کیوں ہے؟

نمائندہ:۲ چلو چل کر معلوم کرتے ہیں۔

نمائندہ:۱ (بیکری کے قریب بھیڑ میں کھڑے ایک نوجوان سے مخاطب ہو کر) یہاں کیا ہو رہا ہے بھئی؟

نوجوان: دیکھ نہیں رہے ڈبل روٹی خریدی جا رہی ہے۔

نمائندہ:۲ لیکن اس قدر بھیڑ کیوں ہے؟

نوجوان: آج اس شہر کے کسی گھر کا چولہا نہیں جلا ہے۔ خواتین نے دو دن کے لئے ''چولہا بند'' ہڑتال کا اعلان کیا ہے۔

نمائندہ:۱ اس کا مطلب ہے گھروں میں دو دن تک کچھ نہ پکے گا؟

نوجوان: اگر پکنے کا امکان ہوتا تو پورا شہر ان دکانوں کے آگے قطار باندھے کیوں کھڑا ہوتا۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

ایک دوسرے شہر کے مرکزی چوراہے پر ہزاروں خواتین دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑی ہیں تا کہ کوئی دائرے کو توڑ کر اندر داخل نہ ہو۔ دائرہ چونکہ بہت پھیلا ہوا ہے اس لئے سب سے آخر میں آنے والے کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ دائرے کے اندر کھلی جگہ میں شور کیوں ہو رہا ہے۔ دو بزرگ دور سے آتے ہوئے پیچھے کھڑی پولیس کی ٹولی میں سے ایک سے دریافت کرتے ہیں۔

بزرگ ا: یہاں کیا ہو رہا ہے نوجوان؟

سپاہی: اندر ایک باپ کو سنگسار کیا جا رہا ہے۔

بزرگ ۲: (حیرانی سے) سنگسار؟ کیوں؟

سپاہی: اُس نے اپنی نوجوان بیٹی کی عصمت لوٹی ہے۔

بزرگ ا: لیکن یہ تو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا ہوا۔ آپ یہ سب ہوتے ہوئے خاموشی سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔

سپاہی: کیا کریں۔ خواتین اندر جانے ہی نہیں دے رہی ہیں۔

بزرگ ا: آپ اس کی جان بچانے کے لئے طاقت کا استعمال بھی تو کر سکتے ہیں۔

سپاہی: طاقت کا استعمال سختی سے منع کر دیا گیا ہے۔

بزرگ ۲: تو آپ اس کو اسی طرح مرنے دیں گے۔

سپاہی: اور کیا کر سکتے ہیں۔ اندر چلے بھی جائیں تو زندہ واپس کیسے آئیں گے۔

بزرگ ا: یہ تو جنگل راج ہوا۔

بزرگ ۲: یہاں جنگل راج کب نہیں تھا۔ قانون تو ہمیشہ ایک غلام کی طرح امیروں اور طاقت وروں کی دربانی کرتا آیا ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ہی تو وہ اصول ہے جس کی یہاں ہمیشہ حکمرانی رہی ہے۔ آپ آج کیوں حیران ہو رہے ہیں۔

(اس اثنا میں پولیس کی ٹولی دوسری طرف کھسک جاتی ہے۔)

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

(تحریک کو چلتے دو ماہ بیت چکے ہیں۔ جلسے جلوسوں کے ساتھ ہی ساتھ متحدہ محاذ برائے تحفظ خواتین کی طرف سے جاری کردہ نت نئے حربوں نے حکومت کا ہی نہیں پورے مرد سماج کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ حکومت کی طرف سے استعمال ہونے والی کوئی اسکیم کارگر نہیں ہو رہی۔ ہر گھر کا نظم و نسق مردوں کے ہاتھ سے نکل کر خواتین کے ہاتھ میں جا چکا ہے۔ محبت، پیار، خوف و ہراس اور دباؤ کا، اُن کا سوچا ہوا کوئی حربہ کام نہیں آ رہا۔ خواتین بھی استعمال ہونے والے ہر حربے سے آشنا ہو گئی ہیں۔ اس لئے وہ انہیں بے اثر بنانے کے سارے راستے بخوبی جانتی ہیں۔ اسی کا مظاہرہ یہاں ہو رہا ہے۔)

خاوند: (بیوی سے) اگر تم نے اپنا راستہ نہیں بدلا تو مجھے مجبوراً کوئی سنگین قدم اٹھانا پڑے گا۔

بیوی: مثلاً؟

خاوند: بتانا ضروری ہے کیا؟

بیوی: تو پھر دھمکی کیوں دے رہے ہو۔ تم خود کو سدھار و ورنہ ومن سیل میں اگر میں نے رپورٹ کر دی کہ تم صبح وشام بلکہ ہر وقت مجھے دھمکاتے رہتے ہو تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

خاوند: تم مجھے جیل بھجواؤ گی؟

بیوی: میں نہیں تم خود اپنے آپ کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل رہے ہو۔

خاوند: وہ کیسے؟

بیوی: اتنے بھولے تو نہ بنو۔ دھمکانا اور ہراساں یا خوف زدہ کرنا بھی جرم ہے۔ انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی ہے اور عورت کو خصوصاً اپنی بیوی کو ہراساں کرنا تو اور بھی سنگین جرم ہے۔ عورت کو دھمکانا تو پوری نسل کو خوف وہراس میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔ یعنی افزائش نسل کو معرضِ خطر میں ڈالنا۔ آئی بات سمجھ میں؟

(خاوند گھبرا کر دوسری طرف نکل جاتا ہے)

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

(ایک ماہ اور بیت جاتا ہے۔ ملک کے زیادہ تر تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے ہیں کیوں کہ ماؤں نے بچوں کو اسکول بھیجنا بند کر دیا ہے۔ بچوں کے تعلیمی سال کے برباد ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ حکومت اب اور بھی سختی سے کام لینے لگی ہے۔ پولیس کو لاٹھی استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ جس سے پولیس اور خواتین کے درمیان واقع ہونے والے تصادمات کی خبریں آنے لگی ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی خاتون کے جاں بحق ہونے کی خبر نہیں آئی۔ کچھ دنوں سے پیروں، فقیروں، سادھو سنتوں اور مہاتماؤں کا

ایک گروہ بھی جگہ جگہ گھوم کر خواتین کے اجتماعوں سے خطاب کرتا نظر آتا ہے۔ آج بھی ایک پیر صاحب کسی بڑے شہر میں خواتین کے ہجوم سے یوں مخاطب ہیں۔)

پیر صاحب: قابلِ احترام خواتین: ہمیں یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ہے کہ گزشتہ چند ماہ سے ہمارے ملک کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ اللہ نے آدم وحوا کو اس زمین پر اس لئے بھیجا ہے کہ وہ دونوں مل کر یہاں ایک ایسا نظام قائم کریں جس میں نہ صرف نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود ممکن ہو بلکہ اللہ کی بزرگی و برتری کو بھی تسلیم کیا جائے۔ خدا کا یہ منصوبہ اُس وقت تک عمل میں نہیں آسکتا جب تک آدم وحوا یا اُن کی اولاد متحد ہو کر اس پر عمل نہ کریں۔ افسوس یہ ہے کہ گزشتہ چند مہینوں سے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس منصوبے کے قطعی منافی ہے جو قدرت نے بنا کر آدم وحوا کے حوالے کیا تھا۔ مرد عورت گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں۔ اگر ایک پہیہ کام کرنا بند کر دے تو وہ گاڑی نہیں چل سکتی۔ عورت مرد سے کیوں کر جُدا رہ کر اپنے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ (تھوڑی دیر تک کر مجمع کا جائزہ لیتے ہیں)۔ یہ درست ہے کہ آدم کے بیٹوں نے اپنی ہم سفر حوا کی بیٹیوں کے تئیں اپنی ذمے داریاں ٹھیک طرح سے نہیں نبھائیں۔ وہ بجائے اپنے ساتھی کو تحفظ و عزت و وقار عطا کرنے کے اُس کی بے حرمتی کا مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دونوں میں ایک ایسی دراڑ پیدا کر دی جائے جو کبھی پُر ہی نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سماج میں اصلاح کی ضرورت ہے مگر اُسے منہدم کرنے کی نہیں۔ آپ جو کچھ کر رہی ہیں اس سے سماج کی بنیاد ہل جائے گی جس سے دوسری بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی جن کی وجہ سے ماضی میں دنیا کی کئی بستیاں تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ ماؤ! بہنو! آپ سے استدعا ہے کہ دونوں دھڑے مل کر سماج کی اصلاح کریں اُسے تباہ کر کے بے راہ روی کو ہوا نہ دیں۔

(دفعتاً ایک دوشیزہ کھڑی ہو کر پیر صاحب سے مخاطب ہوتی ہے)

دوشیزہ: بابا! آپ یہ سب ہمیں کیوں سمجھا رہے ہیں۔ جا کر حکومت کے ایوانوں میں یہ تقریر کیجئے۔ ہم تو مظلوم ہیں آپ کو معلوم نہیں ہمارے ساتھ اس ملک میں جہاں ہمیں دیوی کا درجہ دیا جاتا تھا۔ آج کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مرد نے اپنے فرائض کو قطعی فراموش کر دیا ہے۔ اب اس کے سوائے اور کوئی راستہ نہیں کہ ہمارا اپنا نظامِ حیات ہو۔ سیاسی وسماجی اور فکری وجذباتی ہر اعتبار سے ہم آزاد وخود مختار ہوں۔ مرد سماج سے ہمارا کچھ لینا دینا نہ ہو۔ ہماری اپنی پارلیمنٹ، اپنی عدلیہ، اپنا دفاعی، تعلیمی اور سیاسی وسماجی نظام ہو۔ آپ کو اگر کچھ کہنا ہے تو جا کر یہ سب ان سے کہیئے۔

(اس کے بعد وہ پورے مجمع کو اشارہ کرتی ہے اور وہ سب اُٹھ کر چل دیتے ہیں۔ پیر بابا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔

(فیڈ آوٹ)

(فیڈ اِن)

ایک کیبنٹ منسٹر کی بیٹی کی شادی کے انتظامات بڑے زور وشور سے جاری ہیں کہ لڑکی شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

منسٹر: (بیٹی سے) تمہیں اگر یہ شادی منظور نہ تھی تو پہلے انکار کر دیا ہوتا۔ اب جب سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں تم شادی سے انکار رہی ہو۔ کیا یہی دن دیکھنے کے لئے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اب میں لڑکے والوں کو کیا جواب دوں، کیا کہوں کہ تم شادی سے کیوں انکار کر رہی ہو۔

لڑکی: مجھے شادی سے انکار نہیں لیکن میں اپنی تنظیم کے احکامات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔

منسٹر: کون سی تنظیم کی بات کر رہی ہو۔

لڑکی: وہی جو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ملک گیر پیمانے پر جدوجہد کر رہی ہے۔

منسٹر: تم اُس تنظیم کی ممبر کب سے ہو گئیں۔

منسٹر کی (جو یہ باتیں سن رہی ہے) بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم پہلے عورتیں ہیں اس کے
بیوی: بعد آپ کی دھرم پتنی اور بیٹی۔ تنظیم نے مردوں سے شادی بیاہ پر پابندی عائد کر دی ہے ہم اُس کے حکم پر عمل کریں گے، چاہے آپ منسٹر رہیں یا نہ رہیں۔

منسٹر: تو تمہارا یہ قطعی فیصلہ ہے؟

لڑکی: مجھے معاف کیجئے گا پتاجی۔ میں اپنی تنظیم کی ہدایات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ آپ لڑکے والوں سے یہی بات کہیں۔ مجھے پورا یقین ہے وہ صورتِ حال کو سمجھیں گے اور اس کو کوئی غلط معنی نہیں پہنائیں گے۔

منسٹر: اور اگر لڑکے والوں نے انتظار نہیں کیا تو؟

لڑکی: تو وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اگر جزیرے کی کوئی دوسری لڑکی اُن سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے تو وہ ضرور شادی کریں۔

منسٹر: اگر ہم جزیرے سے باہر کسی غیر ملک میں جا کر یہ شادی کرتے ہیں تو پھر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔

لڑکی: ایسا کرنا اپنی تنظیم سے غداری کرنے کے مترادف ہوگا۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، پتاجی وہ یہیں ہوگا۔

منسٹر: لیکن بیٹا میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ تم کب سے اُن کی وفادار ہو گئیں۔ تم تو کبھی اُن سے ملی بھی نہیں۔ پھر یہ وفاداری کیسی۔

لڑکی: پتاجی آپ سے کس نے کہا کہ ہم چار دیواری میں رہنے والی خواتین اُن سے کبھی ملی ہی نہیں۔ یہ میڈیا کا زمانہ ہے پتاجی۔ ہم ہر وقت اُن سے ملتی اور اُنہیں انٹرنیٹ پر سنتی رہتی ہیں۔ کسی تحریک میں شامل ہونے کے لئے اب کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ فیس بک یا ٹویٹر، جیسے ذرائع کی موجودگی میں سب کچھ گھر بیٹھے کیا جا سکتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں جلسے جلوس نکالنا بھی اب بہت پرانی بات ہو گئی ہے (اُن کی اہمیت اپنی جگہ ہے) میڈیا کے ذریعے اب حکومت یا ساری دنیا کو اپنی رائے سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ احتجاج کے یہ نئے طریقے آج کل بڑے موثر ثابت ہو رہے ہیں۔

منسٹر: میں وزیر اعظم سے کیا کہوں گا کہ ہماری اپنی خواتین بھی ہمارے خلاف صف آرا ہو گئی ہیں؟

لڑکی: وزیر اعظم کی اپنی بیگم اُن کے خلاف صف آرا ہیں، ہماری بات رہنے دیجئے۔

منسٹر: یہ تم سے کس نے کہا؟

بیوی: آپ کو لیپ ٹاپ دیکھنے کا تو وقت ہی نہیں ملتا۔ دیکھتے تو پتہ چلتا کہ وہ وزیر اعظم کی کتنی سخت تنقید کر رہی ہیں۔ اُنہوں نے تو انہیں مستعفی ہو جانے کا بھی مشورہ دیا ہے۔

(منسٹر بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے)

بیوی: میں آپ کو بھی ایک صلاح دینا چاہتی ہوں، اگر آپ سننے کے لئے تیار ہوں تو!

منسٹر: ابھی کچھ اور باقی ہے؟ وہ بھی فرما دیجئے۔

بیوی: یہاں بیٹی کے سامنے نہیں دوسرے کمرے میں چلئے۔

دوسرے کمرے میں جا کر بیوی سرگوشی میں خاوند سے کہتی ہے۔

بیوی: اپنے وزیر اعظم سے کہیے کہ وہ فوراً کوئی مناسب قدم اٹھا کر اس مسئلے کو حل کریں ورنہ اگر یہ ہدایت جاری ہو گئی کہ آج کے بعد بیویاں اپنے خاوندوں کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہ دیں گی تو آپ لوگوں کی وہ حالت ہوگی جو کسی سماج میں آج تک مردوں کی نہیں ہوئی۔

(منسٹر کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔)

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

معاملات کو التوا میں ڈالتے رہنے والی حکومت کی برسوں سے چلی آرہی پالیسی اب ناکام ہوتی نظر آتی ہے۔ تحریک کو چلتے چار ماہ ہو چکے ہیں۔ جزیرے کی سیاسی و سماجی صورت حال یہ ہے کہ نہ تو کسی گھر میں چولہا جلتا ہے نہ بچوں کو اسکول بھیجا جاتا ہے۔ نہ کسی گھر میں شادی بیاہ ہو رہا ہے۔ نہ کوئی دوسری سماجی و مذہبی تقریب منعقد کی جارہی ہے۔ ۹۰ فیصد گھروں کا اندرونی کام بھی مردوں کے کندھوں پر آن پڑا ہے۔

جو خود کھانا نہیں بنا پاتے وہ یا تو نوکروں یا پھر بیکری والوں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں یا پھر ہوٹلوں ٹابوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں جس سے کنبے کا اقتصادی نظام بری طرح متاثر ہوا ہے۔ پورے مہینے کا بجٹ چلانا ناممکن ہو گیا ہے۔ جس بجٹ سے پہلے عورتیں پورا مہینہ چلاتی تھیں وہ اب آدھے مہینے کے لئے بھی ناکافی ہو رہا ہے۔ عورتیں جہاں جہاں ملازم رکھی گئی ہیں وہ صرف عورتوں کے ہی کام کرتی ہیں۔ دوسرے کام مرد ملازمین کو کرنے پڑ رہے ہیں۔ بینکوں، ڈاک خانوں، عدالتوں، تجارتی اداروں، ایرلائنوں یہاں تک کہ فوج اور پولیس کے نظام پر بھی اس تقسیم کے مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ بے قابو ہو رہے حالات کو روکنے کے لئے بالآخر حکومت ایک کیبنٹ کمیٹی تشکیل دیتی ہے تاکہ مصالحت کی کوئی راہ ڈھونڈ نکالی جا سکے۔ متحدہ محاذ برائے تحفظ خواتین کو بات چیت کی دعوت دی جاتی ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ ان)

(متحدہ محاذ کے صدر دفتر میں مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہو رہا ہے جس میں حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی کی طرف سے بات چیت کے لئے بھیجا گیا دعوت نامہ زیرِ بحث ہے۔)

صدر صاحبہ: خط کا مضمون میں نے آپ کو پڑھ کر سنا دیا ہے۔ حکومت بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کا کوئی منصفانہ حل تلاش کرنا چاہتی ہے۔

ایک خاتون: واہ واہ کیا بات ہے! کتنی جلدی حکومت خوابِ خرگوش سے بیدار ہوئی ہے۔ اس قدر سیاسی، سماجی و اقتصادی بحران پیدا کرنے کے بعد وہ اب بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوئے ہیں۔

دوسری خاتون: میری سمجھ یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ اس سلسلے میں وہ ہم سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے اُن سے بات چیت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پہلے وہ ہمیں بتائیں کیا انہیں ہمارا مطالبہ منظور ہے۔ یعنی کیا وہ ہماری الگ پارلیمنٹ قائم کرنے کے لئے تیار ہیں۔

تیسری خاتون: مجھے اس تجویز سے پورا اتفاق ہے۔ اگر وہ اس مطالبے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو پھر اور کیا بات کرنا ہے۔

(مجلسِ شوریٰ کی زیادہ خواتین اسی حق میں ہیں کہ پہلے حکومت ان کا مطالبہ منظور کرلے پھر اُن سے بات کی جائے۔ سب کو سننے کے بعد صدر صاحبہ اُن سے یوں مخاطب ہوتی ہیں۔)

صدر صاحبہ: میں نے آپ سب کی رائے سن لی ہے اور میں بھی یہ مانتی ہوں کہ آپ سب نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے لیکن جمہوریت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ بات چیت سے پہلے کسی طرح کی کوئی شرائط عائد نہ کی جائیں، جو بات آپ کہہ رہی ہیں وہ بات چیت کے دوران بھی تو کہی جاسکتی ہے۔ انہوں نے بھی تو بات چیت کے لئے کوئی شرائط عائد نہیں کی ہیں۔ پھر ہم ہی ایسا کیوں کریں۔

(بحث مباحثے کے بعد مجلسِ شوریٰ صدر صاحبہ کی رائے منظور کر کے دس ممبران کی ایک کمیٹی حکومت سے بات چیت کرنے کے لئے تشکیل دیتی ہے۔ یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ بات چیت کے دوران بھی احتجاجات کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔)

(فیڈ آوٹ)

(فیڈ اِن)

(وزیرِ اعظم کے دفتر سے ملحقہ میٹنگ ہال میں حکومت کی قائم کردہ کمیٹی کے ممبران جن کی قیادت وزیرِ داخلہ کر رہے ہیں، متحدہ محاذ برائے تحفظ خواتین کے مندوبین سے بات چیت کر رہے ہیں۔)

وزیر داخلہ: قابلِ احترام خواتین وحضرات: میں سب سے پہلے خواتین کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ انہوں نے بات چیت کا سلسلہ شروع کرنے کے لئے حکومت کی دعوت کو قبول کیا۔ ایک جمہوری ملک کے شہری ہونے کے ناتے یہ

ذمے داری ہم سب پہ عائد ہوتی ہے کہ ہم سبھی مسائل کو پُر امن طریقوں سے حل کرنے کی عالمی روایت کو مضبوط سے مضبوط بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ چنانچہ میں دل کی گہرائیوں سے نہ صرف آپ کا استقبال کرتا ہوں بلکہ امید رکھتا ہوں کہ ہم سب مل کر کوئی ایسی راہ ضرور ڈھونڈ نکالیں گے جو فریقین کو قبول ہوگی تا کہ ملک کو ایک بڑے خطرے سے، جو جنسی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہو گیا، بچا سکیں...... مندوبین کرام ہمیں یہ بات کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ملک ہم سب سے بڑا ہے۔ اسے مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

صدر متحدہ محاذ: عزت مآب وزیر داخلہ نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے۔ ملک سب سے بڑا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ خواتین جو جدو جہد کر رہی ہیں وہ ملک کے نہیں ملک چلانے والوں کے طرزِ عمل اور اُس مرد اساس مزاج کے خلاف ہے جو عورت کے وجود کو محض ایک کھلونا سمجھتا ہے۔ جس آئین کے تحت اس ملک کے نظام کو چلایا جا رہا ہے اُس نے خواتین کو بھی برابری کا حق دے رکھا ہے۔ لیکن گزشتہ کئی دہائیوں سے یعنی جب سے اسے نافذ کیا گیا ہے، اس ملک میں اُس کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے سب جانتے ہیں۔ اسے تو آج بھی دوسرے درجے کی مخلوق بلکہ دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو اسے دیوی کہا جاتا ہے اور اس کو پوجا بھی کی جاتی ہے مگر گھروں، بازاروں، سرکاری اور غیر سرکاری ایوانوں، جہاں جہاں وہ کام کرتی ہے اُن اداروں میں اُس کے ساتھ کیا کچھ ہوتا ہے شاید بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے وجود کی کھلم کھلا بے حرمتی ہوتی ہے اور ان ناانصافیوں کے خلاف کوئی آواز تک بلند نہیں کرتا۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس سے ہونے والی ساری بے انصافیوں کا آغاز اُس ادارے سے ہوتا ہے جو اُسے جنم دیتا ہے۔ اس بات کا کبھی خیال نہیں کیا جاتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ جس سماج میں اُسے یہ حق حاصل بھی ہے وہاں بھی اُس سے صرف گردن ہلوائی جاتی ہے۔ ہماری یہ جدو جہد اس مزاج

کے خلاف ہے ملک یا قوم کے خلاف نہیں۔

وزیر داخلہ: میں ذاتی طور پر اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ خواتین کو ملک میں جو تحفظ جو عزت و وقار ملنا چاہیئے وہ انہیں نہیں مل سکا۔ آئین کے تحفظات کے باوجود ملک کی نصف آبادی کی حالت آج بھی دگرگوں اور افسوس ناک حد تک پچھڑی ہوئی ہے۔ انہیں کوتاہیوں کا احساس کرتے ہوئے گزشتہ دہائی سے ہماری حکومت اس طرف خاص توجہ دے رہی ہے اور شاید اس سے آپ بھی انکار نہ کریں کہ کچھ سیکٹرس میں بہتری بھی آئی ہے لیکن جس پیمانے پر تبدیلی آنی چاہیئے تھی نہیں آئی ہے۔ اب آپ اسی کو دیکھئے کہ حکومت نے کتنی اسکیمز یا کتنے ہی منصوبے غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے عوام کے لئے نافذ کر رکھے ہیں۔ اسکول جانے والی بچوں کے لئے مِڈ ڈے میل کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی کثیر آبادی کے لئے فوڈ اسکوریٹی (Food Security) کا منصوبہ، اپنے ہی گاؤں میں سال میں ۱۰۰ دن کام فراہم کرنے کا منصوبہ وغیرہ یہ سب کچھ عورت اور مرد دونوں کی زندگی بہتر بنانے کے لئے ہی کیا جارہا ہے۔ اس میں کسی طبقے کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جارہی۔ ہاں البتہ یہ سب کرنے کے باوجود ہمیں افسوس ہے کہ ہم خواتین کو وہ اسکورٹی، وہ تحفظ فراہم نہیں کر پائے جو اُن کا حق ہے۔ لیکن اس ناکامی کی صرف حکومت ہی ذمے دار نہیں ہے، پورا سماج اس کا ذمے دار ہے۔ یہ تحفظ آپ کو سماج ہی دے سکتا ہے۔ پولیس یا فوج یہ تحفظ ہر فردِ واحد کو فراہم نہیں کر سکتی۔

خاتون ۴: اگر آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کی سرکار ملک کی خواتین کو تحفظ فراہم نہیں کر سکی اور نہ ہی کر سکتی ہے تو پھر آپ کو حکومت کرنے کا کیا حق ہے۔ پھر تو ہمارا مطالبہ جائز ہے۔ ہم اپنے لئے ایک الگ نظام قائم کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ ہر شہری کو تحفظ فراہم کرنا، اس کی جان و مال کی حفاظت کرنا یہ بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ آئین کی دی ہوئی اس یقین دہانی کو عملی شکل دینے میں اگر آپ

ناکام ہیں تو پھر آپ کی حکومت غیر آئینی ہے کیونکہ آپ اپنے آئین کا تحفظ کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔

وزیرِ دفاع: آپ نے عزت مآب وزیر داخلہ کے الفاظ کا غلط مطلب نکالا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کر رہی بلکہ مسئلے کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اس منصوبے کی مکمل کامیابی سماج کی معاونت پر منحصر ہے۔ حکومت اگر پورے ملک کو فوج کے حوالے بھی کر دے جب بھی گھروں کے اندر کیا ہوتا ہے اُس پر روک نہیں لگا سکتی۔ مثلاً کوئی باپ، بھائی یا قریبی رشتے دار گھر کی چار دیواری میں کسی بیٹی یا بہو کے ساتھ اگر زیادتی کرتا ہے تو اُسے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ پھر بھی یہ کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حکومت کچھ نہیں کر رہی۔ حکومت سماج کو بھی بیدار کر کے اُسے اپنی ذمے داریاں نبھانے کا احساس دلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

وزیر داخلہ: آپ اگر چاہتی ہیں کہ اس سلسلے میں کچھ اور بھی کیا جائے تو بتایئے ہم مزید اقدامات کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن ایک الگ پارلیمنٹ کا مطالبہ غیر آئینی ہی نہیں اس ملک کی بقا کے لئے شدید خطرہ بھی ہے۔ اس سے سماج ایسے دو حصوں میں بٹ جائے گا جو ملک کی سلامتی کو بھی خطرے میں ڈال دے گا۔ میری آپ سب سے استدعا ہے کہ اس خطرے کو ٹالنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بھی راہ جو آپ کے تحفظ کو یقینی بنا سکتی ہے اُس پر عمل کرنے کے لئے حکومت تیار ہے۔

خاتون ۴: وہ تو سب ملک کے آئین اور اُس کے تحت بنائے گئے قوانین میں پہلے سے موجود ہے آپ عمل ہی تو نہیں کر پا رہے ہیں۔ اُن آئینی تحفظات کو یقینی ہی تو نہیں بنا پا رہے ہیں۔ پھر آپ کی مزید یقین دہانی کیا معنی رکھتی ہے۔ (تھوڑی دیر رک کر)۔ ہم آج کے اس اجلاس میں صرف یہ جاننے کے لئے شریک ہوئیں ہیں

کہ آپ ہمارے بنیادی مطالبے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔

وزیر داخلہ: خدارا ذرا غور کیجئے۔ ایک ہی ملک میں دو پارلیمنٹ اور وہ بھی جنس کی بنیاد پر کیسے ممکن ہیں۔ ایسا کرنے سے ہم ہر گھر کو تقسیم کر دیں گے۔ ہر گھر میں ایک ایسی رسہ کشی کا آغاز ہوگا جو پورے نظام کو تباہ کر دے گی۔ ہر گھر میں جنس کی بنا پر دیواریں کھڑی ہو جائیں گی۔ عورت، مرد اور ممکن ہے عورت، عورت اور مرد، مرد کے خلاف صف آرا ہو کر پورے سماجی ڈھانچے کو ہی برباد کر دے۔

عورت ۷: لیکن اس کی ذمے داری بھی تو آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ آپ کا صدیوں سے چلا آرہا مرد اساس سماج، جس نے آج تک عورت کو اس مقام سے محروم رکھا جو اُسے حاصل ہونا چاہیے تھا اس سارے فساد کی جڑ ہے۔

وزیر تعلیم: (جو وزرا میں سب سے بزرگ ہیں) مرد اساس سماج نے جو غلطیاں کی ہیں اُن کی سزا سماج کے نظام کو تار تار کر کے آنے والی نسلوں کو تو نہیں دی جاسکتی۔

خاتون ۹: جب دونوں میں خلیج حائل ہوگی تو نئی نسلیں کہاں سے آئیں گی۔

وزیر تعلیم: قدرت کے نظام میں خلل ڈالنا خود عورت سماج کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔

عورت ۱۰: آپ دھمکی دے رہے ہیں؟

وزیر تعلیم: حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ آپ کتنے ہی سخت بند کیوں نہ باندھ لیں، کتنی ہی دیواریں کیوں نہ کھڑی کر دیں، وہ ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہیں گے۔

عورت ۸: آپ جن فطری تقاضوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اُنہیں قابو میں رکھنے یا غیر موثر کرنے کے وسائل اب ہمارے پاس موجود ہیں۔ اب دنیا فطرت کا رخ موڑنے کا ہنر بخوبی جانتی ہے۔ آج کی دنیا میں مرد عورت کے لئے اور

عورت مرد کے لئے ضروری نہیں ہے۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں۔

وزیر تعلیم: مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے لازمی نہ بھی ہوں جب بھی نئی نسلیں پیدا ہوں گی دنیا آگے بڑھے گی، ختم نہیں ہوگی۔

صدر صاحبہ: (وزیر داخلہ سے) خیر یہ مسئلہ نہایت سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ اِسے حل کرنے کے لئے اگر آپ کے پاس کوئی خاص تجویز ہو تو ارشاد فرمائیں۔

وزیر داخلہ: ایک نہیں بہت سی تجاویز ہیں لیکن پہلے اس کا یقین ہو جانا چاہیئے کہ متذکرہ مطالبے کے علاوہ بھی کوئی راہ آپ کے لئے قابل قبول ہوگئی ہے۔ ایک اور بات، میں آپ سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ بات چیت کی فضا کو موثر بنانے کے لئے اگر مظاہروں کا سلسلہ اس وقت تک معطل کر دیا جائے جب تک بات چیت ہو رہی ہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

صدر صاحبہ: مظاہروں کو روکنا ممکن نہیں، البتہ ہم نے ذہن کے سبھی دروازے کھلے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ تجاویز پیش کریں ہم انہیں اپنی جنرل کونسل کے سامنے رکھ دیں گے۔ ہم جو یہاں موجود ہیں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہیں۔

(وزیر داخلہ فائل سے ایک کاغذ نکال کر صدر صاحبہ کے حوالے کرتے ہوئے میٹنگ کو ختم کرنے سے پہلے اگلی میٹنگ کی تاریخ طے کرنے کے ساتھ سب کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔)

(فیڈ آوٹ)

(فیڈ اِن)

مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا ہے۔

صدر صاحبہ وزیر داخلہ کے دیئے کاغذ میں درج حکومت کی تجاویز کو ایک ایک کر

کے پڑھ کر سب کو اُن پر اظہارِ رائے کی دعوت دیتی ہیں۔

صدر صاحبہ: اگر خواتین الگ پارلیمنٹ قائم کرنے کے مطالبے کو ترک کر دیں تو حکومت حسبِ ذیل اقدامات پر عمل کرنے کے لئے تیار ہے:

ا۔ پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز اداروں کی کل نشستوں (جن میں درج فہرست ذاتوں کے لئے مختص کی گئی نشستیں بھی شامل ہیں) میں پچاس فیصد کو خواتین کے لئے مختص کرے گی۔

(ایک خاتون جو کافی دیر سے پیچ وتاب میں مبتلا ہے صدر صاحبہ کے رُکتے ہی یک لخت اٹھ کر بولنا شروع کر دیتی ہے۔ صدر صاحبہ اُسے روکتے ہوئے فرماتی ہیں۔)

صدر صاحبہ: ابھی میں نے اپنی بات ختم نہیں کی اور نہ آپ کو بولنے کی ہی دعوت دی ہے۔ صبر سے کام لیجئے۔ نظم وضبط قائم رکھئے جس کو بولنے کی دعوت دی جائے وہ بولے تا کہ ہر ایک کو بولنے کا موقع ملے۔

خاتون اپنی نشست پر بیٹھ جاتی ہے۔ صدر صاحبہ اپنی بات جاری رکھتی ہے۔
میں چاہوں گی کہ جو خواتین بولنا چاہتی ہیں وہ مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کریں تا کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ (متذکرہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اب اگر آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں تو فرمائیں۔

خاتون ا: واہ واہ کیا بات ہے! اس جلد بازی کے لئے حکومت کو داد دیئے ہی بنتی ہے۔ چارہ ماہ کے مسلسل کہرام کے بعد اور ملک کو ایک شدید بحران میں مبتلا کر کے اب حکومت خوابِ خرگوش سے بیدار ہوئی ہے اور وہ بھی صرف یہ کہنے کے لئے کہ پارلیمنٹ کی نصف نشستیں خواتین کے لئے مختص کر دے۔ اس کرم فرمائی کا مطلب نہ صرف خواتین میں پھوٹ ڈلوانا ہے بلکہ انہیں ایک بار پھر اُس احساس کمتری میں مبتلا کرنا ہے جس کا شکار وہ اُس وقت ہوئی تھیں جب مجبور سمجھ کر مردوں کے ہاتھوں بے حرمتی کا شکار ہونے سے اُسے ایک مرد نے ہی بچایا تھا۔ وہ مرد اُس وقت ایک خاتون کو عریاں ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آج اُس مرد کی آنکھیں کیوں نہیں

کھلتی جب کہ اُس کے ہم زاد ہر چوراہے پر عورت کے عریان جسم کی نمائش کر کے دولت کمانے میں مصروف ہیں۔

(وہ جذبات سے مغلوب ہو کر نشست پر بیٹھ جاتی ہے۔ صدر صاحبہ دوسری خواتین کو بولنے کی دعوت دیتی ہیں۔)

خاتون ۷: عورت جاتی اک الگ سماج کا درجہ رکھتی ہے۔ اُس کی ضرورتیں، اس کے مقاصد جداگانہ ہیں۔ پھر وہ اپنے لئے ایک الگ نظام کیوں نہ قائم کرے۔ وہ اُن کے ساتھ کیوں کام کرے جن کا مقصد ہی اقتدار کا غلط استعمال کرنا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ دوسروں پر ظلم روا رکھا ہے۔ ذرا موجودہ پارلیمنٹ کے کردار کو دیکھئے۔ نصف سے زیادہ ممبران مختلف اسکینڈلز، قتل و غارت گری، رشوت ستانی اور عصمت دری کے مقدمات میں ملوث ہیں۔ اُن میں کیا کوئی خاتون بھی شامل ہے۔ نہیں!! پھر ایسی جاتی جو جس تھالی میں کھاتی اُس میں چھید کرنے کی مہلک بیماری کا شکار ہے۔ بھلا ملک و قوم کا کیا بھلا کر سکتی ہے۔ ہم اُن کے ساتھ کام کر کے خود کو بھی گنہگار کیوں بنائیں۔ میری ناچیز رائے تو یہی ہے کہ ہمیں الگ پارلیمنٹ قائم کرنے کے مطالبے کو ترک نہ کرنا چاہیے، چاہے یہ جدوجہد کتنا ہی طول کیوں نہ کھینچے۔

(اپنی بات ختم کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ صدر صاحبہ ایک اور کھڑے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔)

خاتون ۵: میں بھی اس کے حق میں ہوں کہ ہمیں اپنی پارلیمنٹ الگ سے قائم کرنی چاہئیے ورنہ ہم ایک بار پھر اُسی شیطانی جال میں پھنس جائیں گے جس میں آج تک پھنسی ہوئی ہیں۔

خاتون ۳: (جو قدرے بزرگ ہیں)۔ اس میں شک نہیں کہ ہم پر صدیوں سے ظلم ہوتا آیا ہے۔ مرد ذات نے ہمیں غلاموں سے بھی بدتر زندگی جینے پر مجبور کیا ہے۔ ہماری وفاداری اور فطری کمزوری کا اُس نے ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر یہ بھی

حقیقت ہے کہ ہم ہیں تو اُسی کے رفیق و ہمدم۔ قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے لئے ہی تو پیدا کیا ہے۔ اس کائنات کا پورا نظام جوڑوں کی ترتیب و تشکیل پر قائم ہے۔ چرند پرند ہی نہیں اس کائنات کے ذرے ذرے کا وجود بھی فطرت نے دوئی کے اسی اصول کے تحت قائم کیا ہے۔ یہی نظام اگر ایک طرف آدم کو پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف وہ تباہ کن مادہ بھی پیدا کرتا ہے جو ایٹم کے وجود میں لاوا بن کر کھولتا ہے۔ اس لئے کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح غور کر لینا بہتر ہے۔ ہمارا مقصد سماج کو دو دھڑوں میں تقسیم کر کے مسلسل رسہ کشی کو جنم دینا نہیں بلکہ عورت پر ہو رہے مظالم کا سدباب کرنا ہے۔ یہ کام اگر مرد سماج کی معاونت سے ہو تو میرا خیال ہے سب سے بہتر ہے۔ اُس کے خلاف صف آرا ہو کر شاید ہم عورت کو تحفظ فراہم کرنے کی بجائے اُسے اور بھی غیر محفوظ کرنے کا موجب بنیں۔ شکریہ!!

(بیٹھ جاتی ہے۔ صدر صاحبہ چند اور خواتین کو بولنے کا موقع دیتی ہیں۔ اُس کے بعد فیصلے کی گھڑی آجاتی ہے اور وہ پورے ہال سے مخاطب ہو کر فرماتی ہیں۔)

صدر صاحبہ: تو پھر اس پہلی تجویز کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ جہاں تک آپ کی تقاریر کا تعلق ہے اُن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہال میں ایسی خواتین کی تعداد زیادہ ہے جو اس تجویز کے خلاف نہیں۔ لیکن ہمیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے وہ متفقہ فیصلہ ہونا چاہیئے۔ میں حکومت کو یہ احساس دلانا چاہتی ہوں کہ ہم متحد و مستحکم ہیں۔ یہ تاثر نہیں دینا چاہتی کہ ہم بٹی ہوئی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہماری تحریک کمزور تو ہوگی ہی حکومت کو اس کا غلط استعمال کرنے کا ایک موقع اور مل جائے گا۔

(تھوڑی دیر کے لئے پورے ہال پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ پھر بزرگ خواتین میں سے ایک جو سب سے معمر ہے) اور جس کا سب احترام کرتے ہیں کھڑی ہو کر مخاطب ہوتی ہیں۔)

معزز خاتون: اس مد کو سرِ دست التوا میں رکھئے اور دوسری تجاویز کو پڑھیئے۔ اگر وہ خواتین کے تحفظ کے سلسلے میں مثبت ثابت ہوتی ہیں تو پھر اس کے بارے میں بھی

فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔

سارا ہال اس تجویز کی تائید کرتا ہے۔

صدر صاحبہ: ٹھیک ہے، میں دوسری تجویز پڑھ لیتی ہوں۔

۲۔ ''پچاس فیصد تخصیص کے اس اصول کا اطلاق سرکاری وغیرہ سرکاری ملازمتوں پر بھی ہوگا۔ اس میں فوج اور دوسرے عسکری ادارے بھی شامل ہیں۔''

(تھوڑی دیر رک کر ہال کا جائزہ لیتی ہے۔ ہال سے آواز آتی ہے۔)

آواز: ساری تجاویز ایک ساتھ پڑھ ڈالئے ہم سن رہی ہیں۔

صدر صاحبہ: ۳۔ ''حکومت عورتوں کے مسائل کو حل کرنے اور اُن کے مقدمات کو سننے کے لئے خواتین کی ہی عدالتیں قائم کرے گی۔

۴۔ اُن کے لئے تعلیمی ادارے یعنی اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں الگ سے قائم کی جائیں گی۔

۵۔ اُن کے اسپتال اور صحتِ عامہ کے ادارے الگ ہوں گے۔

۶۔ ریکریشن پارکس، سیر گاہیں، ہوٹل، سینما ہال، کیفی ٹیریاز، شاپنگ کمپلکس مال، کلبز اور مینا بازار الگ ہوں گے جہاں مرد ذات کا سایہ بھی دکھائی نہ دے گا۔

۷۔ اُن کے الگ کھیل کے میدان اور اسٹیڈیم ہوں گے جہاں دیکھنے والی تماش بین بھی خواتین ہی ہوں گی۔

۸۔ جہاں تک شمشان گھاٹوں، قبرستانوں اور تجہیز و تکفین کے اداروں کا تعلق ہے یہ چونکہ سماجی ادارے ہیں اس لئے ان اداروں کو جیسے وہ اس وقت ہیں ویسے ہی رکھنا چاہتی ہے یا انہیں بھی تقسیم کر کے مردوں اور عورتوں کے الگ الگ شمشان گھاٹ، قبرستان اور تجہیز و تلقین کے ادارے قائم کرنا چاہتی ہیں۔ حکومت اُس کے فیصلے کا احترام کرے گی۔ عورتوں کی میت کے ساتھ صرف عورتیں اور مردوں کی میت کے ساتھ صرف مرد جایا کریں گے۔ یہ ادارے اسی سے مشترک رہیں گے جیسے کہ اس وقت ہیں اس کا انحصار بھی سماج کے فیصلے پر ہوگا۔

۹۔ جہاں تک شادی بیاہ کے معاملات کا تعلق ہے یہ بھی ایک سماجی ادارہ ہے اور اُسی کے اختیار میں ہے کہ وہ اس کے بارے میں قطعی فیصلہ کرے کہ اُسے جوں کا توں برقرار رکھنا ہے یا اُسے بھی کوئی دوسری صورت دینا ہے۔ اگر کوئی دوسری صورت دینا ہے تو پھر یہ طے کرنا ضروری ہے کہ عورت اور مرد کے مابین رشتے کی نوعیت کیا ہوگی۔ دونوں کے اشتراک سے جننے والی نسلوں کی افزائش کی ذمہ داری کون اٹھائے گا اور اگر اس رشتے کو تحلیل کرنا ہے تو پھر کنبے کی نوعیت کیا ہوگی جو سارے نظام کی بنیاد کل ہے۔ اُسے قائم رہنا ہے کہ نہیں؟ اگر قائم رہنا ہے تو پھر سماج کا بنیادی ادارہ کون سا ہوگا۔ ہم کہیں پھر قبیلیاتی نظام حیات کی طرف تو نہیں لوٹ رہے، جس میں کنبے کی بجائے قبیلہ بنیادی اکائی ہوتا ہے۔

۱۰۔ اس نئے نظام حیات کا ابتدائی دس برس کے بعد بغور جائزہ لیا جائے گا۔ جائزے کے بعد اگر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ نظام حیات کامیابی سے چل رہا ہے اور اس نے سماج و ملک کو بہتر بنانے میں کارآمد کردار ادا کیا ہے تو پھر اسے ہی ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیا جائے گا ورنہ اُسے کالعدم قرار دے کر اُسی نظام کی طرف لوٹ جانا ہوگا جو اس وقت چل رہا ہے۔

ساری تجاویز پڑھنے کے بعد کاغذ کو ایک طرف رکھتے ہوئے صدر صاحبہ پھر سامعین سے مخاطب ہوتی ہے۔

صدر صاحبہ: محترم خواتین! حکومت کی طرف سے ملی تجاویز میں آپ کے گوش گزار کر چکی ہوں۔ اب آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم حکومت کو اس سلسلے میں کیا جواب دیں۔

ایک نوجوان خاتون کھڑی ہو کر صدر صاحبہ سے مخاطب ہوتی ہے۔

نوجوان خاتون: اس فہرست میں ایک اور حد کا اضافہ کر کے اور آٹھویں اور نویں تجاویز کو چھوڑ کر منظوری کا اعلان کر دیجئے۔

صدر صاحبہ: نئی تجویز کیا ہے؟

نوجوان خاتون: ملک کی نائب وزیر اعظم ہمیشہ عورت ہوا کرے گی۔

یوں ہال اس مد کی تائید میں تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔ چنانچہ ایک تجویز کے اضافے اور آٹھویں ونویں تجاویز کو چھوڑ کر پورے مسودے کو منظور کرلیا جاتا ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

حکومت اور خواتین کے نمائندوں کے درمیان سمجھوتہ اگر چہ طے پا گیا لیکن حقیقت میں اس سمجھوتے تک پہنچنے کے لئے حکومت کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ صرف پارلیمنٹ کو متحد رکھنے کے لئے یہ سب کیا گیا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ الگ پارلیمنٹ اگر قائم بھی ہو جاتی جب بھی اتنا نقصان نہ ہوتا جتنا اُسے متحد رکھنے کے لئے اٹھانا پڑا۔ تقسیم کی بنیاد تو حقیقت میں پڑ چکی تھی۔ چنانچہ سمجھوتے کو عملی شکل دینے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس میں حکومت اور خواتین کے نمائندوں کی تعداد برابر تھی۔ سب سے پہلے آئین کی اُن دفعات میں ترمیم کی گئی جن کا تعلق انتخابات یا سیٹوں کی تقسیم سے تھا۔ پھر اُن دفعات کا جائزہ لیا گیا جن کا تعلق کابینہ سے تھا اور اُن میں اُس شق کا اضافہ کیا گیا جس کے تحت نائب وزیر اعظم کے عہدے کو خواتین کے لئے مختص کرنا تھا۔ ریزولیشن کے قوانین میں بھی ترمیم کی گئی اور اس طرح کم وبیش ایک سال کی مدت کے اندر اور انتخابات سے پہلے ہی وہ سب کرلیا گیا جس کے تحت اب نئے نظام کو چلانا مقصود تھا۔

نئے انتخابات کے بعد پارلیمنٹ کی صورت قطعی بدل گئی۔ اب اُس میں خواتین کی تعداد اُتنی ہی تھی جتنی مرد اراکین کی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ یہ سبھی خواتین کسی ایک پارٹی کی ٹکٹ پر منتخب ہو کر نہیں آئی تھیں اس لئے جو خاتون یا خواتین جس پارٹی کی ٹکٹ پر کامیاب ہو کر آئی تھیں وہ اپنی پارٹی کے لئے مخصوص نشستوں پر جیتنے والے مرد ایم پیز کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ پارلیمنٹ کا اجلاس جب شروع ہوا تو ابتدائی چند دن رسمی کارروائیوں پر صرف کرنے کے بعد جب مختلف بلز پر بحث کا سلسلہ شروع ہوا تو نئی

صورتِ حال اپنا اثر دکھانے لگی۔ سب سے پہلے حکومت نے اُس فوڈ اسکورٹی بل کو پیش کیا جس کے تحت ملک کی ۸۰ فیصد آبادی کو سستے داموں غذا فراہم کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وزیر داخلہ جنہوں نے اس بل کو ہاؤس میں پیش کیا عملی صورت دینے پر پیدا ہونے والے مثبت نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وزیرداخلہ: عوام کی حالت بہتر بنانے کی خاطر کئے گئے سرکاری اقدامات میں یہ قدم سب سے اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔ اس کے تحت اُن تمام لوگوں کو جو غریبی کی سطح سے نیچے یا پھر تھوڑا اوپر زندگی گزار رہے ہیں، کو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانے کا موقع ملے گا۔

(سابق وزیر داخلہ جواب حزب اختلاف کے اہم رکن ہیں نے فوراً کھڑے ہو کر مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن اسپیکر نے اُنہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی اور اپنی باری کا انتظار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ چنانچہ نئے وزیر داخلہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:)

وزیرداخلہ: ہم نے گزشتہ اجلاس کے دوران عوام سے وعدہ کیا تھا کہ حکومت سنبھالتے ہی اس بل کو پیش کریں گے۔ عوام نے ہم پر بھروسہ کر کے ہمیں ووٹ دیا ہے۔ ہم اُن کے ممنون ہیں اور اب ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک اسے منظور کرا کے عملی شکل نہ دے دیں۔

(بل چونکہ نہایت اہم ہے اس لئے اسپیکر بل کے مطالعے کے لئے دو دن کا وقت دیتا ہے۔ ساتھ ہی تیسرے دن سے اس پر بحث شروع کرنے کے پروگرام کا بھی اعلان کرتا ہے۔ اس دوران کچھ اور بلز پیش کئے جاتے ہیں جن میں سے کچھ کو سلیکٹ میٹیز کے حوالے کیا جاتا ہے اور کچھ پر بحث کے لئے مختلف تاریخوں کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دو دن کے بعد جب بل پر بحث شروع ہوتی ہے تو ہاؤس خاصہ گرم ہوتا ہے۔ حزبِ اختلاف کے ایک رکن بل پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

(حزب اختلاف کے ایک ممبر) اس بل پر عمل کرنے کے بعد پیدا ہونے والے مثبت نتائج کے بارے میں حکومت نے جو دعوے کئے ہیں اُن میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے بلکہ اس بل کے پاس ہونے سے تو ملک Land of Lotus Eater's کی شکل اختیار کرلے گا۔ لوگ محنت کرنے کی بجائے کاہلی اور مفت خوری کا شکار ہو جائیں گے۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ اس کی جگہ انہیں ۱۰۰ دن کی بجائے ۲۰۰ دن کا کام فراہم کیا جاتا تا کہ وہ محنت تو کرتے۔ یوں افیونیوں کی طرح کاہلی اور مفت خوری کا شکار نہ ہوتے۔

(حزبِ اختلاف کی خاتون ممبر) لیکن ہم اس بل کی پُر زور حمایت کرتے ہیں۔ اس بل کے پاس ہونے سے سب سے زیادہ فائدہ اُن خواتین کو ہونے والا ہے۔ جن کی تعداد غریبی کی سطح کے نیچے بسنے والے طبقوں میں سب سے زیادہ ہے۔

(حزب اختلاف کے لیڈر) اپنی ہی پارٹی کی ایک خاتون ایم۔ پی کو پارٹی لائن سے الگ ہوتے دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ اُنہیں اُن کی پارٹی کے مرد ایم پیز اشاروں کنائیوں میں خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اُن پر کسی کا اثر نہیں ہوتا۔ پارٹی کی دوسری خواتین بھی اُس کا ساتھ دیتی ہیں جس سے ہاؤس میں بڑا ہنگامہ ہوتا ہے۔ حزبِ اختلاف کے مرد ممبران حکومت پر انہیں خرید کر ورغلانے کا الزام عائد کرتے ہیں جس سے ہاؤس میں مُکّے، جوتے، کرسیاں اور مائک تک چل جاتے ہیں۔ بہت خواتین و حضرات زخمی ہوتے ہیں۔ پولیس مداخلت کر کے بڑی مشکل سے ہنگامے پر قابو پاتی ہے۔ ہاؤس کا اجلاس دو دن کے لئے ملتوی کر دیا جاتا ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

حزبِ اختلاف کے ہیڈ کوارٹر میں میٹنگ ہو رہی ہے جس میں پارلیمنٹ میں ہوئے

ہنگامے کی وجوہات پر غور و خوض ہو رہا ہے۔

لیڈر: (اپنی پارٹی کی خواتین ممبران پارلیمنٹ سے) آپ کسی خواتین کی پارلیمنٹ کی اراکین نہیں ہیں۔ ہماری پارٹی کی ٹکٹ پر جیت کر ایم پیز بنی ہیں۔ مسئلہ چاہے جو بھی ہو اُس کا تعلق خواتین سے ہو یا مرد حضرات سے، آپ کو اپنی رائے نہیں پارٹی کی رائے کو پیش کرنا ہے۔ آج تو آپ نے ایک طرح سے پارٹی لائن کے خلاف بغاوت کی اُس روایت کا آغاز کیا ہے جو آگے چل کر اس نظام کے لئے ایک بڑا خطرہ ثابت ہوگی۔ اس کے لئے آپ کے خلاف چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔

ایک خاتون ایم پی: دیکھئے، ہماری بنیادی وفاداری عورت سماج سے ہے۔ ہم نے اس کا عہد کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ہم آپ کی پارٹی کی ممبر ہیں۔ ہم کسی ایسے مسئلے پر پارٹی کا ساتھ نہیں دے سکتیں جس سے عورتوں کا نقصان ہوتا ہو۔ اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کی ہم نے قسم کھائی ہوئی ہے۔

لیڈر: یہ بغاوت ہے۔ پارٹی اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

خاتون ایم پی: ہمیں اس کی پرواہ نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو ہم پارٹی سے مستعفی ہو سکتی ہیں۔

لیڈر: بغاوت کرنے سے تو یہی بہتر ہے۔

(قومی و مقامی اخباروں کے شام کے شماروں میں یہ خبر لوگوں نے بڑے جلی حروف میں چھپی ہوئی پڑھی کہ حزب اخلاف کی خواتین ایم پیز پارٹی سے مستعفی ہوگئی ہیں۔ اس خبر سے حکومت کر رہی اکثریتی پارٹی میں جہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی وہاں یہ سوچ کر اُسے اپنی پارٹی کی چولیں بھی قدرے ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں کہ کہیں اُن کی خواتین ایم پیز بھی کسی موقعے پر اسی طرح کے رویّے کا مظاہرہ نہ کر بیٹھیں۔)

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

(ایک ریاستی اسمبلی کے ایوانِ زیر میں ایک ایسی تجویز پر بحث ہو رہی ہے جس کا مقصد اسکولوں میں چل رہی مِڈ ڈے میلز (Mid Day Meals) کی اسکیم کو کالعدم قرار دے کر اس کی جگہ وظائف جاری کرنا ہے۔)

وزیر اعلیٰ: مجھے بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی سرکار کی طرف سے جاری مِڈ ڈے میلز اسکیم سے وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا جس کو حاصل کرنے کے لئے اسے جاری کیا گیا تھا۔ کچھ سماج دشمن عناصر نے اسے حکومت کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ حال ہی میں ہوئی بچوں کی اموات، جو خراب اناج اور زہر آلود غذا کھلانے سے ہوئی ہیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔ مقامی ملازمین یا وہ عملہ جس کے ذمے یہ کام ہے اس اسکیم کو درست طریقے سے نافذ کرنے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں بلکہ کچھ اسے ذاتی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ اگر اس طرح کے ایک دو واقعات اور ہو گئے تو عوام ہماری پارٹی کو ہمیشہ کے لئے معتوب کر کے قعرِ مذلّت کی نذر کر دیں گے۔ اس لئے اس سے بہتر یہ ہے کہ مرکزی سرکار سے استدعا کی جائے کہ وہ ہمیں اس کی اجازت دے کہ ہم اس کی جگہ مستحق طلبا و طالبات کو وظائف یا مالی امداد دیں۔

اسپیکر: وزیر تعلیم!

وزیر تعلیم: (اٹھتے ہوئے) وزیر اعلیٰ درست فرما رہے ہیں۔ اس اسکیم کو سماج دشمن بلکہ حکومت دشمن عناصر اپنے مفاد کے لئے اس طرح استعمال کرنے لگے ہیں کہ خرابیوں کا سارا الزام حکومت کے سر منڈھا جا رہا ہے۔ اس لئے اس اسکیم کی جگہ اگر اتنا روپیہ وظیفے کے طور پر ہر غریب بچے کو دے دیا جائے جتنا اس اسکیم کے تحت ہر بچے پر خرچ کیا جا رہا ہے تو حکومت اُن خطرات سے بچ جائے گی جو اس اسکیم کی وجہ سے پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

اسپیکر: وزیر سماجی بہبود

وزیر سماجی بہبود: میں بھی اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔

اسپیکر: (حزبِ اختلاف کے لیڈر) مجھے یہ بات سمجھ نہیں آرہی ہے کہ جو بحث مرکزی پارلیمنٹ میں ہونی چاہیے تھی اُسے ہم یہاں کیوں کر رہے ہیں۔ یہ تو محض وقت کا زیاں ہے۔ اس اسکیم کو نافذ کرنے کا کام ریاستی سرکاروں کو دیا گیا ہے۔ ریاستی سرکاریں اگر اپنی ذمے داریاں نہیں نبھا پا رہی ہیں تو اُس میں اسکیم کا کیا قصور ہے۔ حکومت کو اگر اپنے ملازمین پر اختیار نہیں ہے تو یہ اُس کی نالائقی و نا اہلی ہے۔ اُسے اپنے گھر کو ٹھیک کرنا چاہیئے۔ (بیٹھ جاتا ہے)۔

اسپیکر: وزیر دفاع!

وزیر دفاع: سرکاری ملازمین بھی اُسی سماج کا حصہ ہیں جس کا حصہ ہم اور آپ ہیں۔ اقتدار کے زوال کی وجہ سے ہم میں اب وہ جذبۂ حب الوطنی باقی نہیں رہا جس نے قوم کو آزادی کی منزل تک پہنچایا تھا۔ چنانچہ سماج میں اب ویسے لوگوں کا سکہ چلنے لگا ہے جو قربانی کی بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ اصل بیماری یہ ہے۔ (بیٹھ جاتا ہے)

(یہ کارروائی دن بھر چلتی ہے۔ بہت سے ممبران اسکیم سے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ آخر میں جب تجویز پر ووٹنگ کا مرحلہ آتا ہے تو حزبِ اقتدار کی ہی ایک خاتون ممبر اسپیکر سے کچھ کہنے کے لئے وقت مانگتی ہے۔ چونکہ پورے دن کی کاروائی میں وہ پہلی خاتون ہیں جو کچھ کہنا چاہتی ہیں اس لئے انہیں وقت دیا جاتا ہے۔)

خاتون ممبر: اسپیکر صاحب، میں صبح سے ہاؤس کے معزز ممبران کے خیالات سن رہی ہوں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی ممبر نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ اس اسکیم کے جاری رکھنے سے کیا فائدے یا نقصانات ہیں۔ کسی نے اگر حزبِ اقتدار کو ساری خرابیوں کا ذمے دار ٹھہرایا ہے تو ان باتوں کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(فیڈاِن)

(ایک ریاستی اسمبلی کے ایوانِ زیر میں ایک ایسی تجویز پر بحث ہورہی ہے جس کا مقصد اسکولوں میں چل رہی مِڈ ڈے میلز (Mid Day Meals) کی اسکیم کو کالعدم قرار دے کر اس کی جگہ وظائف جاری کرنا ہے۔)

وزیر اعلیٰ: مجھے بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی سرکار کی طرف سے جاری مِڈ ڈے میلز اسکیم سے وہ مقصد پورا نہیں ہورہا جس کو حاصل کرنے کے لئے اسے جاری کیا گیا تھا۔ کچھ سماج دشمن عناصر نے اسے حکومت کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ حال ہی میں ہوئی بچوں کی اموات، جو خراب اناج اور زہر آلود غذا کھلانے سے ہوئی ہیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔ مقامی ملازمین یا وہ عملہ جس کے ذمے یہ کام ہے اس اسکیم کو درست طریقے سے نافذ کرنے میں ناکام ہوتے جارہے ہیں بلکہ کچھ اسے ذاتی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ اگر اس طرح کے ایک دو واقعات اور ہوگئے تو عوام ہماری پارٹی کو ہمیشہ کے لئے معتوب کرکے قعرِ مذلّت کی نذر کردیں گے۔ اس لئے اس سے بہتر یہ ہے کہ مرکزی سرکار سے استدعا کی جائے کہ وہ ہمیں اس کی اجازت دے کہ ہم اس کی جگہ مستحق طلبا و طالبات کو وظائف یا مالی امداد دیں۔

اسپیکر: وزیر تعلیم!

وزیر تعلیم: (اٹھتے ہوئے) وزیر اعلیٰ درست فرما رہے ہیں۔ اس اسکیم کو سماج دشمن بلکہ حکومت دشمن عناصر اپنے مفاد کے لئے اس طرح استعمال کرنے لگے ہیں کہ خرابیوں کا سارا الزام حکومت کے سر منڈھا جارہا ہے۔ اس لئے اس اسکیم کی جگہ اگر اتنا روپیہ وظیفے کے طور پر ہر غریب بچے کو دے دیا جائے جتنا اس اسکیم کے تحت ہر بچے پر خرچ کیا جارہا ہے تو حکومت اُن خطرات سے بچ جائے گی جو اس اسکیم کی وجہ سے پیدا ہوتے جارہے ہیں۔

اسپیکر: وزیر سماجی بہبود

وزیر سماجی بہبود: میں بھی اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔

اسپیکر: (حزبِ اختلاف کے لیڈر) مجھے یہ بات سمجھ نہیں آرہی ہے کہ جو بحث مرکزی پارلیمنٹ میں ہونی چاہیے تھی اُسے ہم یہاں کیوں کر رہے ہیں۔ یہ تو محض وقت کا زیاں ہے۔ اس اسکیم کو نافذ کرنے کا کام ریاستی سرکاروں کو دیا گیا ہے۔ ریاستی سرکاریں اگر اپنی ذمے داریاں نہیں نبھا پا ہی ہیں تو اُس میں اسکیم کا کیا قصور ہے۔ حکومت کو اگر اپنے ملازمین پر اختیار نہیں ہے تو یہ اُس کی نالائقی و نااہلی ہے۔ اُسے اپنے گھر کو ٹھیک کرنا چاہیئے۔ (بیٹھ جاتا ہے)۔

اسپیکر: وزیر دفاع!

وزیر دفاع: سرکاری ملازمین بھی اُسی سماج کا حصہ ہیں جس کا حصہ ہم اور آپ ہیں۔ اقدار کے زوال کی وجہ سے ہم میں اب وہ جذبۂ حب الوطنی باقی نہیں رہا جس نے قوم کو آزادی کی منزل تک پہنچایا تھا۔ چنانچہ سماج میں اب ویسے لوگوں کا سکہ چلنے لگا ہے جو قربانی کی بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ اصل بیماری یہ ہے۔ (بیٹھ جاتا ہے)

(یہ کارروائی دن بھر چلتی ہے۔ بہت سے ممبران اسکیم سے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ آخر میں جب تجویز پر ووٹنگ کا مرحلہ آتا ہے تو حزبِ اقتدار کی ہی ایک خاتون ممبر اسپیکر سے کچھ کہنے کے لئے وقت مانگتی ہے۔ چونکہ پورے دن کی کاروائی میں وہ پہلی خاتون ہیں جو کچھ کہنا چاہتی ہیں اس لئے انہیں وقت دیا جاتا ہے۔)

خاتون ممبر: اسپیکر صاحب، میں صبح سے ہاؤس کے معزز ممبران کے خیالات سن رہی ہوں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی ممبر نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ اس اسکیم کے جاری رکھنے سے کیا فائدے یا نقصانات ہیں۔ کسی نے اگر حزبِ اقتدار کو ساری خرابیوں کا ذمے دار ٹھہرایا ہے تو ان باتوں کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(حزبِ اقتدار کی صفوں میں قدرے بے چینی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔
کچھ ممبران تو خاتون کو اشاروں میں خاموش رہنے کی تلقین کرتے بھی
نظر آتے ہیں مگر اُس کی روانی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اسکیم کو اگر کالعدم قرار دیا جاتا ہے تو سب سے زیادہ نقصان یا فائدہ کس کو ہوتا ہے۔ ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ اسکیم اُن طبقوں کے بچوں کے لئے نافذ کی گئی ہے جو یا تو غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں یا پھر اُس سے تھوڑا سا اوپر ہیں۔ لیکن وہ سبھی اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ بچوں کی تعلیم کا بوجھ اٹھا سکیں۔ حکومت اگر یہ بوجھ اٹھاتی ہے تو ایک طرف تو ان کے والدین بے فکر ہو کر دن بھر محنت مزدوری کر سکتے ہیں تو دوسری طرف اُن کے بچے علم کی روشنی سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک ایسی اسکیم ہے جو ایک شہری کو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنے کے قابل بناتی ہے۔ اسے کالعدم کرنا کسی کے بھی حق میں نہیں ہے۔ اس لئے خواتین سماج اس تجویز کی تائید نہیں کر سکتا۔

ہال میں موجود سبھی خواتین چاہے وہ کسی بھی پارٹی کی ممبر ہوں، ٹیبل بجا کر اُس کی تائید کرتی ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا ہوتا کہ خود اس کی اپنی پارٹی کی خواتین اُس کی پیش کردہ تجویز کی دھجیاں بکھیر دیں گی۔ چنانچہ وہ شرمندہ ہو کر اپنی تجویز واپس لے لیتا ہے۔ اسپیکر دن بھر کی کاروائی ختم کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

(فیڈ آوٹ)

(فیڈ اِن)

شام کا وقت۔ کچھ بچیاں اور خواتین ایک پارک میں کھیلتی یا چہل قدمی کرتی نظر آتی ہیں۔ کچھ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ پارک کے باہر لیڈی پولیس کا پہرہ ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

صبح کا وقت۔ ایک پارک میں بہت سے مرد جن میں لڑکے، نوجوان اور بزرگ شامل ہیں ورزش یا سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ پارک کے ایک حصے میں دو ٹولیوں کے درمیان کرکٹ کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ پارک کے باہر مردانہ پولیس کی ایک ٹولی پہرہ دے رہی ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

ملک کی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں کام کاج کی رفتار بہت کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ خواتین ہر مسئلے کو اپنے مفادات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بہت سے ایسے بل اسی وجہ سے پاس ہونے سے رہ جاتے ہیں جو اگر پاس ہوتے تو سیاسی تنظیموں کو بہت فائدہ ہوتا۔ یا اُن کی ساکھ عوام میں اور بھی مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ رسہ کشی دھیرے دھیرے سرد جنگ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ پہلے یہ جنگ صرف حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف کے درمیان ہی چلتی تھی لیکن اب یہ جنگ دو جنسوں کے درمیان شروع ہو کر دن بدن شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہ تو پارٹی ڈسپلن ہے نہ سینئر ممبران کا احترام۔ اس سرد جنگ کا نتیجہ یہ ہوا ہے ایک توازن قائم جو تھا وہ متزلزل ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ پانچ سال کی مدت میں ہی حزبِ اقتدار کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اب خواتین کو ساتھ لے کر چلنا ممکن نہیں۔ چنانچہ الیکشن سے چند ماہ پہلے خواتین کی الگ پارلیمنٹ قائم کرنے کا بل پاس کر لیا جاتا ہے اور نیا الیکشن جنس کی بنیاد پر لڑا جاتا ہے۔ دونوں پارلیمنٹس کے بجٹوں کے مطابق انہیں سرمایہ فراہم کرنے کے لئے ایک مشترکہ قومی کمیٹی بھی قائم کر دی جاتی ہے۔ وہ بزرگ جنہوں نے مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ جدوجہد کرتے اور ملک کی خاطر قربانیاں دیتے ہوئے دیکھا تھا اُن کے لئے یہ ایک ایسی دنیا ہے جس

سے وہ مزاجاً موافقت پیدا نہیں کر پا رہے ہیں۔ چنانچہ دو بزرگ ایک پارک کے کونے میں بنچ پر بیٹھے آپس میں یوں بات چیت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بزرگ ۱: ہم کہاں سے چلے تھے کہاں آن پہنچے۔ عورتیں اور مرد کندھے سے کندھا ملائے جدوجہد آزادی میں اس حد تک غرق تھے کہ ایک دوسرے سے بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اُن کے دل ایک دوسرے کے لئے نہیں ملک کے لئے دھڑکتے تھے۔ ایک ہم ہیں کہ مرد اور عورتیں الگ الگ راستوں پر گامزن ہیں۔ ایک ہی ملک میں دو پارلی منٹس، دو وزرائے اعظم، دو صدر، کہیں دیکھا نہ سنا۔ ایک ہی گھر میں رہیں گے مگر اجنبیوں کی طرح۔ مرد صرف مردوں کے لئے سوچیں گے اور عورتیں صرف عورتوں کے لئے پھر بچوں کو بھی جنس کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے گا۔ یہ نظام کب تک چلے گا یار۔ چلے گا بھی یا نہیں۔

بزرگ ۲: آپ کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ آدم اور حوا نے جب یہ طے کر ہی لیا ہے کہ وہ جس ڈال پر بیٹھے ہیں اُسے کاٹنا ضرور ہے تو پھر غم کا ہے کا۔ کاٹنے دیں۔ قدرت انہیں وہ سبق سکھا دے گی جو تاریخ کے اوراق میں آج تک کہیں رقم نہ ہوا ہوگا۔ قدرت کے کارخانے میں آدم اور حوا کی بساط ہی کیا ہے۔ یہ زمین جس پر وہ اس قدر اتراتے پھر رہے ہیں کائنات کی وسعتوں میں ایک نکتے کی طرح ہی تو ہے۔ قدرت جب چاہے گی اسے یوں صاف کر دے گی جس طرح کوئی بچہ سلیٹ پر ڈالی لکیروں کو خود صاف کر دیتا ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

وقت گزرتا رہا۔ کچھ عرصے کے لئے عورتوں پر مردوں کی طرف سے ہونے والے مظالم میں کمی تو ضرور آئی مگر ان کا سد باب نہ ہو سکا۔ اس خوف کا خاتمہ نہ ہو سکا جس نے انہیں اس منزل تک پہنچایا تھا۔ عورت اب بھی خود کو اتنا ہی غیر محفوظ سمجھ رہی تھی جتنی وہ اس نظامِ حیات سے پہلے تھی۔ عورت کے تقدس کو پامال کرنے

والوں کو عورتوں کی عدالتوں نے سخت سے سخت سزائیں بھی دیں یہاں تک کہ بہت سے موت کے گھاٹ بھی اتار دیئے گئے لیکن وہ غیر یقینیت اب بھی عورت پر مسلط رہی جو پہلے مسلط تھی۔

مرد سماج میں بھی عورتوں کے یوں الگ ہو کر ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا لینے سے عورتوں کے تئیں اُن کے رویّے میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ اب تک انہوں نے جو نرم رویہ عورتوں کو راہ پر لانے کے لئے اختیار کر رکھا تھا وہ یک لخت بدل گیا جس کا نشانہ وہ ادارہ بنا جس میں عورت اور مرد چاہے علامتی طور پر ہی سہی رشتے میں بندھے نظر آتے تھے۔ گھریلو تشدد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ سماج کا تانا بانا بھی تار تار ہوتا نظر آیا۔ صدیوں کی اقدار کی وجہ سے مرد کو گھر میں عورت کے مجازی خدا ہونے کا جو شرف حاصل تھا ویسے تو وہ کب کا درہم برہم ہو چکا تھا مگر جہاں کہیں ابھی تک اُس کے آثار باقی تھے وہ بھی جاتے رہے۔ اب ہر گھر میدانِ جنگ بن گیا۔ اس کا سب سے بُرا اثر ان بچوں پر پڑنے لگا جو آئے دن اس جنگ کو شدید سے شدید تر ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس نفسیاتی دباؤ سے بچنے کے لئے بہت سوں نے خودکشی کا راستہ اختیار کیا یا گھروں سے فرار ہو کر جہاں سر چھپانے کی جگہ ملی، وہاں جا پہنچے۔ بچوں کی تجارت کرنے والوں کی مراد بر آئی۔ اُن کے جنسی استحصال کے واقعات نے زور پکڑا۔ انہیں جہازوں میں بھر بھر کے بیرونی ممالک کو برآمد کیا جانے لگا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے دونوں پارلیمنٹس کے خصوصی اجلاس منعقد کئے گئے۔ بڑی لمبی لمبی تقریریں ہوئیں۔ دونوں ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے رہے لیکن کوئی ایسا راستہ اختیار نہ کر سکے جو انہیں بہتری کی طرف لے جاتا۔ شاید قدرت کا یہی منشا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ آدم و حوا کو اپنے سارے ہتھیار استعمال کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ خاموشی سے دونوں کو تباہی کے راستے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ دانائی کے آسمان پر متمکن ہو چکا ہے تو یہیں سے اُس کی نادانیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں بھی قصور ایک کا نہیں دونوں کا تھا۔ چنانچہ انہوں

نے تباہی کی اس شاہ راہ پر چلتے بلکہ دوڑتے ہوئے وہ آخری چھلانگ بھی لگادی جسے وہ اپنی دانست میں نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ دوسرے دن کے اخباروں میں لوگوں نے یہ سرخیاں جلی حروف میں چھپی ہوئی دیکھیں:

''مردوں سے سارے رشتے منقطع کیے جائیں گے'' خواتین کی پارلیمنٹ کا فیصلہ۔

''شادی بیاہ کی ساری تقریبات پر دو سال کے لئے پابندی عائد'' مردوں کی پارلیمنٹ کا فیصلہ۔

'' بچے بچیوں کو الگ الگ چلڈرن ہومز اور بزرگوں کو اولڈ ایج ہومز میں رکھا جائے گا۔ دونوں پارلی منٹس کا مشترکہ فیصلہ۔''

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

(دو بزرگ اولڈ ایج ہوم کے احاطے میں اخباروں کی سرخیاں پڑھ کر گفتگو میں مصروف ہیں۔)

بزرگ ا: یہ وہ آخری کیل ہے جو ہمارے ان بیوقوفوں نے سماج کے تابوت میں نصب کیا ہے۔

بزرگ ۲: دوست، تم بس دیکھتے جاؤ۔ یہ دونوں حریف خود کو افلاطون سمجھ رہے ہیں۔ انہیں ہماری آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیں گزرے زمانے کی چیز سمجھتے ہوئے ہماری کوئی بات سنتے ہی نہیں۔ جیسے ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید کیے ہوں۔ نہ یہ بزرگوں کا احترام کرتے ہیں نہ ہمارے عمر بھر کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ غلطی پر غلطی کیے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی سب سے بہتر راستہ ہے۔ ایسے ہی قومیں تباہ ہوتی ہیں۔

بزرگ ا: ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہمارے سماج میں سب صحیح تھا۔ خرابیاں اُس میں بھی تھیں لیکن کم سے کم کنبے کے افراد ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں، چاہے رسماً ہی

سہی شریک ہوتے تھے۔ عمر کے آخری حصے میں اپنے ساتھی کی رفاقت کتنی اہم ہوتی ہے اسے یہ لوگ کیا جانیں۔ مغرب کی پیروی میں انہوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ جس نے پہلے سماج کو اکثریت اور اقلیت میں تقسیم کیا پھر جنسی اعتبار سے ایسی تحریکوں کو جنم دیا۔ جنہوں نے دونوں کے درمیان نفرت کی وہ دیوار کھڑی کر دی جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

بزرگ ۲: دھری ہی جب باقی نہ رہے تو پہیہ کیوں کر گھومے گا۔ جب کنبہ ہی باقی نہ رہا جو سماج کی دھری ہے تو سماج کا نظام کیسے بچ سکتا ہے۔ اب ہم بزرگوں کو اسی طرح الگ الگ اولڈ ہومز میں زندگی گزارنا ہوگی۔ جی کتنا چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کو دیکھوں، وہ کیسی ہے۔ کیسے یہ نئی زندگی کاٹ رہی ہے مگر ادھر کوئی جانے ہی نہیں دیتا۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو جیل بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ یا تو پاگل ہو کر مر جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ میں تو اسے انسانی نہیں حیوانی سماج کہتا ہوں۔ نہیں نہیں ایسا کہنا تو حیوانوں کو ذلیل و خوار کرنا ہے۔ اسے کچھ اور ہی نام دیا جانا چاہئے۔ ایسا تو حیوان بھی نہیں کرتے۔ نر اور مادہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہم انسانوں نے تو گراوٹ کی ساری حدیں پار کر دی ہیں۔

(اسی اثنا میں عمارت کے احاطے سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے)۔

بزرگ ا: چلو بھئی ناشتے کا وقت ہو گیا۔ اس گھنٹی کی آواز سن کر مجھے اپنے اسکول کی وہ گھنٹی یاد آ جاتی ہے جو ہر پیریڈ گزرنے کے بعد بجا کرتی تھی۔ اب شاید مرنے پر بھی یہی گھنٹی ہمارے جانے کا اعلان کرے گی۔ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے دونوں اندر جاتے نظر آتے ہیں۔

(فیڈ آوٹ)

(فیڈ اِن)

دونوں پارلیمنٹس کے فیصلے کے زیر اثر ہر گھر دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔

مرد: (معمار سے) اس گھر کے بیچوں بیچ اتنی موٹی دیوار کھڑی کر دو کہ دوسری طرف کی آواز بھی سنائی نہ دے۔

معمار: میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہی ہو۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

خاتون: (لیڈی ڈاکٹر سے) آپ کی دی ان دواؤں سے میاں سے ملنے کی خواہش اور بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ ان سے تو الٹا ہی اثر ہو رہا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر: دوا کی اپنی حدود ہیں۔ وہ اس جذبے کو زیادہ دیر تک دبا نہیں سکتی جس کو فطرت نے اس کارخانۂ حیات کو قائم کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ آپ وہ مصنوعی طریقے کیوں استعمال نہیں کرتی۔ (ڈاکٹر اشاروں سے اُس کی توجہ ایک نقشے کی طرف مبذول کراتی ہے جس کو دیکھ کر خاتون کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ پھر لیڈی ڈاکٹر اُسے ملحقہ کمرے میں لے جا کر کچھ سمجھاتی ہے اور بڑے سے لفافے میں کچھ لپیٹ کر اُسے تھما دیتی ہے۔ خاتون خاموشی سے باہر نکل جاتی ہے۔

فیڈ آؤٹ

فیڈ اِن

(ایک مرد کیمسٹ کی دکان پر کھڑا ڈاکٹر کا دیا ہوا نسخہ دکھا کر اس سے متعلقہ چیز مانگ رہا ہے۔

دکاندار: آپ کو کس ملک کی چاہیئے؟ میرے پاس امریکہ، فرانس، جاپان اور چین کی موجود ہیں۔

مرد: ڈاکٹر صاحب نے اس پر ملک کا نام نہیں لکھا؟

دکاندار: جی نہیں! اس پر کچھ نہیں لکھا۔

مرد: آپ کے خیال میں کون سے ملک کی میرے لئے بہتر ہوگی۔

دکاندار: یہ تو آپ پر منحصر ہے۔ زیادہ شہرت چینی کو حاصل ہے۔ اُس کا جوابی عملی (Response) زیادہ پُر لطف ہوتا ہے۔ وہ انسان کو گے کی مشین کی طرح موڑ ڈالتی ہے۔

مرد: (آنکھ مارتے ہوئے) آدمی زندہ تو رہتا ہے نا؟

دکاندار: ارے آپ نے تو حد کردی۔ زندہ ہی نہیں رہتا اور بھی جاندار بن کر زندگی گزارتا ہے۔

مرد: تو وہی دے دیجئے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن)

(دھیرے دھیرے جزیرے کے سبھی قصبوں سے اسپتالوں میں لاشیں آنے لگی، جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ انہیں دہکتی سلاخوں یا گرم سکوں سے داغ دار کر کے مارا گیا ہو۔ حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ سا آ گیا۔ لاشوں کے آنے کی رفتار اس قدر زیادہ تھی کہ اُن کا سنسکار کرنا یا تجہیز و تلقین کرنا مشکل تھا۔ چاروں طرف جزیرے میں ایسی سڑاند پھیل گئی کہ کسی مہلک بیماری کے پھیلنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ غیر ملکی سفارت خانے بند ہو گئے۔ جزیرے کے کسی شہری کو کوئی ملک اپنے ہاں پناہ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے دونوں پارلی منٹس کا مشترکہ اجلاس بلایا گیا جس میں صورتِ حال پر قابو پانے کے بارے میں یوں گفتگو ہوتی رہی۔)

وزیر اعظم (مرد): اب تک دس ہزار افراد جن میں عورتیں، مرد اور بچے شامل ہیں لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ اگر حالات ایسے ہی رہے تو اگلے دو ماہ میں پورا جزیرہ قبرستان یا شمشان گھاٹ میں تبدیل ہو جائے گا۔

وزیر اعظم (خاتون): ہمارا یہ خیال غلط ثابت ہوا ہے کہ یہ کسی بیرونی طاقت کا کام ہے جو ہمارے جزیرے کو ہتھیانا چاہتی ہے۔ یہ کوئی ایسی بیماری ہے جس کا کسی کو

بھی علم نہیں ہے۔

وزیرِ صحت (مرد): ماہرین کی جو ٹیم حقیقت جاننے لئے متعین کی گئی تھی، خاص طور سے یہ پتہ کرنے کے لئے کہ انسانوں کے جسم داغدار ہونے کی کیا وجوہات ہیں اُن کا کہنا ہے لاشوں کے بدنوں پر نمودار ہونے والے جلنے کے داغ باہر سے نہیں اندر سے نمودار ہونے والے شعلوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی انسانوں کے بدنوں کے اندر ہی کوئی ایسا مادہ پیدا ہو رہا ہے جو آگ کے شعلوں کی طرح جب باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اندر سے ہی نہیں باہر سے بھی انسان کو جلا کر مار دیتا ہے۔

وزیرِ دفاع (عورت): اس کا کوئی علاج روک تھام کا کوئی طریقہ؟

وزیرِ صحت (مرد): ابھی تک دریافت کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ بین الاقوامی ماہرین بھی کچھ دریافت نہ کر سکے ہیں۔

وزیرِ اعظم (مرد): اُن لاشوں کا کیا کِیا جائے جن کے انبار لگتے جا رہے ہیں۔

وزیرِ دفاع (عورت): وہ اتنی جلدی گلتی سڑتی جا رہی ہیں کہ اُن کو نذرِ آتش یا دفن کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔ بہتر یہ ہوگا کہ انہیں سمندر کے حوالے کر دیا جائے۔

وہ جزیرہ جو ایک سال قبل انسانوں سے بھرا ایک آزاد ملک تھا آج کھنڈرات پر مشتمل ایک لق ودق صحرا بن چکا ہے۔ جہاں کوئی پرندہ بھی آج دکھائی نہیں دیتا۔ لوگ کہتے ہیں اُس جزیرے میں بسنے والے انسانوں اور چرندوں پرندوں کو اُن کے بدنوں سے پھوٹنے والی دہکتی آگ نے نگل لیا ہے۔ اُن کے بدنوں سے پھوٹتی یہ آگ کیا تھی آج تک کسی کو پتہ نہیں چل سکا ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

............☆☆☆............

جموں اینڈ کشمیر

اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کی طرف سے ریاست میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں

کا احاطہ کرنے والا دوماہی خبر نامہ

"ثقافت"

دبیز کاغذ، خوبصورت ڈیزائننگ اور آفسیٹ پرنٹنگ سے آراستہ

۱۲، صفحات پر مشتمل

ملنے کا پتہ:

کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ، لداخ

☆☆☆☆

☆......عبدالغنی شیخ

انجام

کردار

صنم چھوانگ	گاؤں کا پچاسی سالہ ایک بزرگ
نمبردار	
مہنت	
ٹشی پھلیے	مہنت کا معاون
پدماں	ٹشی پھلیے کی بیٹی
ماں	پدماں کی ماں
صنم	ایک ڈاکٹر
ماں	صنم کی ماں
ینگچن	صنم کی بہن
فلاحی تنظیم کا ممبر	
انسپکٹر نعمان	
سب انسپکٹر	
ہیڈ کانسٹیبل	
کانسٹیبل	
گاؤں کا نمائندہ	

اخبار کا نامہ نگار

ریڈیو کا نامہ نگار

لال گوئل — مجرم

انگت — مجرم

گنپہ تنظیم کا صدر

تنظیم کے ممبران

عورت

ٹی۔وی کا نامہ نگار

گاؤں کا ممبر

سین......۱

منظر: لداخ کا ایک گاؤں۔ پہاڑی پر قدیم گنپہ (خانقاہ) گنپہ کے پاس بہت سارے لوگ جمع ہیں جو گنپہ کی پوتر مورتی کی چوری پر واویلا کر رہے ہیں۔

وقت: صبح کا وقت۔

صنم چھوانگ: گنپہ کی گم شدہ مورتی چنڈ ازک (اویلوکیتیشورا) ہمارے گاؤں کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔اس کے دم سے یہاں برکت ہے۔

نمبردار: اس کی وجہ سے ہم بلاؤں اور چھوت کی بیماریوں سے محفوظ رہے ہیں۔ اس کی چوری گاؤں کی تاریخ کا سب سے اندوہناک واقعہ ہے۔

صنم چھوانگ: یہ مورتی بہت پرانی ہے۔ میں جب کمسن تھا، یہ پوتر مورتی اس گنپہ میں تھی۔ میرے دادا اور پردادا سے یہ بات ہم تک چلی آرہی ہے کہ مورتی تب بھی یہاں موجود تھی۔

عورت: اس کے ہاتھ جل جائیں، جس نے ہمارے تقدس چنڈازک کو چھوا ہو اور اس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں، جس نے بُری نظروں سے اس کو دیکھا ہو۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: ٹشی پھلیے! آخر یہ چوری کیسے ہوئی؟ ہمارے گاؤں میں ایسی واردات پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

ٹشی پھلیے: (رونی آواز میں) جناب! میں کل شام حسب معمول گنپہ میں مورتیوں کے حضور میں شمعیں جلانے گیا تھا۔ تب ساری پوتر مورتیاں موجود تھیں (صبح سے وہ یہ واقعہ کئی آدمیوں کو سنا چکا تھا۔)

صنم چھوانگ: (بات کاٹ کر) لاما جی کہاں تھے؟

ٹشی پھلیے: مہنت جی گاؤں گئے تھے۔ سب جانتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں میں شمعیں جلاتا ہوں۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: پھر کیا ہوا؟

ٹشی پھلیے: آج صبح تڑکے جب میں دروازہ کھول کر گنپہ کی بڑی عبادت گاہ میں داخل ہوا تو چنڈازک کی پوتر مورتی غائب تھی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھایا۔ میں نے جلدی جلدی دوسری مورتیوں اور تھنکوں کو دیکھا۔ سارے موجود تھے۔ میں نے فوراً دوسرے لاما پجاریوں اور نمبردار کو یہ بری خبر سنائی۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: چور مورتی کی اہمیت کو جانتا ہوگا۔

ٹشی پھلیے: جناب! میں کیا کہہ سکتا ہوں! (ایک چٹان کی کوہ کی طرف اشارہ کرتا ہوا۔ ہم چابی اسی کوہ میں رکھتے ہیں۔ صرف مہنت اور مجھے اس جگہ کا علم ہے۔ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں سہولیت کے لئے ہم گنپے کی چابی یہاں چھپا کر رکھتے ہیں۔ چابی یہاں رکھی تھی۔ حسبِ معمول گنپہ کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو یہ بُرا دن دیکھا۔ (وہ بے بسی میں اپنا سر ہلانے لگا۔)

گاؤں کا نمائندہ: تم نے گنپہ کے آس پاس کسی مشکوک آدمی تو نہیں دیکھا ہے کل یا آج۔

ٹشی پھلیے: کسی کو نہیں دیکھا، جناب۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: یہ واردات رات کو ہوئی ہوگی۔

نمبردار: ٹشی پھلیے! یہ اچھا نہیں ہوا۔ اب ہم پر مصیبت آئے گی۔

(پھر مہنت پہنچا۔ اس کے کانوں میں چوری کی بھنک پڑی تھی۔)

مہنت: (ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا اپنے ماتھے پر دو تھپڑ مار کر) یہ اس گاؤں کا سب سے انمول خزانہ تھا۔ چنڈ ازک کی یہ مورتی چھ سو سال پرانی ہے۔ راجا ٹق بکم دے کے زمانے میں تبت سے لداخ لائی گئی تھی اور گیا لپوخ نے یہاں رکھوائی تھی۔ (گاؤں کے سرکردہ افراد کی طرف دیکھ کر) ہمیں اب کیا کرنا چاہیئے؟

نمبردار: ہمیں پولیس کو فوراً رپورٹ کرنی چاہیئے۔

نمائندہ: کسی آدمی کو فوراً لیہہ بھیج دو۔

سین......۲

(تین روز بعد تفتیش کے لئے لیہہ سے ایک پولیس سب انسپکٹر کی قیادت میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں پر مشتمل ایک ٹکڑی آئی۔ پولیس نے جائے واردات کو دیکھا اور ان کے سامنے ٹشی پھلیے نے ایک دفعہ وہی بیان دیا، جو وہ سب کے سامنے دے چکا تھا۔

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) تمہیں کسی پر شک ہے؟

ٹشی پھلیے: نہیں جناب۔

سب انسپکٹر: (مہنت سے) کیا آپ کو کسی پر شک ہے؟

مہنت: نہیں۔ مجھے کسی پر شک نہیں۔ ایسی واردات پہلے یہاں کبھی نہیں ہوئی۔

سب انسپکٹر: کیا اس دوران کوئی اجنبی گنپہ دیکھنے آیا؟

مہنت: کوئی نہیں آیا۔ البتہ حال میں بڑے دن پر ہمارے گاؤں والوں اور آس پاس کے دیہات کے بہت سارے لوگوں نے گنپہ کی یاترا کی۔

نمبردار: بودھی پہلے ماہ کی پندرھویں تاریخ کو ہر سال گنپہ کی یاترا کے لئے لوگ آتے ہیں اور گنپہ میں نذرانہ اور تیل چڑھاتے ہیں۔

سب انسپکٹر: یہ کب کی بات ہے۔

مہنت: دس گیارہ دن پہلے کی بات ہے۔ مورتی کی چوری چار دن پہلے ہوئی۔

سب انسپکٹر: یہ گاؤں غیر ملکیوں کے لئے ممنوعہ علاقہ میں آتا ہے۔ پھر بھی کوئی کوئی سیاح انجانے میں یا جان بوجھ کر قانون توڑ گیا ہے۔ کیا ایسی وارداتیں یہاں نہیں ہوتی ہیں؟

نمبردار: اس سال کوئی نہیں آیا۔ پچھلے سال دو غیر ملکی سیاح یہاں آئے تھے۔

انسپکٹر: کیا اس گاؤں میں غیر مقامی آدمی کام کے سلسلے میں موجود ہیں؟ جیسے آج کل یہاں لداخ میں نیپالی، پنجابی ترکھان، بہاری معمار کاریگر، مزدور وغیرہ نظر آتے ہیں۔

نمبردار: جی نہیں، ہمارے گاؤں میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔

سب انسپکٹر: آپ کی نظر میں گاؤں میں کوئی ایسا آدمی ہے، جس کا چال وچلن مشکوک ہو یا جس کے خلاف چوری کا الزام ہو یا عدالت میں مِثل ہے یا پولیس میں کسی جرم کے لئے کیس بنا ہے؟

نمبردار اور مہنت: کوئی ایسا آدمی نہیں ہے۔

سب انسپکٹر: پچھلے دو تین ماہ کے دوران گاؤں میں کوئی اجنبی آیا ہوگا؟ اور گاؤں دیکھا ہوگا؟ آپ یاد کیجئے۔

(مہنت) نمبردار اور ممبر نے چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے کو دیکھا اور مہنت بولا۔

مہنت: کوئی ایسا آدمی یاد نہیں آرہا ہے۔ گنپہ دیکھتے ہوئے کوئی اجنبی نہیں آیا۔

نمبردار: ہم نے کوئی مشکوک آدمی نہیں دیکھا۔ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کوئی بھی آئے، سب کو فوراً پتہ چل جاتا ہے۔ البتہ پچھلے ماہ دو روز کے لئے گاؤں میں ایک میڈیکل کیمپ لگا تھا۔ ایک ڈاکٹر اور دو ملازم ان کے ساتھ تھے۔ وہ سب لداخی تھے۔

سب انسپکٹر: ڈاکٹر کون تھا؟

ممبر: ڈاکٹر صنم۔

(سب انسپکٹر خاموش سامنے کھڑے اور نیچے پہاڑوں کو تاکنے لگا۔ پھر وہ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف مڑا۔ دونوں میں تھوڑی دیر کے لئے کانا پھوسی ہوئی۔)

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) تم کہاں رہتے ہو؟

مہنت: یہ اس سامنے والے چھوٹے مکان میں رہتا ہے۔

سب انسپکٹر: چلئے، وہاں تک چلتے ہیں۔

(سبھی مکان تک پہنچے۔ دروازہ مقفل تھا۔)

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) کیا تم اکیلے ہو؟

گاؤں کا ممبر (ٹشی پھلیے سے پہلے جواب دیتا ہے) اس کی بیوی اور ایک لڑکی بھی ہے۔ بیوی بیمار تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت پر لڑکی کے ہمراہ لیہہ گئی ہوئی ہے۔

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) تالا کھولو۔ ہم تمہارے گھر کی تلاشی لیتے ہیں۔

(ٹشی پھلیے دروازہ کھولتا ہے اور پولیس مکان کی تلاشی لیتی ہے۔ مکان کے ایک کمرے میں ایک ٹوکری میں سے ایک مورتی برآمد ہوتی ہے۔)

سب انسپکٹر: (ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ سے مورتی لے کر خوش سے چلاتا ہوا) مورتی مل گئی۔

(سبھی سب انسپکٹر کے گرد جمع ہوتے ہیں)

مہنت: (حیرانی سے) ارے میتریا کی یہ مورتی یہاں کہاں سے آئی۔ صاحب، ہماری مورتی اولیو کیتیشورا ہے۔ یہ پوتر مورتی میتریا ہے۔ لیکن یہ کہاں سے آئی؟

نمبردار اور ممبر: (حیرت سے) ہاں یہ کہاں سے آئی؟

ٹشی پھلیے: (ڈرتا ہوا) کل سہ پہر کو میں نے اسی ٹوکری میں بکریوں کو گھاس ڈالی تھی۔ تب یہ خالی تھی۔

سب انسپکٹر: آپ ٹھیک طرح سے دیکھ لیجئے لاما جی۔ یہ آپ کی گم شدہ مورتی ہو سکتی ہے۔

مہنت: نہیں۔ یہ نہیں ہے۔ ہماری چنڈ ازک ہے۔

نمبردار: جی ہاں، لاما جی ٹھیک بول رہے ہیں۔

سب انسپکٹر: پھر یہ مورتی کہاں سے آئی؟ (خونخوار نظروں سے ٹشی پھلیے کی طرف دیکھ کر) بتاؤ! یہ مورتی کہاں سے چوری کی؟

ٹشی پھلیے: (تھر تھر کانپتا ہوا) جناب، کل میں نے اس ٹوکری سے بکریوں کو گھاس ڈالی تھی۔ تب اس میں کوئی مورتی نہیں تھی۔

سب انسپکٹر: پھر یہ کہاں سے آئی؟ آسماں سے اڑ کر تو نہیں آئے گی! (ٹشی پھلیے کی زبان کو چپ لگ گئی)

نمبردار: ہم بھی حیران ہیں۔ آخر یہ مورتی کہاں سے آئی؟

سب انسپکٹر: یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دوسری مورتی بھی یہیں کہیں ہونی چاہئیے۔

سب انسپکٹر: (دھاڑتا ہوا) تم نے یہ مورتی کہاں سے چرائی؟ بتاؤ۔ (سب انسپکٹر نے ٹشی پھلیے کو زور سے ایک چانٹا مارا ہے اور ٹشی پھلیے اوندھے منہ گرتا ہے)۔

(سب انسپکٹر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرنے لگا۔)

ٹشی پھلیے: (ہاتھ جوڑ کر روتا ہوا) مجھے معلوم نہیں۔

سب انسپکٹر: لاما جی، آپ نے ایک چور کو یہاں کیوں رکھا ہے؟

مہنت: انسپکٹر صاحب، یہ بیس سال سے یہاں کام کر رہا ہے۔ ہمیں کبھی اس کے خلاف معمولی شکایت بھی نہیں رہی ہے۔

ممبر: یہ بڑا سیدھا سادا آدمی ہے صاحب۔ یہ کبھی چوری نہیں کرے گا۔
(نمبر دار سے بھی ٹشی پھلیے کی حالت نہیں دیکھی گئی۔ اس کی ناک اور چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔)

نمبردار: لاما جی اور ممبر صحیح کہہ رہے ہیں۔ ٹشی پھلیے شریف آدمی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل: انسان کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔ اس نے سنا ہوگا کہ مورتی کا بڑا دام ملتا ہے اور لالچ میں آ گیا۔

سب انسپکٹر: ہمیں ایک دفعہ پھر اس کے گھر اور آس پاس جگہوں کی تلاشی لینی چاہئے۔ اس نے مورتی کہیں چھپائی ہوگی (کانسٹیبلوں سے) اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مکان کے پچھواڑے، کھیت کھلیان چٹانوں وغیرہ میں تلاش کرو۔
(دو گھنٹوں کی تلاشی کے بعد مورتی کا کچھ سراغ نہیں ملا۔)

سب انسپکٹر: (مہنت اور نمبردار پر نظر ڈال کر) ہم اس کو حراست میں لیتے ہیں۔ اس کے گھر سے مورتی برآمد ہوئی ہے۔ قانون کی نظر میں یہ مجرم ہے۔ ہم اس سے مزید پوچھ تاچھ کے لئے لیہہ لے جاتے ہیں۔ (ایک کانسٹیبل نے ٹشی پھلیے کو ہتھکڑی پہنائی اور گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔)

سین ۳

لیہہ کا پولیس تھانہ۔ گنپہ تنظیم کا ایک وفد سب انسپکٹر سے ملاقی ہوتا ہے۔

تنظیم کا صدر: (سب انسپکٹر سے) آپ کو مبارک ہو۔ آپ نے کم سے کم میتریا کی مورتی بازیاب کی۔

تنظیم کا ایک ممبر: ایک سال پہلے اس مورتی کی چوری ہوئی تھی۔ ایک ہزار سال پرانی یہ مورتی تبت سے لداخ لائی گئی تھی۔

تنظیم کا صدر: اب آپ کو دوسری مسروقہ مورتیوں کی بازیابی کے لئے قدم اُٹھانا چاہیئے۔

سب انسپکٹر: ہمیں پورا یقین ہے کہ اویلوکیتیشورا کی مورتی بھی اسی آدمی نے چرائی ہے۔ یہ میتریا کی مورتی چرا سکتا ہے تو بھلا اویلوکیتیشورا کی مورتی کیوں چرا نہیں سکتا۔

ممبر: اس نے مورتی اب تک کیوں نہیں بیچی؟

سب انسپکٹر: عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، وہ انتظار کر رہا تھا کہ لوگ مورتی چوری کی دوسری وارداتوں کو بھول جائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو لیہہ لانے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ آج کل گاڑی سے مورتی لانا اور لیہہ سے باہر لے جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح پتہ چل جاتا ہے۔

تنظیم کا صدر: کیا ملزم نے اقبالِ جرم کیا؟

سب انسپکٹر: چور کہاں کہتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ دو تین روز تک جرم کا اقبال کر لے گا اور دوسری مورتی کا سراغ لگ جائے گا۔ آپ دو تین روز صبر کریں اور پھر دیکھ لیجئے۔

تنظیم کا ایک اور ممبر: آپ میتریا کی مورتی کب گنپہ کے حوالہ کر رہے ہیں؟

سب انسپکٹر: جب تحقیقات مکمل ہو جائیں گی تو ہم فوراً حوالہ کر دیں گے۔

تنظیم کا صدر: آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی کوشش بیکار نہیں گئی ہے۔ براہِ کرم دوسری مسروقہ مورتیوں کی بازیابی کے لئے موثر اقدام اٹھائیں۔

(وفد کے صدر اور ممبران سب انسپکٹر سے ہاتھ ملا کر جاتے ہیں)۔

سین......۴

(ڈاکٹر صنم کا گھر۔ڈاکٹر اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔)

ینگچن: (ڈاکٹر نے دہلیز پر قدم رکھا ہوتا ہے)؟صنم!تم نے سنا؟ پدماں کا باپ مورتی چوری کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے لیہہ لایا گیا ہے اور حوالات میں بند ہے۔

صنم: (حیرت سے) کب؟ کہاں اور کیسے؟

ینگچن: مورتی اس گنپہ سے چرائی ہوگی، جہاں وہ کام کرتا ہے۔

ماں: (حالت درست کرتی ہوئی) نہیں۔وہ کسی اور گنپہ کی مورتی تھی جو اس کے گھر سے نکلی۔

صنم: ماں، وہ چوری نہیں کرے گا۔میرا دل نہیں مانتا ہے۔

ماں: سبھی کہتے ہیں۔اسی نے چوری کی ہے۔

صنم: پدماں کہاں ہے؟

ینگچن: کل سے وہ یہاں نہیں آئی۔

ماں: صنم کیا تم مورتی چور باپ کی بیٹی سے شادی کرو گے؟

صنم: میں باپ بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔وہ کبھی چوری نہیں کرے گا ماں۔

ینگچن: پکا ثبوت ملے تو......؟

صنم: اگر وہ بے گناہ بری ہو جاتا ہے تو کیا تم ہماری شادی پر اعتراض کرو گی؟ (چند لمحوں کے بعد) میں پدماں کو بہت چاہتا ہوں۔میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔

(ایک ہفتہ گزر گیا اور تحقیقات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ملزم ٹشی پھلیے پر ہر حربہ استعمال کیا گیا۔مارا پیٹا گیا، لالچ اور ترغیب دی گئی لیکن وہ آخری دم تک اپنے بیان پر ڈٹا رہا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کے گھر سے برآمد شدہ مورتی اس نے نہیں چھپائی ہے۔اس کا کہنا تھا کہ جس ٹوکری میں مورتی پائی گئی وہ اس نے گھاس لانے کے لئے استعمال کی تھی۔

ادھر گم شدہ مورتی نہ ملنے پر علاقے کے لوگوں میں غم و غصہ تھا۔ گنپہ تنظیم کا ایک وفد سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملتا ہے اور مورتی نہ ملنے پر تشویش کا اظہار کرتا ہے۔

سین ۵

(سپرنٹنڈنٹ پولیس کا دفتر۔ گنپہ تنظیم کا وفد چیمبر میں موجو ہے اور مورتی کے بارے میں گفتگو کرنے میں محو ہیں۔)

گنپہ تنظیم کا صدر: ایس۔ پی صاحب مسروقہ مورتی کی بازیابی میں کچھ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ یہاں لوگوں میں بڑی تشویش پائی جاتی ہے۔

وفد کے ارکان: لوگ ہمارے پاس شکایتیں لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انتظامیہ اور محکمہ پولیس کو متحرک کریں۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس: میں اسے باخبر ہوں۔ میں نے انسپکٹر نعمان کی چھٹی منسوخ کی ہے اور انہوں نے مورتی چوری کا یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں اس نے ماضی میں ایسی کئی وارداتوں کا سراغ لگایا ہے۔

گنپہ تنظیم کا صدر: آپ نے بہت اچھا کیا۔ ایک قابل افسر ہی معاملہ کی تہہ تک جاسکتا ہے۔

وفد کا ایک ممبر: ہم نے سنا کہ ایک دور افتادہ گنپہ میں ایک اور قدیم تھن کا غائب ہوا ہے۔ ہماری تنظیم اس کی تصدیق کرا رہی ہے۔

وفد کا دوسرا ممبر: اگر یہ بات صحیح ہو تو بڑی تشویش ناک ہے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس: ہم مجوزہ مسروقہ مورتی کے لئے بڑی مستعدی سے تحقیق کر رہے ہیں۔ (اس مرحلے پر وہ آفس کی گھنٹی بجاتا ہے اور چپراسی نمودار ہوتا ہے۔) نعمان صاحب کو بلاؤ۔

(انسپکٹر نعمان نمودار ہوتا ہے اور سر کی جنبش سے سب کو خوش آمدید کہتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ پولیس: نعمان صاحب، یہ صاحبان حالیہ مسروقہ مورتی کے کیس کے بارے میں دریافت کرنے آئے ہیں۔

انسپکٹر نعمان: میں نے از سر نو کیس کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہماری تحقیق میں کئی خامیاں رہ گئی ہیں اور معاملے کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

گنپہ تنظیم کا صدر: ہمیں آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ نے پہلے بھی ایسے کئی پیچیدہ معاملات کی کامیابی سے تحقیق کی ہے۔

انسپکٹر نعمان: میں اس کیس کی نئے زاویئے سے جانچ کر رہا ہوں۔ اُمید ہے، ہم کسی مثبت نتیجے پر پہنچیں گے۔

وفد کے ارکان: شکریہ! بہت شکریہ!

سین......٦

(انسپکٹر نعمان ڈاکٹر صنم کو اپنے آفس بلاتا ہے اور تبادلۂ خیال کرتا ہے۔)

انسپکٹر نعمان: ڈاکٹر، آپ کو میں نے اس لئے زحمت دی ہے کہ مورتی چوری کے کیس سے متعلق تبادلۂ خیال کروں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے گاؤں میں ایک میڈیکل کیمپ منعقد کیا تھا اور آپ نے گنپہ میں وہ مورتی دیکھی تھی۔

صنم: جی ہاں انسپکٹر، میں نے گنپہ میں وہ مورتی دیکھی تھی جس کی چوری ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ٹشی پھلیے کو کہا تھا کہ پرانی مورتیوں کی اکثر چوری ہوتی ہے۔ اس لئے خبردار اور ہوشیار رہے۔ اس کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ باپ بیٹی دونوں مجھے بولے۔ کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو گنپوں کی مورتی چراتے ہیں؟ میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ بات بڑی معصومیت سے کہہ رہے ہیں۔ دراصل ان کا لوگوں سے بہت کم رابطہ ہے۔ یہ شاذ و نادر ہی یہاں آتے ہیں۔ یہاں اور باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کو بالکل پتہ نہیں ہے۔

انسپکٹر نعمان: لیکن مورتی کی چوری کون کر سکتا ہے؟

صنم: نعمان صاحب، آپ ایک تجربہ کار پولیس آفیسر اور منجھے ہوئے سراغ رسان ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ کون مورتیوں کی چوری کرتے ہیں۔

انسپکٹر نعمان: انسپکٹر نعمان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکان اُبھر آتی ہے۔ڈاکٹر، ملزم کی لڑکی بڑی خوبصورت ہے۔آپ نے اپنے پیشے میں سائیکالوجی پڑھی ہے۔خوبصورتی کئی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔چوری کی اس واردات کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہونی چاہئیے۔

(انسپکٹر معنی خیز انداز میں مسکراتا ہے)۔

صنم: انسپکٹر صاحب، کیا اس واقعہ کے پیچھے بھی لڑکی کی خوبصورتی کا کوئی رول ہے؟

انسپکٹر نعمان: بالکل۔لیکن معاملہ زیر تحقیق ہے۔اس لئے اس بات کو آپ فی الحال اپنے تک محدود رکھیں۔ڈاکٹر، کیا آپ لڑکی کے حسن سے متاثر ہیں؟

صنم: میں متاثر ہی نہیں بلکہ لڑکی سے محبت کرتا ہوں انسپکٹر صاحب۔

سین......۷

(ایک ماہ سے زیادہ عرصے ہوا۔لوگ چوری کی واردات کو تقریباً بھول چکے تھے۔ایک روز اچانک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے قصبے کے چند سرکردہ افراد، گنپہ تنظیم کے عہدہ داروں، اخبار کے نامہ نگاروں، ریڈیو اور ٹی وی سٹیشنوں کے نمائندوں کو اپنے دفتر میں بلایا۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس: (حاضرین کا سواگت کرتے ہوئے) خوش آمدید! ہم نے آپ کو یہاں مسروقہ مورتی کی بازیابی کی خوشخبری دینے کے لئے زحمت دی ہے۔مجرم گوئل اور اس کے ساتھی انگت کو حراست میں لیا گیا ہے۔انہوں نے کچھ سنسنی خیز باتوں کا انکشاف بھی کیا ہے جن سے آگے چل کر ہمیں گروہ کے دوسرے مجرموں کو پکڑنے میں مدد ملے گی۔(ایس پی نے نعمان کی طرف توصیفی نظروں سے دیکھ کر کہا)۔مورتی کی بازیابی اور مجرموں کی گرفتاری میں انسپکٹر نعمان کا بڑا ہاتھ ہے۔انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کیا ہے۔

ایک اخباری نامہ نگار: انسپکٹر، آپ نے یہ گتھی کیسے سلجھائی؟

انسپکٹر نعمان: ہمارے سامنے پہلا بڑا سوال یہ تھا کہ آخر ملزم ٹشی پھلیلے کو مورتی کی چوری کی واردات کے بعد ایک پرانی مورتی کو اپنے گھر میں رکھنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ جس کا وہ بذاتِ خود انکار کرتا ہے۔ دوسرا بڑا سوالیہ نشان یہ تھا کہ اس کے گھر سے ملی مورتی اصلی بھی ہے یا نہیں۔ پہلے سوال سے ہمیں اس مفروضے پر سوچنے کی تحریک ملی کہ اگر ملزم نے مورتی اپنے گھر میں چھپا نہیں رکھی تھی تو اس کو چھپانے والا کوئی اجنبی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا کوئی واقف کار ہونا چاہیئے۔

اخباری نامہ نگار: اور دوسرے سوال کا کیا جواب ملا؟

انسپکٹر نعمان: جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے، میری پہلی نظر اور سوچ کہتی تھی کہ یہ اصلی مورتی ہو نہیں سکتی۔ کوئی بھی جانکار آدمی سرسری نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اصلی مورتی نہیں ہے۔ اصلی اور پرانی مورتی کی پشت پر مہر لگتی ہوتی ہے۔ یہ خالص پیتل یا کانسے کی بنی ہوئی ہے۔ مورتی کے اندر کئی قیمتی چیزیں، مقدس منتر اور دعائیں لکھے ہوئے نسخے محفوظ کیئے گئے ہوتے ہیں۔ نئی مورتی سانچے میں ڈھالی جاتی ہے جبکہ پرانی اور اصلی مورتی انسان ہاتھ کی بنائی ہوتی ہے۔ نئی مورتی کئی باتوں میں اس معیار پر نہیں اترتی تھی۔

ریڈیو کا نمائندہ: پھر؟

انسپکٹر نعمان: مورتی کو پرانا بنانے اور زنگ آلودہ دکھانے کے لئے ایسڈ کا استعمال ہوتا ہے یا جلتی ہوئی موم بتی انڈیل کر آگ پر تپائی جاتی ہے۔ یہ کام بھی اس مورتی پر کیا گیا تھا لیکن بڑے بھدے اور بے ڈھنگے طریقے سے۔ ناتجربہ کار ہاتھوں کی یہ کوشش صاف دکھائی دیتی تھی۔ ہم نے ایک ساہوکار سے رائے بھی پوچھی تو اس نے میری بات کی تصدیق کی اور مزید تصدیق کے لئے ہم نے اس کا کیمیائی تجزیہ کرایا اور ہمارا مفروضہ درست ثابت ہوا۔ بے شک نتیجہ آنے میں کچھ وقت لگا اور آپ بیتابی سے انتظار کرنے لگے۔ تاہم دیر آید درست آید،

ہماری کوشش کامیاب رہی۔

اخباری نامہ نگار: اور نقلی مورتی......

انسپکٹر نعمان: (بات کاٹ کر) یہی نقلی مورتی ہے۔ (انسپکٹر نے میز پر رکھی نقلی مورتی کو ہاتھ میں اُٹھا کر سب کی طرف دیکھتے ہوئے گھمایا)۔ گم شدہ مورتی ایک ہزار سال پرانی تھی اور گندھار آرٹ کا نمونہ تھی۔

ٹی وی کا نمائندہ: اصلی مورتی کہاں گئی؟

انسپکٹر نعمان: سنیئے تو۔ اب سوال پیدا ہوا کہ آخر یہ نقلی مورتی اس غریب آدمی کے گھر میں کیوں چھپائی گئی۔ یا تو چور اپنے جرم سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا یا ملزم سے مجرم کی دشمنی تھی۔ وہ اس کو بدنام کرنا چاہتا تھا اور کسی جرم میں ماخوذ کر کے اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ پہلی دلیل کے مقابلے میں ہمیں دوسری دلیل زیادہ وزن دار لگی۔ چنانچہ ہمارے ساتھ دو مسئلے پیدا ہوئے۔ دو سوال ابھرے۔ پہلا یہ کہ اس علاقے میں ڈیڑھ سال کے دوران کون اچانک دولت مند بن گیا ہے اور دوسرا ٹشی پھلیے اور اس کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ (ایک لمحہ کے توقف کے بعد) تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ مجرم نے گاؤں میں ایک سال کے دوران ایک نیا بڑا مکان تعمیر کیا ہے۔ دس کنال زمین خریدی۔ ایک دکان کھولی، جس پر اس کا لڑکا رہتا ہے۔ لیہہ میں آٹھ لاکھ روپے میں ایک کنال زمین خریدی اور خود چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لینے شروع کئے۔ گاؤں والے حیران تھے کہ یہ سب کچھ کرنے کے لئے اس کو کہاں سے خزانہ ہاتھ لگا۔ ہم نے ٹشی پھلیے سے باز پُرس کی۔ ہسپتال کے بیڈ پر اس کی بیوی سے رابطہ قائم کیا اور اس کی لڑکی کا بیان لیا کہ مجرم سے ان کے کیا تعلقات تھے؟ دشمنی تو نہیں تھی؟ کیا وہ بھی گنپہ میں آیا تھا؟ تب کئی دلچسپ تفصیلات منظر عام پر آئیں۔ وہ ایک پتھر سے دو پرندے مارنا چاہتا تھا۔ مورتی کی چوری بھی کرنا چاہتا تھا۔ عمر میں وہ تقریباً لڑکی کے باپ کے برابر ہے۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کو پہلے ہی طلاق دی ہے۔ ماں باپ اور لڑکی

تینوں اس شادی کے خلاف ہیں جبکہ وہ شادی کرنے پر مصر ہے۔ اس دوران اس نے یہ بھی سنا کہ ایک نوجوان متمول ڈاکٹر لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس لئے وہ جلد از جلد معاملہ نپٹانا چاہتا تھا۔

گنپہ تنظیم کا صدر: یہ سارا واقعہ فلمی جاسوسی کہانی کی طرح لگ رہا ہے۔

انسپکٹر نعمان: جی ہاں بالکل لگ رہا ہے۔ حالیہ مورتی کی چوری سے کچھ روز پہلے وہ گنپہ میں تیل کا نذرانہ چڑھانے آیا۔ یہ محض نمائشی عقیدت کا اظہار تھا۔ ٹشی پھلیے نے اس کے لئے کئی مرتبہ گنپے کا دروازہ کھولا۔ ایک روز اس نے ٹشی پھلیے کو ایک چٹان کے نیچے گنپے کی چابی چھپاتے ہوئے دیکھا۔

ایک اخبار نامہ نگار: کیا ٹشی پھلیے نے اس کے سامنے چابی چھپائی۔

انسپکٹر نعمان: ٹشی پھلیے نے اس کو نہیں دیکھا۔ وہ ہر لمحہ ٹشی پھلیے کی ٹوہ میں لگا تھا۔ چابی کے چھلے پر اس کے مکان کے دروازے کے تالے کی چابی بھی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں مہنت چٹان کی کھوہ سے چابی نکال کر گنپہ کی ڈیوڑھی کھولتا تھا۔ صرف ٹشی پھلیے اور مہنت اسے واقف تھے کہ وہ کہاں چابی چھپا کر رکھتے ہیں۔ اس کے تین روز بعد مورتی غائب ہوئی۔ دروازے پر تالا لگا تھا لیکن مورتی نہیں تھی۔

چابیاں حاصل کرنے کے بعد مجرم نے دوسرے مجرم انگت کے ذریعے گنپہ اور ٹشی پھلیے کے گھر کی چابیوں کی ایک ڈپلیکیٹ بھی تیار کی تھی اور پولیس کے پہنچنے سے صرف دو گھنٹہ پہلے ٹشی پھلیے کے مکان میں کسی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نقلی مورتی ٹوکری میں چھپالی اور مکان پر تالا لگایا۔

ریڈیو کا نمائندہ: چابیاں اس نے اتنی جلدی کیسے بنائیں؟

انسپکٹر نعمان: موم پر اس نے دونوں چابیوں کا قالب اتارا۔ یہ ترتیب اس کو انگت نے بتائی تھی۔ اسے لیہہ لایا جہاں اتفاق سے اُن دنوں نیچے سے چابیاں بیچنے اور بنانے والا ایک آدمی آیا تھا۔ وہ کئی سال سے یہاں آرہا ہے اور مسجد کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہے۔ ہم نے اس سے رابطہ قائم کیا اور اس سے بھی ہمیں

چوری کا سراغ لگانے میں مدد ملی۔

گنبہ تنظیم کا صدر: مجرم کو آپ نے کیسے پکڑا؟

انسپکٹر نعمان: جب ہم مجرم کو پکڑنے اس کے گھر گئے تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ گاؤں سے اچانک غائب ہوا تھا۔ ہم گاڑی میں لیہہ واپس آرہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی ہمیں دیکھ کر چٹانوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ جب اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھا تو ایک چٹان کی اوٹ لیتا ہوا تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ ڈھائی گھنٹے کے مسلسل تعاقب کے بعد ہمارے دو جوانوں نے اس کو گرفتار کیا۔ یہ وہی آدمی تھا؟ جو ہمیں مطلوب تھا۔ گرفتاری سے پہلے اس نے دو دفعہ اونچائی سے ہمارے اوپر بڑے بڑے پتھر لڑھکائے۔ لیکن ہم نے جب ہوائی فائر کئے تو اس نے ہار مان لی۔ (انسپکٹر نے سامنے لگے سکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔) آپ اس ڈرامائی منظر کو سکرین پر دیکھ لیجئے۔ ہمارا مووی کیمرہ تب بڑا کام آیا۔

(سبھی بڑے اشتیاق سے فلم دیکھنے لگے۔)

ایک اخباری نامہ نگار: اس پر ایک خوبصورت جاسوسی فلم بن سکتی ہے۔

انسپکٹر نعمان: اب کیا تھا۔ دو گھنٹے بعد مجرم نے اقبالِ جرم کیا اور صاف صاف بتایا کہ اس نے کیسے دو مورتیاں چرائیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم میتریا کی نادر مورتی نہیں بچا سکے۔ وہ اس کو پہلے ہی فروخت کر چکا تھا۔

ٹی وی کا نمائندہ: کس کو فروخت کی۔

انسپکٹر نعمان: اُس نے اور انگت نے اصلی مورتی ایک بڑے ڈبے میں اچار کے نیچے ڈال کر ہوائی جہاز میں لیہہ سے چندی گڑھ لی، جہاں سے اس کی ڈپلیکیٹ بنانے دونوں علی گڑھ گئے اور علی گڑھ سے بمبئی روانہ ہوئے جہاں مورتی اور دو تھنکوں کے لئے چالیس لاکھ روپے ملے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ملک سے باہر اس کا دام کم سے کم ایک کروڑ روپیہ ہوگا۔

(اویلو کیتیشورا کی مسروقہ مورتی دکھاتا ہوا) نئ چرائی گئی مورتی ہے۔ یہ چھ سو سال پرانی ہے۔اس پر تبت، پالا اور گندھارا تینوں آرٹ کا اثر ہے۔گیا لپوٹق بوم دے کے زمانے میں تبت سے لداخ لائی گئی ہے۔

گنپہ تنظیم کا صدر: اس کے علاوہ اس نے اور بھی چوریاں کی ہوں گی!

انسپکٹر نعمان: جی ہاں، اس نے اس کے علاوہ ایک گنپہ سے ایک مورتی اور دوسرے گنپہ سے تین پرانے تھنکے چرانے کا اقبال کیا۔

اخباری نامہ نگار: بمبئ میں مورتی کس نے خریدی؟

انسپکٹر نعمان: یہ ایک اہم سوال ہے۔معاملہ کی تحقیقات جاری ہیں، جو اس وقت ہم ظاہر نہیں کر سکتے۔تاہم میں اتنا کہوں گا کہ مورتی چوری اور سمگلنگ کرنے میں باقاعدہ ایک منظّم گروہ کا ہاتھ ہے۔آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس گروہ میں سماج کے کئی معزز آدمی بھی شامل ہیں جو تحقیقات کرنے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔

ریڈیو کا نمائندہ: آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے میتریا کی مورتی کہاں بنوائی اور کیوں ٹشی پھلیے کے مکان میں چھپائی؟

انسپکٹر نعمان: یہ مورتی بھی علی گڑھ میں بنوائی، جو اصلی مورتی کی کاربن کاپی تھی۔یہ اس نے ایک سال تک پہاڑ پر ایک چٹان کے نیچے چھپا رکھی تھی۔اس کا مقصد یہ تھا کہ لڑکی کے باپ کو مورتی چوری کے الزام میں گرفتار کیا جائے۔جب باپ راستے سے ہٹ جائے گا تو لڑکی کو پانا اور اس سے شادی کرنا آسان ہوگا۔ ماں ہمیشہ بیمار رہتی تھی اور اس کے خیال میں یہ اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

گنپہ وفد کا ایک رکن: آخر چند لوگوں کو یہ ناجائز اور ذلیل کام کرنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

انسپکٹر نعمان: وہی لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں جو ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں

رہتے ہیں کہ کب اس کو سونا بنائیں۔ یہ لوگ راتوں رات کروڑ پتی بننا چاہتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس: کوئی مذہب نہیں کہتا کہ دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے عقیدے اور جذبات کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ جو کوئی مورتی چرا کر بیچتا ہے، اس کا کوئی ضمیر اور مذہب نہیں ہوتا۔

............☆☆☆............

شیرازہ "ہم عصر افسانہ نمبر"
اس خصوصی اشاعت میں ریاست کے
ہم عصر اُردو افسانہ نگارون کے افسانے شامل ہیں، ساتھ ہی
ریاست اُردو افسانے کے سفر کے حوالے سے
کئی اہم مضامین بھی قلم بند ہیں
اس پتے پر منگوائیں
☆...... کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

......●......

سنجے: (خود کلامی) ہے بھگوان۔ یہ بارش ہے یا قہر۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ پولیس یہاں کیسے کام کر پا رہی ہے۔

(جیپ کی ہارن کی آواز)

سنجے: لگتا ہے پولیس کی جیپ ہے...... ہاں، ہاں پولیس کی ہی جیپ ہے۔

(جیپ کے رُک جانے کی آواز کے ساتھ ہی ایس۔ ایس۔ پی کی آواز)

ایس ایس پی: ارے آپ؟

سنجے: نمسکار ایس ایس پی صاحب۔

ایس ایس پی: واہ کیا بات ہے؟ آپ کے حوصلے کی داد دینی چاہئیے۔

سنجے: وہ کیوں؟

ایس ایس پی: بیٹھئے تو سہی، بتاتے ہیں۔

سنجے: شکریہ۔

ایس ایس پی: اس بارش میں آپ Rain Coat یا چھاتا لئے بغیر چل رہے ہیں، یہ یقیناً آپ کے نیک ارادوں کی ترجمانی ہے۔

سنجے: (قہقہہ) چھاتا تھا۔ (قہقہہ) مگر ہَوا سے اُڑ گیا اور میں کالے چھاتے کی بجائے کالے بادل دیکھتا رہ گیا (قہقہہ)۔

ایس ایس پی: (قہقہہ) ایک تو ہر طرف پانی اور پھر قدم قدم پر پھسلن ہی پھسلن۔ آپ نے یہ دُشوار سفر کیسے Manage کر لیا؟

سنجے: کرنا ہی پڑتا ہے جناب۔ ہم اخبار والوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ایس ایس پی: You are great Mr. Sanjay

سنجے: شکر ہے بھگوان کا۔ کوئی تو اخبار والوں کو Great سمجھتا ہے۔

ایس ایس پی: میں نے اس بات سے کبھی انکار نہیں کیا۔

سنجے: (قہقہہ) دراصل جو خود Sincere ہو اس کو سب Sincere نظر آتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اخبار والے صرف اسکینڈلوں کی ہی کھوج میں رہتے ہیں۔

ایس ایس پی: لوگ نہیں، کچھ لوگ۔ صحافی ہو یا سپاہی، صحیح آدمی صحیح کام کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صحافت ایک آئینہ ہے جس میں ہمارا معاشرہ اپنا عکس دیکھتا ہے۔ (قہقہہ) مگر آئینہ صاف ہونا چاہیئے (قہقہہ)۔

سنجے: صحیح Reporting کے لئے ہی تو میں یہاں آیا ہوں ایس ایس پی صاحب۔

(جیپ رُکنے کی آواز)

سنجے: کیا ہوا؟

ایس ایس پی: جیپ یہاں تک ہی جائے گی، آگے نہیں

سنجے: (ہنسی) اور یوں آپ نے پھر مجھے یاد دلا دیا۔

ایس ایس پی: کیا؟

سنجے: میرا چھاتا۔

ایس ایس پی: (قہقہہ) گھبرایئے نہیں، ہم آپ کو Rain Coat دیں گے۔

سنجے: شکریہ۔

ایس ایس پی: تو پھر چلیں۔

سنجے: جی ہاں، دیر کس بات کی؟

ایس ایس پی: (ہنسی) تقریباً تین کلومیٹر چلنا ہوگا۔

سنجے: تیس کلومیٹر کا فاصلہ بھی ہوتا تب بھی میں چل پڑتا۔

ایس ایس پی: اتنا جوش، اتنا ولولہ، ایسی لگن۔

سنجے: صرف ایک Curiousity، ایک تجسس۔

ایس ایس پی: تجسس؟

سنجے: جی ہاں، سیلاب، فسادات یا طرح طرح کے حادثات کے بعد ہم نے فوجیوں کو کام کرتے ہوئے سنا ہے بلکہ دیکھا بھی ہے۔ قیدی Relief کا کام کر رہے ہیں، یہ پہلی بار سنا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔

ایس ایس پی: (قہقہہ) گویا اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں آپ!

سنجے: شک ہے، اس لئے نہیں۔ بھروسہ ہے اس لئے۔ (قہقہہ) It is a story and you are the hero

ایس ایس پی: نہیں نہیں۔ ہم Hero نہیں ہیں بلکہ ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم نے قیدیوں کو لاشیں نکالنے پر لگا کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ After all a criminal, is a criminal

سنجے: پھر یہ خیال کیسے آیا؟

ایس ایس پی یہ خیال نہ میرا ہے اور نہ جیلر صاحب کا۔

سنجے: پھر؟

ایس ایس پی: سینٹرل جیل میں ایک قیدی ہے، نام کچھ اور ہے لیکن پچھلے سات سال سے سب اس کو سوامی کے نام سے جانتے ہیں۔

سنجے: سوامی؟

ایس ایس پی: ہاں، عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔

سنجے: یعنی قاتل ہے۔

ایس ایس پی: ہاں، انشورنس کی رقم حاصل کرنے کی خاطر اپنی بیوی کا قتل کر چکا ہے۔

سنجے: Very Interesting

ایس ایس پی: سنا ہے پچھتاوے کی آگ میں جل کر کندن بن گیا ہے۔

سنجے: گویا اس دور کا انگلی مال۔

ایس ایس پی: انگلی مال؟

سنجے: ہاں انگلی مال۔ وہ ایک وحشی درندہ تھا۔ قتل کر کے مقتول کی انگلیاں کاٹ کر ایک مالا بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں یہی راکھشس ایک بھکشو بن گیا تھا۔

ایس ایس پی: ہاں کچھ ایسا ہی سوامی کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اُس نے قیدیوں کو آمادہ کر کے یہاں لانے کی تجویز رکھی تو ہمارے جیلر صاحب کچھ زیادہ ہی Enthusiastic بن گئے۔

سنجے: گویا لاشیں نکالنے کا کام وہ کر رہے ہیں۔

ایس ایس پی: ہاں، بہت ہی کٹھن کام ہے۔ پہلے لاش کو تلاش کرو پھر سڑی لاش کو پانی یا کیچڑ سے باہر نکالو۔ چاروں طرف بد بو ہی بد بو۔

سنجے: اور چاروں طرف پانی ہی پانی۔ یہ علاقہ ہرا بھرا ہوا کرتا تھا۔ دُور دُور تک پھیلے کھیت، آس پاس چھوٹے چھوٹے مگر خوبصورت گھر۔ اُف، سیلاب نے سب کچھ اُجاڑ دیا۔

ایس ایس پی: صرف ایک مکان بچ گیا ہے۔ پکا تھا اس لئے۔ یہاں سے نظر نہیں آتا۔ مگر سنا ہے کسی بھیشم سنگھ کا مکان ہے۔

سنجے: یہ وہ ٹھاکر بھیشم سنگھ تو نہیں جس کو اس کے پوتے نے قتل کر دیا تھا؟

ایس ایس پی: I Dont know۔ دوسری ریاستوں سے آئے ہوئے آئی پی ایس افسروں کو Flash Back دکھانا پڑتا ہے۔ ان کو معلوم نہیں ہوتا۔ ہے نا؟ (قہقہہ)۔

سنجے: ہمیں سوامی سے ملا دیجئے۔ ہم آپ کو مکمل کہانی سنا دیں گے۔

ایس ایس پی: (قہقہہ)

سنجے: یہاں ایک پل تھا۔

ایس ایس پی: ہاں، بہہ چکا ہے۔ اسی لئے تو سارا علاقہ Cut Off ہو چکا ہے۔ Air Lifting ممکن نہیں تھی۔ اسی لئے بہت لوگ مر گئے۔ What a tragedy۔

سین......۲

(دور سے بھجن کی آواز)

سنجے: یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟

سپاہی۔۱: سوامی بھجن کر رہا ہے۔ بارش کی وجہ سے کام رُک گیا ہے نا۔ اس لئے۔

ایس ایس پی: کام ٹھیک چلا رہا ہے۔

سپاہی۔۱: جی ہاں۔ صاحب جی لگتا ہے تین چار سو سے اوپر لوگ مر گئے ہیں۔

سنجے: تین چار سو؟ بھئی یہاں اتنی آبادی تھی کیا؟

سپاہی۔۱: دس گاؤں ڈوب گئے ہیں صاحب جی! ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ سیلاب آتے تھے، راستے کٹ جاتے تھے۔ لیکن دھوپ نکلتے ہی سب جڑ جاتے تھے۔ اس بار قہر ٹوٹ پڑا ہے۔

(بھجن کی آواز صاف صاف سنائی دینے لگی)

ایس ایس پی: مسٹر سنجے، آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

سنجے: (چسکی لے کر) تیز ہوائیں آپ کے Tent کو بھی خوف زدہ کر رہی ہیں (ہنسی)۔

ایس ایس پی: اور ہم پھر بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔

سنجے: واقعی قابلِ تعریف کام ہو رہا ہے۔

ایس ایس پی: لو، جیلر صاحب بھی آ گئے۔

جیلر: Hello Sir

ایس ایس پی: شرما صاحب مسٹر سنجے خاص طور پر آپ کی کارکردگی کا جائزہ لینے آئے ہیں۔

جیلر: Welcome, Welcome

سنجے: Thank You

ایس ایس پی: سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا؟

جیلر: جی ہاں۔ ویسے ہی ہو رہا ہے جیسے میں نے سوچا تھا۔

ایس ایس پی: کوئی Problem؟

جیلر: No Problem اور سوامی کے ہوتے ہوئے کوئی Problem ہو بھی نہیں سکتی۔

سنجے: اچھا؟ سوامی کیا جادوگر ہے؟

جیلر: جادوگر تو نہیں ہے مگر اس شخص کی دو باتیں سن کر بات بات پر لڑنے جھگڑنے والے قیدی یوں خاموش ہو جاتے ہیں گویا سپیرے نے سانپوں کو پٹارے میں ڈال دیا ہو۔

سنجے: میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔

جیلر: آیئے۔

ایس ایس پی: بارش تھم جائے تو جایئے۔

جیلر: (ہنسی) تب سوامی کہاں نظر آئے گا۔

سنجے: مطلب؟

جیلر: یہ شخص فقط کام کرنا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ اوروں سے بھی کام کرواتا ہے۔ پل دو پل کے لئے بھی آرام نہیں کرتا۔ میں حیران ہوں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ایس ایس پی: اس شخص کی کیفیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے سر سے گناہوں کا بوجھ اُتارنا چاہتا ہے۔
مسٹر سنجے آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

سنجے: سوچ رہا ہوں کہ عمر قید کاٹنے والے قیدی بغیر پہرہ کام کیسے کر رہے ہوں گے۔ وہ بھاگ بھی تو سکتے ہیں اور بھاگنا بھی آسان۔ دریا پار کرو تو دوسرا ملک۔

ایس ایس پی: Yes, that was my apprehension لیکن لگتا ہے میرے خدشات غلط تھے۔ By the way جیلر صاحب اس کا کیا حال ہے؟

جیلر: کس کا؟

ایس ایس پی: دھیرو یا دُریودھن کچھ ایسا ہی نام بتایا تھا۔

جیلر: دھیرو۔

سنجے: دھیرو کون؟

جیلر: ہے ایک انسان کے لبادے میں حیوان۔ یہاں آنے سے پہلے ایس ایس پی سے اُلجھ پڑا تھا۔

Flash Back

سین ۳

دھیرو: (چلا کر) دھیرو۔ دھیرو ہے میرا نام۔

سوامی: دھیرو۔ بچے آہستہ بولو۔ یہ بڑے مہربان افسر ہیں، ایس ایس پی صاحب ہیں۔

دھیرو: چور ہے۔ یہ سب افسر چور ہیں۔ کام نہیں کرتے، اس لئے سیلاب آیا۔ میں سب کا خون پی جاؤں گا۔

جیلر: دھیرو۔

دھیرو: چلاؤ مت جیلر۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد میں سب سے پہلے تمہارا قتل کروں گا۔

جیلر: Shut up۔

دھیرو: اوئے ایس پی، کائے انگریزی بولتا ہے۔زبان کو لگام دے ورنہ کھینچ لوں گا۔

سوامی: دھیرو۔ دھیرو۔ یہ کیا کر رہا ہے۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔تھوڑی دیر پہلے ٹھیک ٹھاک تھا۔چل معافی مانگ صاحب سے۔

دھیرو: معافی؟اوران سے۔ارے میں ان کو ویسے ہی نہ کاٹ ڈالوں جیسے میں نے دادا کو کاٹ ڈالا تھا۔چاچا کو کاٹ ڈالا تھا۔چاچی کو کاٹ ڈالا تھا اور ارجن کو کاٹ ڈالا تھا۔بچ گیا تو کیا اب کاٹ دوں گا ہاں،ہاں۔

جیلر: لے جاؤ اس حیوان کو۔سوامی یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔تم سمجھتے ہو کہ سب قیدی تمہاری طرح سادھوسنت بن گئے ہیں۔یہ جانور ہے۔وحشی، خوانخوار درندہ۔

ایس ایس پی: جیلر صاحب آپ اپنا پلان Drop کر دیجئے۔ You are working on theories and not on practical aspect۔ آپ رہنے دیں، میں سپاہیوں کو Depute کروں گا۔ And that is a genuine step۔

سوامی: نہیں،نہیں۔ایسا مت کہیں۔یہ لڑکا کبھی کبھی بہک جاتا ہے۔ناسمجھ ہے۔میں سمجھا دوں گا۔سمجھ جائے گا۔ہمیں یہ نیک کام کرنے دیں۔یہ ہمارے لئے ایک تیرتھ یاترا ہوگی۔(روتا ہے) صاحب جی جو مر گئے سب ہمارے اپنے تھے۔ہمیں اُن کا انتم سنسکار کرنے دیں۔

Flash Back Ends

جیلر: میں شرمندہ تھا،پریشان تھا۔مگر جانے سوامی نے دھیرو کے کان میں کیا کہا۔وہ تھوڑی دیر بعد روتا بلکتا ہمارے پاس آیا۔گڑگڑایا اور معافی مانگ کر ہمارے ساتھ آگیا۔(ہنسی) اوراب چپ چاپ کام کر رہا ہے۔

سنجے: گویا دھیرو نے چار قتل کئے ہیں۔

جیلر: تین قتل۔ چوتھا بچ گیا تھا۔ کم عمر ہے اس لئے عمر قید مل گئی ورنہ یقیناً پھانسی کی سزا ہوئی ہوتی۔

سنجے: کہیں دھیرو دھیرو ٹھاکر بھیشم سنگھ کا پوتا تو نہیں؟

جیلر: Yes, same person چلئے، چلتے ہیں۔

سین ۴

(بھجن کی آواز نمایاں طور پر سنائی دے گی اور گفتگو شروع ہوتے ہی یہ آواز بند ہوگی)

جیلر: سوامی۔

سوامی: حکم صاحب جی۔

جیلر: یہ سنجے صاحب ہیں، صحافی ہیں۔ اخباروں میں خبریں دیتے ہیں۔ آپ سے ملنے آئے ہیں۔

سوامی: ہمارے دھنے بھاگ۔

سنجے: ارے، یہ کیا کر رہے ہو؟

سوامی: آپ کے پاؤں چھولوں تو آنند ملے گا۔

سنجے: آپ بزرگ ہیں۔ رہنے دیں۔

سوامی: سفید بالوں سے کوئی بزرگ نہیں بن جاتا۔ آپ گیانی ہیں اور میں مورکھ پرانی۔

سنجے: ایسا کچھ نہیں ہے، سوامی جی۔

سوامی: آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جیلر صاحب نے یہ کیا کِیا ہے۔ سانپ کو بازار میں کھلا چھوڑ دیا تو وہ کسی کو کاٹے گا یا بھاگے گا۔ ہے نا؟

سنجے: (جھجک کے ساتھ) نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

سوامی: بات ہے اور جو آپ سوچ رہے ہیں، وہ بھی ٹھیک ہے۔

سنجے: مطلب؟

سوامی: ہاں، سانپ آخر سانپ ہے۔ مگر جو کاٹتا ہے وہ بھی سانپ ہے۔ جو دیوؤں کے دیو، مہادیو کے گلے میں لٹکتا ہے وہ بھی سانپ ہے۔

جیلر: واہ۔ واہ۔ کیا بات کہی سوامی جی۔

سوامی: ایک ہی چیز ہے۔ مگر رنگ دو ہیں۔ یہ دھرتی ہے۔ اس کے بھی دو رنگ ہیں۔ ایک انسان موجوں سے ٹکراتا ہوا، پانی کی سطح سے اوپر نیچے جاتا ہوا، زندہ رہنے کی کشمکش میں ہاتھ پاؤں مار کر جب کنارے کے قریب پہنچ جاتا ہے، تب یہ دھرتی گویا اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی سے نکال دیتی ہے۔ ہے نا؟

سنجے: ہاں۔

سوامی: مگر یہی دھرتی کبھی دلدل بن کر انسان کو نگل جاتی ہے۔ ہے نا؟

سنجے: جی ہاں، بالکل صحیح فرمایا۔

سوامی: بارش کا پانی کھیتوں میں جمع ہوتا ہے تو کھیت لہلہاتے ہیں اور کبھی کبھی وہی پانی لہلہاتے کھیتوں کو اُکھاڑ کر چلا جاتا ہے۔

سنجے: آپ کی باتوں میں گہرائی ہے۔

سوامی: گہرائی سوچ میں ہوتی ہے، باتوں میں نہیں۔ سمجھ بلندی پر ہو تو سوچ میں گہرائی ہوتی ہے۔ ہے نا صاحب جی؟ (چونک کر) بارش تھم گئی ہے۔ مجھے کام پر جانا ہے۔

جیلر: سوامی، تم سنجے صاحب سے باتیں کرو۔ بعد میں آجانا۔

سوامی: جیسے آپ کا حکم۔

سین......۵

سنجے: سوامی جی، آپ اپنے بارے میں کچھ اور بتائیں۔

سوامی: اسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ میرے رشتے دار بھی اسی علاقے میں ڈوب گئے ہیں۔

سنجے: یہ کیسے پتا چلا۔

سوامی: (آہ بھر کر) اس بربادی کو دیکھ کر یہی محسوس کر رہا ہوں اور دل بھی یہی کہتا ہے۔ جب بھی کوئی لاش دیکھتا ہوں تو دل کہتا ہے، کہیں یہ تمہارا بھائی تو نہیں۔ بہن تو نہیں۔

سنجے: آپ اتنے اچھے ہو پھر۔

سوامی: قتل کیوں کیا۔ یہی پوچھنا چاہتے ہو نا؟

سنجے: ہاں، آپ بُرا تو نہیں مان گئے؟

سوامی: ارے نہیں۔ سچی بات چھپانے سے تھوڑے ہی چھپ جاتی ہے۔ میں نے اپنی بیوی کا قتل کیا۔ اس کو دوائی کی بجائے زہر پلا دیا۔ (بہت زیادہ Emotional ہو کر) وہ بہت اچھی عورت تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی مجھے بچانے کی کوشش کی تھی، جھوٹ بولی تھی کہ زہر اُس نے خود پی لیا تھا۔ مگر اوپر والا سب دیکھ رہا تھا۔ اصلیت سامنے آ گئی اور مجھے سزا ہو گئی۔ خوش تھی کہ میری بانہوں میں دم توڑ رہی ہے اور اپنی مانگ میں سندور بھر کر دم توڑ رہی تھی۔ میرے اندر چھپا شیطان باہر آ چکا تھا اور پھر میں نے اس کو اندر آنے نہیں دیا۔

جیلر: (گھبرایا ہوا) سوامی، سوامی۔

سوامی: کیا ہوا صاحب۔

جیلر: دھیرو کہیں نہیں مل رہا۔

سوامی: کیا؟

جیلر: ہاں۔لگتا ہے وہ بھاگ گیا ہے۔

سنجے: ?What آپ کہاں جا رہے ہیں۔

جیلر: میں دھیرو کو پکڑ کر لاؤں گا۔ میں جا رہا ہوں۔ آپ۔ ایس ایس پی صاحب کو Inform کر دیں۔شاید،شاید۔مجھے Police Force کی ضرورت پڑے۔

سوامی: دھیرو۔ یہ تم نے کیا کِیا۔(روتا ہے) دھیرو۔ یہ تم نے کیا کِیا!

سین......٦

ایس ایس پی: Oh my God گویا وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

سنجے: جی ہاں۔

ایس ایس پی: میں نے جیلر صاحب کو بہت سمجھایا تھا مگر......

سنجے: کس نے سمجھایا۔کوئی نہیں سمجھ سکا۔ یہ کاغذی باتیں ہیں۔

ایس ایس پی: یہ آپ کہہ رہے ہیں؟

سنجے: جی ہاں۔ آج میں کہہ رہا ہوں،کل سب یہی کہیں گے۔

ایس ایس پی: دیکھئے،یہ ایک تجربہ تھا۔

سنجے: (بات کاٹ کر) ایسے تجربے بہت مہنگے ہوتے ہیں ایس ایس پی صاحب! واہ یہ بھی کیا بات ہوئی۔ قیدیوں سے وہ کام کرواؤ جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔

ایس ایس پی؛ وہ بات نہیں ہے۔اس علاقے کو چھوڑ کر باقی سارے علاقے میں ہماری Police Force کام کر رہی ہے۔ان کی Sincerity کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔

سنجے: دیکھئے۔ میں یہاں کسی Commission کا ممبر بن کر نہیں آیا ہوں۔ایک اخبار نویس بن کر آیا ہوں۔ حقیقت جاننے کی خاطر اور وہ جان گیا ہوں۔

ایس ایس پی: مسٹر سنجے، یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ Just a while back, you were so nice

سنجے: اب بھی Nice ہوں۔ کسی کو کاٹتا تو نہیں ہوں۔

ایس ایس پی: OK، آپ ناراض ہو رہے ہیں تو کوئی اور بات کریں۔

سنجے: دھیرو کی بات کیوں نہیں۔ ایک قاتل کی بات کیوں نہیں۔ ایک مجرم کی بات کیوں نہیں جو سنٹرل جیل میں رہ کر بھی شیر کی طرح گرجتا رہتا تھا۔ جیلر، جج، وکیل اور افسروں کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ اُس خطرناک مجرم کی بات کیوں نہ کریں جو اپنے کزن کو جان سے مار ڈالنا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔

ایس ایس پی: مسٹر سنجے، آپ کا غصہ جائز ہے۔ میں آپ کی پریشانی سمجھتا ہوں۔ دراصل ہمیں ایسے تجربے کرنے نہیں چاہیئے۔ پھر بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جیلر صاحب خود مشن کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ مجرم پکڑا جائے گا۔ وہ بچ کر جائے گا بھی کہاں۔ آس پاس پانی ہے۔ سڑکیں کٹ چکی ہیں۔

سنجے: ہونہہ۔ میری مانیئے تو فوراً باقی قیدیوں کو واپس سنٹرل جیل بھجوا دیں۔ بہت ڈرامہ ہو چکا ہے۔ بس کیجیئے۔ بس کیجیئے۔

وائرلیس سگنل

ایس ایس پی: Haello-Haello Yes Chaki کیا؟ سن رہا ہوں۔ ہاں، ہاں۔ I must get latest report۔ میں نے انسپکٹر گپتا کو Message بھیج دیا ہے۔ دس اور سپاہی بھیج رہا ہوں۔

سنجے: کچھ پتہ چلا۔

ایس ایس پی: Mr. Sanjay relax مانا کہ ہمارا تجربہ نا کامیاب ہوا۔ اب اتنا Panic بھی مت Create کریں۔

سنجے: میں نے سوال پوچھا ہے۔جواب دیجئے۔

ایس ایس پی: جیلر صاحب نے دھیرو کو کہیں Spot تو کیا ہے مگر ابھی تک گرفتار نہیں کیا ہے۔

سنجے: ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔اس سے اچھا تھا کہ میں آس پاس کے گاؤں میں Relief کی Story لکھ لیتا۔آپ کو مجرموں نے بے وقوف بنایا اور آپ نے دنیا کو بے وقوف بنا دیا۔ہونہہ۔

سپاہی۔ا: صاحب موقعۂ واردات سے ایک قیدی آیا ہے۔

ایس ایس پی: قیدی۔اور یہاں۔اندر لے آؤ۔

سنجے: اوہ۔سوامی جی۔

سوامی: صاحب سارا قصور میرا ہے۔مجھے سزا دو۔

ایس ایس پی: سزا تو آپ نے ہمیں دی ہے۔معلوم نہیں میں بھی کیسے تم لوگوں کی باتوں میں آگیا۔سپاہی: انسپکٹر گپتا کو کہو تمام قیدیوں کو اپنے کیمپ میں لے جائے۔

سنجے: ہاں۔اس سے پہلے کہ باقی لوگ بھی بھاگ جائیں۔Action لو۔

سوامی: مجھے بھاگ جانا ہوتا تو یہاں کیوں آتا۔

ایس ایس پی: تمہاری بات کون کرتا ہے۔کاش باقی لوگ بھی تمہارے جیسے ہوتے۔شاید ایسی مشکل پیش نہیں آتی۔(بڑبڑا کر) جیلر نے ڈبو دیا ہم سب کو۔

سنجے: سستی شہرت حاصل کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

سوامی؛ جیلر صاحب دیوتا ہے۔بھگوان کرشن کا اوتار ہے۔وہ راکھشس کو پکڑ لیں گے۔ضرور پکڑ لیں گے۔یہ میرا دل کہتا ہے۔ہاں، یہ میرا دل کہتا ہے۔سچ کی جیت ہوگی۔جھوٹ کا منہ کالا ہوگا۔(زور زور سے چلاتا ہے) دھیرو تیرا منہ بھی کالا ہوگا۔تو چنڈال ہے!تو وشواس گھاتی ہے!!دھیرو!!

سین......۷

سپاہی۔۱: سوامی جی۔تم اس علاقے کے رہنے والے ہو۔ بتا سکتے ہو کہ دھیرو بھاگنے میں کامیاب ہوگا؟

سوامی: جھوٹ اندھیرا ہے جو سچائی کے پرکاش سے ختم ہو جاتا ہے۔

سپاہی۔۲: مطلب۔

سوامی: دھیروا اپنے ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ پکڑا جائے گا۔ ارے ہاں، آپ لوگ مجھے ہتھکڑی کیوں نہیں پہنا دیتے۔

سپاہی۔۱: ضرورت نہیں۔کیا دھیرو دریا پار کر سکے گا۔

سوامی: پاپی کا وزن بہت بھاری ہوتا ہے۔ نہ وہ تیر سکتا ہے اور نہ کوئی اس کو تار سکتا ہے۔ وہ پتھر کی طرح ڈوب جاتا ہے۔ پانی کی ہر تہہ کاٹ کاٹ کر، اپنے گناہوں کا حساب دے دے کر۔

سپاہی۔۲: میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایس ایس پی صاحب جیلر کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ بہت سخت افسر ہیں۔

سپاہی۔۱: اور مجھے لگتا ہے وہ اخبار والا ایس ایس پی کو نہیں چھوڑنے والا۔

سوامی: آؤ بھجن کریں۔ پربھو سے پرارتھنا کریں۔

سپاہی۔۲: یہ بھجن کرنے کا وقت نہیں ہے۔ مجرم کا فرار ہونا ایک سنگین جرم ہے۔ جیلر کو سزا ہو سکتی ہے۔

سوامی: ایسا مت کہو۔

سپاہی۔۱: ایسا ہی نظر آرہا ہے۔خبر ملی ہے کہ اب نہ دھیرو مل رہا ہے اور نہ جیلر صاحب۔ (طنزاً) کہیں یہ ملی بھگت تو نہیں ہے (قہقہہ)۔

سوامی: ایسا مت کہو۔ بھگوان جانے جیلر صاحب کہاں ہوں گے اور کس حال میں ہوں گے۔

سین......۸

جیلر: (آوازیں دے رہا ہے) دھیرو۔ دھیرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم آس پاس کہیں چھپے بیٹھے ہو۔ سامنے آؤ ورنہ میں تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دوں گا۔ (غصے سے چلا کر) دھیرو۔!۔ دھیرو!! (خود کلامی) کہاں غائب ہو گیا کم بخت۔ آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ (آوازیں) دھیرو۔ دھیرو۔ دھیرو تم بچ نہیں سکتے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بن گئے ہو! جہاں بھی ہو سامنے آؤ۔ دھیرو۔ (خود کلامی) اُف لگتا ہے ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ وہ...... وہ مکان...... ہاں...... یہی بھیشم سنگھ کا مکان ہے...... مجھے وہاں جانا چاہئیے...... لیکن کیسے جاؤں...... کہیں دلدل میں پھنس گیا تو...... کچھ بھی ہو...... مجھے وہاں جانا ہوگا۔ شاید دھیرو وہاں چھپا بیٹھا ہوگا۔ (چند میوزیکل اِفیکٹس جس سے Suspence کا تاثر پیدا ہو)۔

سین......۹

دھیرو: (قہقہہ) وہی گھر...... وہی سامان...... مگر یہاں کوئی بھی انسان نہیں۔ (قہقہہ) کون ہوگا......؟ ......کوئی نہیں......! (قہقہہ) ہاں۔ یہی وہ الماری ہے جس میں دادا جی نے وصیت کے کاغذات رکھے تھے۔ (کچھ توڑ پھوڑ کی آواز) ہاں یہ رہے وہ کاغذات...... ہونہہ...... دادا جی نے ساری جائداد ارجن کے نام کر دی...... (قہقہہ) لو۔ مل گئی اس کو جائداد۔ (قہقہہ) کاغذ کے ٹکڑے بن کر (قہقہہ)۔ یہ کیا۔ دادا جی کی تصویر...... لگتا ہے پچھلے دو سال میں کچھ بھی نہیں بدلا۔ اب یہ حویلی میری ہے۔ یہ زمین جائداد میری ہے لیکن...... لیکن ارجن زندہ بچ نکلا تھا۔ وہ کہاں ہے؟...... (قہقہہ) مر گیا ہوگا اور کیچڑ یا پانی کا کفن اوڑھ کر دفن ہو چکا ہوگا۔ (قہقہہ)

جیلر: (سرگوشیانہ لہجے میں) او۔ تو دھیرو یہاں ہے۔ مجھے اس کو للکارنا چاہیئے۔ نہیں اگر وہ پھر بھاگ نکلا تو...... کیوں نہ اس کی ٹانگ پر فائر کروں۔ نہیں، نہیں۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی ہے۔ کہیں واپس حملہ کر دیا تو۔ میرے خیال میں مجھے نہایت پھرتی اور چالاکی سے کام لینا چاہیئے۔ ہاں اُس کو یہ شک نہیں ہونا چاہیئے کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں۔

دھیرو: (قہقہہ) تو یہ رہا ارجن کا کمرہ۔ دادا جی کا لاڈلا پوتا ارجن۔ (قہقہہ) وہ مجھے دریو سمجھتا رہا۔ مجھ سے نفرت کرتا رہا۔ (قہقہہ) آج یہاں ہوتا تو۔

ارجن: پانی، پانی۔!

دھیرو: کون، کون ہے۔

ارجن: میں ہوں، ارجن۔

دھیرو: ارجن تم۔

ارجن: ہاں بھیا۔ اچھا کیا جو تم یہاں آگئے۔ اب میں تمہاری گود میں سر رکھ کر مر جاؤں گا۔

دھیرو: (طنزاً آغصے سے) ہاں۔ میں بھی کچھ ایسے ہی سوچ رہا ہوں۔

ارجن: گلا خشک ہو رہا ہے۔ پانی پلا دو۔

دھیرو: تم بھاگے نہیں۔

ارجن: بھاگنا تو چاہتا تھا، مگر۔

دھیرو: ہاں۔ کیسے بھاگ جاتے۔ تمہاری ٹانگیں میں نے کاٹ دی تھیں۔

ارجن: بھول جاؤں اس کہانی کو۔

دھیرو: کیسے بھول جاؤں کہ میں نے کلہاڑا تمہاری سر پر مارا تھا۔ مجھے کیا معلوم وہاں تمہاری ٹانگیں ہیں۔

ارجن: دھیرو میری زبان پھٹ رہی ہے۔ دو گھونٹ پانی پلا دو۔ بعد میں چاہو تو مار ڈالو۔

سپاہی۔۲: چائے لے آؤں۔

ایس ایس پی: (غصے سے) جی نہیں۔ وائرلیس سیٹ لے آیئے۔

سین ۱۲

(شوروغل کی آوازیں)

سنجے: ڈاکٹر صاحب یہ شور کیسا ہے۔

ڈاکٹر: Flood Sufferers کو Relief مل رہی ہے نا، اسی لئے۔

سنجے: نہیں، کوئی اور بات ہے۔ دیکھیں تو ذرا۔ ارے یہ کیا؟

ڈاکٹر: کیا ہوا۔

سنجے: کوئی کسی کو کندھے پر اُٹھا کر یہاں لا رہا ہے اور پولیس والے اس کا پیچھے کر رہے ہیں۔

(گولی چلنے کی آواز)

ڈاکٹر: کسی نے گولی چلا دی ہے۔

سنجے: کسی اور نے نہیں۔ ایس ایس پی صاحب نے گولی چلائی ہے۔

ڈاکٹر: لگتا ہے یہ شخص دھیرو ہوگا۔

سنجے: ہاں مجھے بھی ویسا ہی نظر آرہا ہے۔ ہاں ہاں وہی ہوگا۔ وہ دیکھو جیلر صاحب بھی ہانپتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

ڈاکٹر: لیکن دھیرو ہماری طرف ہی آرہا ہے۔

سنجے: اب ڈر کیوں رہے ہو؟

ڈاکٹر: ان مجرموں کا کیا بھروسہ۔

دھیرو: (آوازیں دے کر) ڈاکٹر کہاں ہے؟ ارے میں پوچھ رہا ہوں ڈاکٹر کہاں ہے؟ سب بہرے ہو گیا؟

ایس ایس پی: گولی لگ گئی ہے اس لئے تلملا رہا ہے۔ اب تم بچ کر نہیں نکل سکتے۔

دھیرو: صاحب میں بچ کر نکلنا بھی نہیں چاہتا۔

ایس ایس پی: ارجن کو آزاد کر دو ورنہ اس بار گولی پاؤں پر نہیں بلکہ سینے پر داغ دوں گا۔

دھیرو: (نہایت جذباتی لہجے میں) ارجن بے ہوش ہے صاحب۔ ارجن بیمار ہے صاحب۔ بخار سے جھلس رہا ہے صاحب، اس کو بچا لو صاحب۔ یہ میرا بھائی ہے، یہ مر گیا تو ہمارا ونش ختم ہو جائے گا صاحب۔

ڈاکٹر: یہاں لٹا دو۔ ارے ہاں۔ یہ بہت بیمار ہے۔

دھیرو: اس کو ٹھیک کر دو صاحب (رو پڑتا ہے)۔

ڈاکٹر: دھیرو تمہارے پاؤں سے خون بہہ رہا ہے۔ بیٹھ جاؤں میں دیکھ لوں گا۔

دھیرو: میری فکر مت کرو ڈاکٹر صاحب۔ میں مر جاؤں تو اچھا ہے۔ میرے جیسے لوگ اس دھرتی پر بوجھ ہیں۔ ارجن کو ٹھیک کرو صاحب۔

ایس ایس پی: مسٹر سنجے ہم نے دھیرو کو پکڑ لیا (ہنسی)

سنجے: I am glad۔ ویسے آج کل کے مجرم اداکاری کرنے میں ماہر ہیں۔ ہے نا؟

ایس ایس پی: لیکن ہم بھی تو اپنے کام میں ماہر ہیں (طنزاً) آیئے، آیئے جیلر صاحب!

سنجے: Congratulation جیلر صاحب۔

جیلر: کس بات کے لئے۔

سنجے: ارے ایک مفرور مجرم کو پکڑنے کے لئے۔

ایس ایس پی: اور وہ بھی اس ڈرامائی انداز میں۔ آیئے ایک ایک کپ چائے پی لیں۔

جیلر: نہیں، میں دھیرو کو دیکھ آؤں۔

ایس ایس پی: کیوں، اب وہ بھاگ نہیں سکے گا۔ بہت ہو چکا ہے۔ ان قیدیوں کو واپس لے جانے کا انتظام کریں۔

جیلر: ہاں، اب ایسا ہی ہوگا۔

سنجے: (قہقہہ) ہاں ورنہ لوگ کہیں گے جیلر صاحب کوئی نیا ڈراما لکھنے والے ہیں۔

جیلر: اگر میں لیکھک ہوتا تو ضرور لکھتا۔

ایس ایس پی: اپنی آپ بیتی۔ (قہقہہ) جیلر صاحب شکر کرو، ہم سب کی عزت بچ گئی۔ اگر دھیرو بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتا تو۔۔۔

جیلر: وہ بھاگنا چاہتا تو بھاگ گیا ہوتا۔

سنجے: کیا مطلب؟

جیلر: ہاں، وہ بھاگنا چاہتا تو ہم سب کو چکمہ دے کر یہاں اس Relief Camp میں آنے کی بجائے اس طرف چلا جاتا۔

ایس ایس پی: یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

جیلر: جی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ دھیرو ارجن کو مارنا نہیں چاہتا ہے۔

سنجے: یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ (طنزاً) جناب جیلر صاحب۔

جیلر: دھیرو ارجن کے خون کا پیاسا تھا مگر مارنا چاہتا تو اس کو کہیں پھینک کر آسانی سے بھاگ سکتا تھا۔ اسی لئے میں نے دھیرو پر گولی نہیں چلائی۔

سنجے: گویا وہ سب ڈراما نہیں تھا۔ دھیرو واقعی ارجن کا علاج کروانا چاہتا ہے۔

ایس ایس پی: Yes, I also have the same feelings now.

سنجے: گویا اب آپ لوگوں کے پاس ایک اور سوامی آ گیا ہے۔

جیلر: یہ انسان بھی کیا چیز ہے۔ کبھی راکھشس اور کبھی دیوتا۔

ایس ایس پی: کبھی لٹیرا والمیکی اور اور کبھی سنت والمیکی۔

ڈاکٹر: ارجن کی حالت خراب ہے۔ اس کو شہر پہنچانا ہوگا۔

جیلر: What about Dheeru?

ڈاکٹر: گولی چھو کر نکلی ہے۔ آپ کی مرضی ہے۔ چاہے یہاں رکھیں یا شہر لے جائیں۔ ارے ہاں دھیرو نے یہ ایک نوٹ لکھ کر دیا ہے۔

جیلر: کیا ہے۔

(شور کی آواز)

ایس ایس پی: یہ شور کیسا ہے؟

سنجے: دھیرو پھر تو نہیں بھاگ گیا؟

سپاہی: سر یہ لوگ Relief کے لئے لڑ رہے ہیں۔

ایس ایس پی: بار بار ایسا ہوتا رہا تو Law and order کی Problem ہو سکتی ہے۔

سپاہی: سر Problem ہو رہی ہے۔

سنجے: دراصل سرکار نے سیلاب میں فوت ہونے والوں کے نزدیک ترین رشتہ داروں کو پچیس پچیس ہزار روپئے دینے کا اعلان کیا ہے، اسی لئے ہنگامے ہو رہے ہیں۔

ایس ایس پی: گویا یہ Tragedy بھی Commercial ہو گئی۔

سنجے: یہ دھیرو کو معلوم نہیں ہے ورنہ شاید ارجن کو مار کر اس کا Compensation مانگ لیتا۔ میرا مطلب ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے۔

جیلر: نہیں، وہ بات نہیں ہے۔ یہ دیکھئے۔ اس نے اس نوٹ میں یہ لکھا ہے کہ اس کی جائداد کا وارث ارجن ہوگا۔ لگتا ہے دھیرو کے اندر بیٹھا جانور مر چکا ہے۔

(شور و غل کی نمایاں آواز)

ایس ایس پی: میرے خیال میں دیکھ ہی آئیں۔

سین......۱۳

(شور وغل کی آوازیں)

تحصیلدار: آپ بیٹھ جایئے۔ مجھے جانچ پڑتال کرنے دیجئے۔ اگر کوئی رہ گیا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔

سوامی: کیا وجہ ہوگی۔ کچھ بھی نہیں۔ آپ ہمیں تنگ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو ہم سب پر قہرِ خدا ٹوٹ پڑا ہے۔ کیا اب ہم کو قہرِ آدم کا شکار بھی ہونا پڑے گا۔

سنجے: ارے، یہ سوامی کیوں لڑ رہا ہے۔

جیلر: سوامی، کیا بات ہے۔ پہلی بار آپ کو غصے میں دیکھ رہا ہوں۔

سوامی: چندن کو آہستہ آہستہ پتھر پر رگڑو تو ماتھے پر لگایا جاتا ہے مگر جب چندن کو کسی سخت چیز سے ٹکراؤ تو چنگاریاں نکلتی ہے۔

سنجے: واہ۔ کیا Symbolic بات کی ہے لیکن اصلی بات کیا ہے؟

تحصیلدار: میں بتاتا ہوں۔ اس شخص کے کچھ رشتے دار اس علاقے میں رہتے تھے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ وہ بھی سیلاب کی زد میں آکر مر چکے ہیں۔ لیکن ان کا نام یہاں درج نہیں اور نہ ان کی لاشیں ہی ملی ہیں۔

ایس ایس پی: یہ جاننے کے لئے آپ سے کیوں اُلجھ رہا ہے۔

تحصیلدار: کیونکہ ہر مرنے والے کا پچیس ہزار روپئے Compensation ملتا ہے اور یہ اپنے دس رشتے داروں کے Compensation کا Claim مانگ رہے ہیں۔

جیلر: What?

تحصیلدار: میرا Staff یہاں نہ ہوتا تو شاید یہ شخص مجھے جان سے مار ڈالتا۔

سنجے: کیا؟

سوامی: اپنا حق مانگنا کیا کوئی جرم ہے۔

ایس ایس پی: سوامی۔تمہارا اصلی نام کیا ہے؟

سوامی: سوامی۔

جیلر: بس کرو سوامی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ پچھتاوے کی آگ نے تمہارے اندر چھپے شیطان کو راکھ کر دیا ہے۔لیکن نہیں، اس راکھ کے نیچے شعلے ہیں۔

تحصیلدار: انسان گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے، خصلت نہیں بدلتی۔ یہ شخص جن کا Compensation مانگ رہا ہے ان میں اس کی مقتولہ بیوی کے باپ کا نام بھی ہے۔

سنجے: واہ! بیوی کا انشورنس نہیں مل سکا تو سُسر کی لاش کی قیمت ہی سہی۔

جیلر: سوامی تم کیسے انسان ہو؟

............☆☆☆............

☆......شوکت شہریؔ

سٹیج ڈرامہ

منٹو کا فارمولا

کردار:

۱۔ عام شہری	درمیانی عمر کا مرد
۲۔ تھانیدار	درمیانی عمر کا مرد
۳۔ سنتری	درمیانی عمر کا مرد
۴۔ٹریفک کانسٹیبل	ٹریفک محکمے کا جوان کانسٹیبل۔
۵۔محبوب	ایک نوجوان
۶۔ لڑکی	ایک نوجوان لڑکی
۷۔الہڑ نوجوان	۲۰ سال کا جدت پسند لڑکا
۸۔ لفنگہ ۱	جوان اداکار
۹۔لفنگہ ۲	جوان اداکار
۱۰۔ٹی وی کارسپانڈنٹ	

سین......۱

(پردہ اُٹھتا ہے۔ سٹیج پر بالکل اندھیرا ہے۔ اندھیرے میں لوگ جلتی موم بتیاں ہاتھوں میں لے کر ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اندھیرے میں جگنو چمک رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سٹیج کا اگلا حصہ ایسے روشن ہو جاتا ہے کہ پچھلے حصے کا اندھیرا ذرا بھی مخل نہیں ہوتا۔ اس روشنی میں ٹی وی کارسپانڈنٹ ہاتھ میں مائیک لے کر آ کھڑا ہو جاتا ہے اور ناظرین سے مخاطب ہوتا ہے۔)

ٹی وی کارسپاڈنٹ: ناظرین! آپ دیکھ رہے ہیں عوام کا یہ پُر امن احتجاج۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج صبح ساڑھے نو بجے کے قریب دو بدمعاشوں نے ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کر لیا۔ اس وقت شام کے سات بجے تک بھی کوئی ایف۔ آئی۔ آر درج نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ کہا جا رہا ہے کہ اغوا کار شہر کے بارسوخ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے پولیس اس معاملے میں پردہ پوشی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن واقعے کا واحد چشم دید گواہ ایف۔ آئی۔ آر درج کروانے کی ضد لے کر بیٹھا ہے۔ فی الحال اُس نے مزید کچھ افراد اپنے ساتھ ملا کر پولیس کے خلاف احتجاج شروع کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے پولیس کب تک اس معاملے میں پردہ پوشی کرنے میں کامیاب رہتی ہے اور سرکار کا کیا رویہ رہے گا۔ وتستا ٹی وی کے لئے کیمرہ مین علی عمران کے ساتھ میں عمران علی......

(اب ٹی وی کارسپاڈنٹ اپنے کیمرہ مین سے مخاطب ہوتا ہے جو گویا ناظرین میں کھڑا ہے۔) اب چشم دید گواہ کی طرف کیمرہ گھماؤ......

(سٹیج پر کسی بھی جانب ایک سپاٹ لائٹ روشن ہو جاتی ہے جس کی روشنی میں عام شہری موم بتی ہاتھ میں لے کر کھڑا ہے۔ ایک دم ٹی وی کارسپاڈنٹ اس کی طرف مائیک بڑھاتے ہوئے سپاٹ لائٹ میں داخل ہو جاتا ہے۔)

ٹی وی کارسپاڈنٹ: جناب، آپ ہی اس واقعے کے چشم دید گواہ ہیں؟

عام شہری: بالکل۔ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔

ٹی وی کارسپاڈنٹ: آپ ہمیں واقعے کی تفصیل بتا سکتے ہیں؟

عام شہری: آج صبح میں اُس پار کی پارک میں واک کر رہا تھا۔ جب تھک گیا۔ تو تھوڑی دیر کے لئے بینچ پر بیٹھ گیا۔ نظریں اس بس سٹاپ پر تھیں۔

ٹی وی کارسپاڈنٹ: کیا میں وہ بینچ دیکھ سکتا ہوں۔ I mean, let us visualise

عام شہری: (Yes off course) میں پورے واقعے کی منظر کشی کر سکتا ہوں۔ آیئے میرے ساتھ......

ٹی وی کارسپاڈنٹ: چلئے پلیز......

(دونوں سپاٹ لائٹ سے باہر نکلتے ہیں اور سپاٹ لائٹ بجھ جاتی ہے۔ احتجاج والے موم بتیاں لے کر مسلسل گھومتے رہتے ہیں۔ جب تک پردہ گر جاتا ہے۔)

سین۔ ۲

(پردہ اُٹھتا ہے۔ سٹیج پر دن کا اُجالا ہے اور بالکل خالی ہے۔ آج کے زمانے کا ایک الہڑ نوجوان پچھلی ونگ سے کاندھے پر لیپ ٹاپ بیگ لٹکائے، بلیوٹُتھ کے ذریعے اپنی معشوقہ کے ساتھ موبائل پر گفتگو کرتا ہوا چلا آتا ہے۔)

الہڑ نوجوان: ہلو ہلو ہلو۔ (Please take a breath)۔ اتنا بھی گرجنا ٹھیک نہیں ہے۔

(Let me tell you. If you want to break. I dont mind.)

مگر یہ بات کہے دیتا ہوں روزی is not my fiance۔ شی از جسٹ اے فرینڈ بائے گارڈ۔ اور ایک بات اور سنو۔

روزی میری ایک ہی دوست نہیں ہے۔ اس کی جیسی کئی ہیں By God, so don't be jealous کم آن۔ تم کیا مجھے بدھو سمجھتی ہو۔ میں سب جانتا ہوں۔ تمہارے جتنے بوائے فرینڈس ہیں۔ سب میرے دوست ہیں۔ ہم آپس میں سب شیر کرتے ہیں۔ ہاہاہاہا

(الہڑ جوان کی گفتگو جاری ہے اور ادھر پہلی ونگ سے ایک بزرگ بیگ میں ایک فائل لئے ظاہر ہوتا ہے۔)

الہڑ نوجوان: اری میری جان۔ تم تو اب چھ مہینے سے میرے ساتھ ہو۔ تمہیں تو میری عادتوں کی خبر ہونی چاہئیے۔ You are only one, single piece جس کے ساتھ میں تین مہینوں سے چپکا ہوں۔ ورنہ میں ہر پندرہ دن کے بعد گرل فرینڈ بدل دیتا ہوں۔ بائے گارڈ......

(بزرگ اندر کی جیب میں کچھ ٹٹولنے لگتا ہے۔ اس دوران ایک جوان لڑکی بھی آجاتی ہے اور دور کھڑی ہو جاتی ہے۔ بزرگ جیب سے پُرانی گھڑی نکالتا ہے اور الہڑ جوان کی طرف دکھاتا ہے۔)

بزرگ: بیٹا۔ ذرا دیکھنا۔ اس میں وقت کیا ہوا ہے۔

الہڑ نوجوان: مجھے لگتا ہے I am getting serious in your case something is cooking in side me by God......

(الہڑ جوان بزرگ کی بات ان سُنی کرتے ہوئے سائیکلو روم کی جانب ٹہلنے لگتا ہے اور اب اس کی گفتگو سنائی نہیں دیتی)

لڑکی: (کلائی کی گھڑی دیکھ کر بزرگ کو جواب دیتی ہے) اس وقت دس بج گئے ہیں۔

بزرگ: تو گویا دیر نہیں ہوئی ہے۔ جب تک دفتر کھُل جائیں گے۔ تب تک میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ شکر خدا کا۔ اب اگر پینشن کلرک آج بھی چھٹی پر نہیں ہوگا تو میرا کام ہو جائے گا۔

(اس دوران ایک مرد آجاتا ہے اور موجودہ حالات کا جائزہ لے کر اپنا اندازہ ظاہر کرتا ہے۔)

مرد: آج ہڑتال تو نہیں ہے۔

بزرگ: ہڑتال؟ ایسی تو کوئی اطلاع نہیں ہے۔

مرد: نہیں۔ اطلاع تو بالکل نہیں ہے۔ مگر حالات ہڑتال کے جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سے تو بالکل سنسنی ہے۔ کوئی چلتا بھی نہیں۔

بزرگ: ہاں۔ کوئی مٹاڈور بھی نہیں آئی کب سے۔ نہ کوئی بس آئی۔ ہڑتال ہی ہوگی شاید۔ لگتا ہے آج کا دن بھی بیکار ہی چلا جائے گا۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ورنہ اس عمر میں دھکے کیوں کھانے پڑتے۔ جوان بیٹے کو پڑھایا لکھایا تھا۔ پھر پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی۔

(پہلی ہی ونگ سے ٹریفک ڈپارٹمینٹ کا ایک کانسٹیبل ظاہر ہو جاتا ہے اور لوگوں کو اطلاع دیتا ہے۔)

ٹریفک کانسٹیبل: حضرات! یہاں سے ٹریفک روک دیا گیا ہے۔ آپ کو ہر گاڑی دوسرے بس سٹاپ سے ملے گی۔

مرد: کیوں بھئی۔ یہاں سے کسی منسٹر کو آنا ہے ؟

ٹریفک کانسٹیبل: نہیں۔ آگے نکاس کی پائپ ڈالنے کے لئے سڑک کھودی گئی ہے۔ اس لئے ٹریفک Divert کر دیا گیا ہے۔

بزرگ: شکر ہے ہرتال نہیں ہے۔ (بزرگ تیز تیز قدموں سے نکل جاتا ہے۔)

الہڑ نوجوان: ویسے اگر ٹریفک Divert کیا گیا تھا تو عوام کی اطلاع کیلئے یہاں کوئی سائن بورڈ لگوا دینا چاہیے تھا۔

ٹریفک کانسٹیبل: سائن بورڈ تو لگا ہوا ہے۔

الہڑ نوجوان: کون وہ ؟...... اسے تم سائن بورڈ کہتے ہو۔ یہ پتہ نہیں کس زمانے میں لکھا گیا ہے۔ آدھے سے زیادہ حروف تو مٹ چکے ہیں۔ اپنے ایس۔ پی صاحب کو بتاؤ ہمیں پڑھ کر سنائیں۔ (دوسرے بس سٹاپ کی جانب نکل جاتا ہے۔)

مرد: ویسے اب تو نیا لکھوانا چاہیئے۔

ٹریفک کانسٹیبل: رکوزشن تو دے دی ہے۔

مرد: پھر تو اگلا گڈھا کھودنے تک بورڈ بن ہی جائے گا۔ (یہ بھی اگلے بس سٹاپ کی جانب نکل جاتا ہے)

ٹریفک کانسٹیبل: کیوں محترمہ۔ آپ نہیں جائیں گی؟

لڑکی: جی نہیں۔

ٹریفک کانسٹیبل: لیکن یہاں سے تو کوئی بس نہیں آئے گی۔

لڑکی: میں بس کا انتظار نہیں کر رہی ہوں۔

ٹریفک کانسٹیبل: تو پھر...... یہاں بس کا نہیں تو کس کا انتظار کر رہی ہیں؟

لڑکی: اپنے عاشق کا

ٹریفک کانسٹیبل: انہیں فون کیجیے۔ کہیئے اگلے سٹاپ پر ملے۔

لڑکی: کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جگہ اب زیادہ بہتر ہو گئی ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: مطلب؟

لڑکی: اب یہاں کسی بھی طرح کا خلل نہیں رہا۔ اب یہ جگہ ملنے ملانے کیلئے کافی موزون ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: او......تو یہ دو نمبری ملاقات ہے۔

لڑکی: دو نمبری ملاقات سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

ٹریفک کانسٹیبل: مطلب......عاشق معشوق والی ملاقات۔

لڑکی: ایسا ہی سمجھ لو۔

ٹریفک کانسٹیبل: ویسے ایک بات بتاؤں گا......ایسی جگہ کسی لڑکی کا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

لڑکی: کیوں؟

ٹریفک کانسٹیبل: آج کل تو روز ہی لڑکیاں اغوا ہو جاتی ہیں۔آپ خبریں نہیں سنتیں؟

لڑکی: آپ بے فکر رہیے۔مجھے کوئی اغوا نہیں کر سکتا۔

ٹریفک کانسٹیبل: اچھا اچھا۔آپ کو تو اس طرح ملنے کا کافی تجربہ ہوگا۔

لڑکی: جی نہیں۔میں آج پہلی بار اُن سے مل رہی ہوں۔

ٹریفک کانسٹیبل: پہلی بار؟۔پہلی بار ملنا ہے تو آپ اسے کیسے پہچان لیں گی؟

لڑکی: وہ میرا کام ہے۔آپ بے فکر ہو کر جا سکتے ہیں

ٹریفک کانسٹیبل: ویسے اگر آپ اُن سے ملی نہیں ہیں۔تو یہ ملنے کا پروگرام بنا کیسے؟

لڑکی: دیکھئے مسٹر۔اب آپ میرے ذاتی معاملات میں تانک جھانک کرنے لگے ہیں۔

ٹریفک کانسٹیبل: معاف کیجیے۔میں بس تھوڑا سا تجربہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

لڑکی: یہ جان کر آپ کو کیا تجربہ حاصل ہوگا کہ ہماری آج کی ملاقات فون پر طے ہوئی ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: فون پر۔اگر آپ ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں ہیں۔تو فون کس نے کیا؟

لڑکی: فون میں نے کیا۔

ٹریفک کانسٹیبل: آپ کو اُس کا نمبر کہاں سے ملا۔؟

لڑکی: مجھے چاچی کا نمبر ملانا تھا۔ غلطی سے ان کا نمبر مل گیا۔

ٹریفک کانسٹیبل: یعنی رانگ نمبر مل گیا۔؟

لڑکی: جی

ٹریفک کانسٹیبل: پھر؟

لڑکی: میں نے سوری کہا۔ اُس نے کہا کوئی بات نہیں۔ پھر اگلے دن اس نے رانگ نمبر ملا دیا۔ اور سوری کہا۔

میں نے بھی کہا کوئی بات نہیں۔ پھر دونوں طرف سے رانگ نمبر ملتے رہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: اور نمبر save ہو گیا۔

لڑکی: بالکل۔

ٹریفک کانسٹیبل: واہ۔ کیا بات ہے۔ اسی طرح اگر سب کے رانگ نمبر save ہو جاتے تو کسی کے جوتے بھی نہیں گھستے۔

لڑکی: آپ بھی کوشش کر کے دیکھو۔ شاید کوئی رانگ نمبر آپ کا بھی save ہو جائے۔

ٹریفک کانسٹیبل: ضرور۔ اب تو میں کوشش کروں گا اور دیکھنا کتنے نمبر save کروں گا۔

(ٹریفک کانسٹیبل جاتے جاتے موبائل فون پر نمبر ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ لڑکی اسے سیدھا سادھا سمجھ کر مسکراتی ہے۔ لڑکی ادھر اُدھر ٹہلنے لگتی ہے۔ کلائی پر بندھی گھڑی کو بار بار دیکھتی ہے۔ اسی دوران دو لفنگے آتے ہیں اور لڑکی کے دونوں جانب کھڑے ہو کر بے حیاہ فقرے کسنے لگتے ہیں۔)

لفنگہ ۱: (وسل بجاتا ہے)

لفنگہ ۲: Hello baby. How are you?

لفنگہ ۱: کسی کا انتظار ہے کیا؟

لفنگہ ۲: ویسے تو ہم بھی ہیں۔ And we are more romantic

لڑکی: Shut up

لفنگہ ۱: یہی مجھے خوبصورت لڑکیوں کا بُرا لگتا ہے۔ بات بات پر شٹ اپ کہہ دیتی ہیں۔ اتنا بھی نہیں سوچتی کسی کو بُرا بھی لگ سکتا ہے۔

لفنگہ ۲: بالکل۔ کوئی عزت دار گھرانے سے آیا ہو تو غُصے میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔

لڑکی: میں سمجھ گئی تم کس عزت دار گھرانے سے ہو۔ اب چُپ چاپ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں پولیس کو بلا کر تمہارے پورے خاندان کی مٹی پلید کروں گی۔

لفنگہ ۱: Cool it baby۔ غُصہ نہیں۔ Let you too be romantic۔

لڑکی: I say you shut up

لفنگہ ۲: تھوڑا صبر کرو یار۔ We will just be friends

لڑکی: My foot

لفنگہ ۱: (غصے میں لڑکی کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔) Come on baby......(اور اسی کے ساتھ جیب سے چاقو نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیتا ہے)......اگر منہ سے آواز نکالی تو چاقو حلق میں اُتر جائے گا۔

(لڑکی بوکھلا جاتی ہے اور لفنگے اس کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اسی وقت ہال سے عام شہری اُٹھتا ہے اور چلاتا ہوا اسٹیج کی طرف دوڑتا ہے۔)

عام شہری: اے رُکو۔ میری بات سنو۔ تم لوگ ایسا نہیں کرسکتے......

(جب تک عام شہری سٹیج پر پہنچ جاتا ہے۔ لفنگے لڑکی کو لے جاتے ہیں۔ عام شہری ان کے پیچھے دوڑتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں کار کے سٹارٹ ہونے اور تیز رفتار میں روانہ ہونے کا تاثر اُبھرتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد عام شہری تھکا ماندہ لوٹ آتا ہے۔)

عام شہری: توبہ۔ یہ تو حد ہوگئی...... اس طرح کے واقعات تو یہاں کبھی نہیں ہوتے تھے۔ اب تو یہ تہذیب بھی اخلاقی طور دیوالیہ ہوگئ ہے۔شرم وحیا تو بالکل ہی نہیں رہی۔

(اتنے میں ایک اور نوجوان حاضر ہوجاتا ہے۔ یہ لڑکی کا محبوب ہوتا ہے۔ یہ کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے ادھر ادھر جھانکنے لگتا ہے۔جیسے کسی کی تلاش ہو۔)

محبوب: جناب! آپ نے یہاں کسی لڑکی کو تو نہیں دیکھا۔؟

عام شہری: ہاں۔ایک لڑکی تھی جو اپنے محبوب کے انتظار میں تھی۔

محبوب: وہ کہاں گئ ؟

عام شہری: دو بدمعاشوں نے اُسے اغوا کرلیا۔

محبوب: کیا کہا۔دو بدمعاش اغوا کر کے لے گئے۔؟

عام شہری: ہاں۔ جب تک میں اُن کی طرف دوڑ پڑا۔وہ اُس بے چاری کو گاڑی میں دھکیل کرلے گئے۔

محبوب: آپ نے اس گاڑی کا نمبر تو نوٹ کیا ہوگا؟

عام شہری: اس گاڑی کا نمبر پلیٹ ہی نہیں تھا۔

محبوب: Oh my God

عام شہری: وہ لڑکی آپ ہی کا انتظار تو نہیں کر رہی تھی۔؟

محبوب: جی۔

عام شہری: پھر تو آپ ہی اُس کے گنہگار ہیں۔ آپ کو اُسے اس ویران جگہ انتظار نہیں کروانا چاہیئے تھا۔ آپ کو پہلے ہی آجانا چاہیئے تھا۔

محبوب: میں پہلے ہی آیا تھا۔ لیکن راستے میں سنا ٹریفک Divert کر دیا گیا ہے۔ میں اگلے سٹاپ پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہاں نہیں آئی۔ تو میں یہاں آ گیا۔

عام شہری: تو گویا تم بھی دھوکے میں آ گئے ہو۔ تمہاری بھی کوئی خطا نہیں ہے۔ بہر حال۔ ابھی وہ بدمعاش زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ آؤ چلو ہم پولیس کو اطلاع دیتے ہیں۔

محبوب: نہیں۔ مجھے لگتا ہے ایسے معاملات میں پولیس کو اطلاع دینے کا مطلب ہے آ بیل مجھے مار۔ آپ کو نہیں پتہ پولیس کیسے کیسے سوال پوچھے گی۔ میں تو کہتا ہوں بہتر ہوگا اگر ہم اس جھمیلے سے اپنا دامن ہی بچا لیں۔

عام شہری: (حیران ہو کر) مطلب تمہیں اس لڑکی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ بے چاری تمہاری محبت میں یہاں تمہارا انتظار کرتی رہی اور ایک بھیانک حادثے کی زد میں آ گئی۔ تمہیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں۔؟

محبوب: دیکھیئے۔ ایسے معاملات میں جذبات سے نہیں بلکہ عقل سے کام لینا پڑتا ہے۔

عام شہری: افسوس! افسوس تمہاری اس عقل پر جس کے سامنے انسانیت کی کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ تمہارے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟

محبوب: ارے بھیا۔ تم کیوں مجھے مصیبت میں ڈال دینا چاہتے ہو۔ میں ایسی کسی لڑکی کو نہیں جانتا ہوں۔ مجھے معاف کرو۔ میں چلتا ہوں۔

عام شہری: (محبوب کو پیچھے سے دبوچ لیتا ہے) ارے جاتے کہاں ہو۔ کسی معصوم لڑکی کو مصیبت میں ڈال کر نو دو گیارہ ہو جانے کی کوشش کرو گے۔ تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔

محبوب: ارے پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟

عام شہری: تم کیا سمجھتے ہو۔ ایک معصوم لڑکی کو یہاں بُلوا کر اغوا کاروں سے اُس کی آبرو ریزی کرواؤ گے اور کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ تم لوگوں کی یہ سازش میں خوب سمجھتا ہوں۔

محبوب: کیا مطلب ہے آپ کا۔

عام شہری: تھانے چلو۔ وہیں سمجھا دوں گا۔

محبوب: چھوڑو مجھے۔ میں کہتا ہوں۔ بعد میں بہت پچھتاؤ گے۔ تمہیں نہیں پتہ میں کون ہوں۔

عام شہری: تم جو بھی ہو۔ میرے سامنے ایک مجرم ہو۔

(عام شہری اسے دبوچ لیتا ہے اور وہ چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی دوران کہیں سے ایک سنتری دوڑ کر آ جاتا ہے)

سنتری: ہے ہے۔ کیا بات ہے۔ کیوں لڑتے ہو؟

عام شہری: ارے بھئی۔ ہم لڑ نہیں رہے ہیں بلکہ میں اس ضمیر فروش کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔

سنتری: کیوں۔ کیا۔ کِیا ہے اس نے؟

عام شہری: ایک جوان لڑکی کو اس نے اغوا کروا دیا ہے۔

محبوب: یہ جھوٹ بول رہا ہے۔

سنتری: اچھا؟۔ تو اس کا مطلب ہے کوئی لڑکی اغوا ہو گئی ہے؟

عام شہری: وہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ یہاں اس کے انتظار میں تھی۔

سنتری: پھر تو ضرور اسی کی سازش ہوگی۔اس کے خلاف سیدھا ایف۔آئی۔آر لگے گا۔

عام شہری: وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔

سنتری: (مزید سُنے بغیر تھانیدار کو پُکارتا ہے) تھانیدار صاحب، جلدی آجایئے۔یہاں معاملہ گرم ہے۔

محبوب: دیکھو میری بات سنو۔یہاں کوئی اغوا کا معاملہ نہیں ہے......

سنتری: صاحب سے بات کرو۔

(تھانیدار پہنچ جاتا ہے۔)

تھانیدار: کیا بات ہے؟

سنتری: جناب انہوں نے کسی لڑکی کو اغوا کیا ہے۔

عام شہری ارے بھائی۔تم اُلٹی سیدھی بات کیوں کرتے ہو۔ہم دونوں تو تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ہم کیسے کسی لڑکی کو اغوا کر سکتے ہیں۔

تھانیدار: تم نہیں کر سکتے۔تو کس نے کی؟

محبوب: جناب۔کوئی لڑکی اغوا نہیں ہوئی ہے۔دراصل واقعہ یہ ہوا کہ......

عام شہری: ارے تم کیا واقعہ سناؤ گے۔تم تو خود واقعے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

سنتری: سُن لیا صاحب۔میں اگر بروقت یہاں نہیں پہنچا ہوتا۔یہ دونوں فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

عام شہری: ارے بھائی۔میں کیوں فرار ہوتا۔میں ہی تو اصل واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔

تھانیدار: ارے او چشم دید گواہ۔تم واقعہ بیان کرتے ہو یا میں دے دوں کان کے نیچے۔؟

عام شہری: (گھبرا کر جلدی جلدی قصہ بیان کرتا ہے) جناب۔ میں اُس پارک میں بیٹھا تھا۔ ایک لڑکی یہاں کھڑی تھی۔ دو بدمعاش لڑکے کہیں سے آ گئے اور لڑکی کو اُٹھا کر لے گئے۔ میں دوڑتا ہوا یہاں آیا لیکن تب تک وہ لڑکے اُس بے چاری کو کار میں دھکیل کر لے گئے۔ اتنے میں یہ اُس لڑکی کی تلاش میں آ گیا۔ جب میں نے واقعہ سنا کر پولیس کو اطلاع کرنے کی بات کہی۔ تو یہ بھاگنے لگا۔

تھانیدار: کیوں بھئی۔ کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟

محبوب: بالکل نہیں۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ یہ سراسر بکواس کر رہا ہے۔

عام شہری: کیا تم نے اُس لڑکی کو یہاں انتظار کرنے کے لئے نہیں کہا تھا۔؟

محبوب: کس لڑکی کو۔ اور تم کون ہو۔ میں تو تم کو بھی نہیں جانتا۔

عام شہری: جناب، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ ٹریفک کانسٹیبل سے پوچھ سکتے ہیں۔ اس نے لڑکی کو دیکھا ہے بلکہ اس سے باتیں بھی کی ہیں۔

تھانیدار: (سپاہی سے مخاطب ہو کر) ذرا دیکھو کون ڈیوٹی پر ہے۔

سنتری: جناب۔ (سنتری سلیوٹ مار کر چلا جاتا ہے)

محبوب: جناب آپ اس کی باتوں میں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ میں خود ایک وکیل ہوں اور مشہور وکیل جناب نقشبندی صاحب کا بیٹا ہوں۔

تھانیدار: اچھا۔ تو آپ نقشبندی صاحب کے بیٹے ہیں۔ اُن کی وکالت کا تو جواب نہیں۔

عام شہری: سب سے بڑی عدالت تو اوپر ہے۔ وہاں سب کا اپنا عمل چلتا ہے۔ کسی کی وکالت نہیں چلتی۔

تھانیدار: ویسے آپ ہیں کون؟

عام شہری: میں ایک عام شہری ہوں۔

تھانیدار: کوئی گواہ ہے تمہاری دلیل کا؟

عام شہری: میں خود چشم دید گواہ ہوں۔

تھانیدار: لیکن تمہارا ابھی تو کوئی گواہ ہونا چاہیئے۔ہم کیسے مان لیں گے کہ جو تم کہہ رہے ہو۔وہ سچ ہے۔

عام شہری: آپ تحقیقات کریں۔

تھانیدار: تحقیقات تو تب ہی ہوگی جب ایف۔آئی۔آر ہوگا اور ایف۔آئی۔آر تب ہی ہوگا جب آپ کے حق میں کوئی گواہی دے گا۔

عام شہری: تعجب ہے۔کیا سچ اتنا کمزور ہے، اتنا ناتواں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔سچ کو بیساکھیوں کی ضرورت کب سے پڑنے لگی۔

تھانیدار: دیکھیئے قانون کے بھی کچھ قوائد ہوتے ہیں۔ہم اس طرح آپ کی دلیل پر یقین نہیں کر سکتے۔آئی ایم سوری

(تھانیدار مُڑ کر چلا جاتا ہے۔محبوب بھی اطمینان کے ساتھ تھانیدار کے پیچھے ہولیتا ہے اور جاتے جاتے عام شہری کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں۔عام شہری اکیلا رہ جاتا ہے۔دھیرے دھیرے روشنیاں گُھل ہوجاتی ہیں اور پردہ گر جاتا ہے۔)

سین......۳

(پردہ اُٹھتا ہے۔سٹیج پر بالکل اندھیرا ہے۔اندھیرے میں موم بتیاں ہاتھ میں لے کر عوام کا وہی پُر امن احتجاج جاری ہے۔تھوڑی دیر میں سٹیج کے سامنے والے حصے پر روشنی پڑتی ہے جو سٹیج کے باقی حصے کے اندھیرے پر مخل نہیں ہوتا۔ڈرامے کی ابتدا کی طرح ٹی وی کارسپاڈنٹ ظاہر ہوتا ہے اور ناظرین سے مخاطب ہوتا ہے۔)

ٹی وی کارسپاڈنٹ: ناظرین! آپ نے دیکھ لیا کہ دن کے اُجالے میں کس طرح ایک غریب گھرانے کی بے گناہ لڑکی راہ چلتے اغوا کر لی جاتی ہے اور ایف۔ آئی۔ آر تک درج نہیں ہوتا۔ سرکار اور انتظامیہ کی اس لاپرواہی کے شکار عوام کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہوتا نظر آرہا ہے۔ عام شہری کا کہنا ہے کہ یہ احتجاج جو آپ دیکھ رہے ہیں تب تک جاری رہے گا جب تک پولیس ایف۔ آئی۔ آر درج کر کے تحقیقات شروع نہیں کر لیتی۔ وتستا ٹی وی کے لئے کیمرہ مین علی عمران کے ساتھ میں عمران علی۔

(روشنی گُھل ہو جاتی ہے اور دھیرے دھیرے پردہ گر جاتا ہے۔)

سین......۴

(پردہ اُٹھتے ہی سٹیج بالکل اُجلا نظر آتا ہے۔ دائیں جانب کی ونگ سے عام شہری ظاہر ہو جاتا ہے۔ سنتری تعریفوں کے پُل باندھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ عام شہری بیچ سٹیج پر پہنچ کر جواب دینے کے لئے مجبوراً اُٹھ جاتا ہے۔)

سنتری: داد دیتا ہوں آپ کی ہمت اور آپ کی جُرأت کی۔ اس طرح کون دوسروں کے لئے اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ جس لڑکی کے لئے ابھی تک اُس کے ماں باپ بھی سامنے نہیں آئے۔ اُس لڑکی کے حق کی لڑائی آپ نے لڑی۔

عام شہری: یہ تو لڑائی کی شروعات ہے۔ ابھی حق ملا کہاں۔

سنتری: مگر ایف۔ آئی۔ آر تو درج ہو گیا۔

عام شہری: تو کون سا احسان کیا تمہارے تھانیدار صاحب نے۔ آج بھی اگر ایف۔ آئی۔ آر درج نہیں ہو جاتا، ہم اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ عام شہری کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے آپ کو۔

سنتری: مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ لڑکی کے ماں باپ، بھائی بہن۔ کوئی تو ہوگا۔ پھر ابھی تک اس کی تلاش میں کوئی آیا کیوں نہیں۔

عام شہری: لڑکی کا معاملہ ہے بھئی۔ کون بدنامی لے گا۔ آج تک نہ جانے کتنی لڑکیاں چپ چاپ زہر پی چکی ہوں گی۔ مگر بدنامی کے ڈر سے کوئی اُف تک نہیں کرتی۔

سنتری: بالکل۔ اسی وجہ سے تو گنہگار پکڑے نہیں جاتے۔

(اسی وقت ٹریفک کانسٹیبل ہاتھ میں اخبار رول کر کے ایک ونگ سے آ کر دوسری ونگ میں جانے لگتا ہے۔)

ٹریفک کانسٹیبل: (چلتے چلتے) کیوں بھئی۔ صاحب بیٹھے ہیں۔ یا دورے پر ہیں؟

سنتری: بالکل بیٹھے ہیں۔ آپ کو کیا کام ہے؟

ٹریفک کانسٹیبل: پتہ نہیں کیوں یاد کیا ہے۔

سنتری: ارے یاد آیا۔ کیا تم ہی کل ہائی وے چوک پر ڈیوٹی پر تھے؟

عام شہری: ہاں بالکل۔ یہی تو تھا۔

ٹریفک کانسٹیبل: کیوں۔ کیا ہوا؟

سنتری: ارے بھیا۔ تھانیدار صاحب تو کل سے تمہیں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ میں دو بار آپ کے دفتر سے ہو آیا۔

ٹریفک کانسٹیبل: ہم بھی تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں تھے۔ کل دن بھر جہلم سے گاڑی کھینچ کر نکالی۔ پھر رات گئے تک لاشیں تلاش کرتے رہے۔

عام شہری: کون سی گاڑی۔ کیسی لاشیں؟

ٹریفک کانسٹیبل: کیا بتاؤں بھائی۔ کل ایسا ایکسیڈنٹ ہوا کہ ایک گاڑی سیدھی جہلم میں جا گری۔ کل شام تک جو دو لاشیں برآمد ہوئیں۔ اُن کی شناخت ہونے پر پتہ چلا ایک منسٹر صاحب کا بیٹا تھا۔ دوسرا کمشنر صاحب کا۔ (اخبار دکھاتے ہوئے) یہ دیکھ لو اُن کی تصویریں۔

عام شہری: افو خدایا۔ یہ تو وہی بدمعاش ہیں۔

سنتری: کون ؟

عام شہری: وہی جنہوں نے لڑکی کو اغوا کرلیا۔

ٹریفک کانسٹیبل: کون سی لڑکی ؟

سنتری: وہی یار جس پر تمہیں بلاوا ہے۔ سُنا ہے کل تم نے اُسے ہائے وے چوک میں دیکھا ہے بلکہ اُس کے ساتھ باتیں بھی کی ہیں۔

ٹریفک کانسٹیبل: میں...... میں تو نہیں تھا۔

عام شہری: تم ہی تھے۔ میں نے خود تمہیں دیکھا ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: اوہ۔ میرے خدایا۔ وہ لڑکی اغوا ہو گئ۔ پھر تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو گی۔ لیکن اس کی لاش تو ملی ہی نہیں۔

عام شہری: یہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ جب ان کی دو لاشیں مل گئیں۔ اُس کی لاش کیوں نہیں ملی......

(ٹریفک کانسٹیبل اور سنتری فکر میں پڑ جاتے ہیں۔ اسی دوران پچھلی ونگ سے تھانیدار ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ دور سے انہیں غور سے دیکھتا ہے۔ عام شہری احتجاجی انداز میں مسلسل جیسے تقریر کرتا ہے۔)

عام شہری: وہ بارسوخ گھرانوں کے صاحبزادے تھے۔ اس لئے آپ اُن کی لاشیں برآمد کرنے کیلئے مجبور ہوئے اور ایک غریب، بے سہارا لڑکی کو ڈوبنے دیا۔ خدا سب دیکھتا ہے۔ اس کے قہر سے ڈرو۔ خدا کے قہر کے آگے نہ منسٹروں کی چلتی ہے نہ کمشنروں کی۔ یاد رکھنا، وہاں سب ایک ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی بندہ نہ بندہ نواز۔

تھانیدار: اے مسٹر عام شہری۔ تم نے یہ کون سا نیا جھمیلہ شروع کیا ہے۔ تمہارا ایف۔ آئی۔ آر تو درج ہو گیا۔ اب اور کیا چاہیئے۔ یہ تقریر بازی کیوں لگا رکھی ہے۔

عام شہری: یہ دیکھئے تھانیدار صاحب۔ یہ ہے خدا کا انصاف۔ یہی ہیں وہ اغوا کار۔ (تھانیدار اخبار دیکھتا ہے)۔اس کو کہتے ہیں خدا کا قہر جوانسان کی سمجھ میں نہیں آتا۔اس کے باوجود انسان ان ہی منسٹروں اور کمشنروں کی خوشامد میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی آوارہ اولاد کی لاشیں تک برآمد کی جاتی ہیں لیکن ایک غریب کی بے گناہ لڑکی دریا میں بہنے دی جاتی ہے۔تا کہ امیرزادوں کے جرائم چھپے رہیں۔

تھانیدار: بول دیا تم نے؟ تمہاری تقریر ختم ہوگئ ؟ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

عام شہری: جب تک لڑکی برآمد نہیں ہو جاتی۔ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔

تھانیدار: تمہارا ایف۔آئی۔آر درج ہو گیا ہے۔اب ہمیں تحقیقات کرنے دو۔

عام شہری: آپ کیا تحقیقات کریں گے۔ اس معاملے میں تو اللہ تعالیٰ نے خود تحقیقات کرلی ہے۔

تھانیدار: What do you mean۔تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

عام شہری: میں کوئی پہیلی نہیں سنا رہا ہوں جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

تھانیدار: مرے ہوئے جوانوں کی فاتحہ پڑھنے کی بجائے ان کے گناہوں کی وضاحت کر کے کون سی سچائی ثابت کر رہے ہو تم۔ یہی تمہاری انسانیت ہے۔یہی تم اُن کے لواحقین کو تسلی دے رہے ہو۔شرم آنی چاہئیے تمہیں۔

سنتری:۔ دیکھو بھائی۔میری بات مانو۔تم اپنا ایف۔آئی۔آر واپس لے لو اور گھر چلے جاؤ۔ورنہ خوامخواہ ہمارے ساتھ ساتھ خود کو بھی پریشانیوں میں مبتلا کروگے۔

ٹریفک کانسٹیبل: کیا اس نے ایف۔آئی۔آر درج کیا ہے؟

سنتری: اور نہیں تو کیا۔تمہیں اسی لئے تو بُلایا ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: لیکن مجھے کیوں؟

سنتری: تم ہی نے تو لڑکی کو دیکھا ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: دیکھا ہے۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا وہ اغوا ہو جائے گی۔

عام شہری: معلوم نہیں تھا تو اُسے ایڈوانس میں کیسے کہا کہ ایسی جگہ کسی لڑکی کا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ آج کل تو روز ہی لڑکیاں اغوا ہو جاتی ہیں۔

تھانیدار: اچھا۔ یہ کہا تھا تم نے؟

ٹریفک کانسٹیبل: سر! یہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ سچ میں اغوا ہو جائے گی۔ میں ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ (ٹریفک کانسٹیبل بچے کی طرح تھانیدار کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگتا ہے)...... جناب میں ماں باپ کا اکلوتا ہوں۔ وہ یہ سب سنیں گے تو اُن کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

تھانیدار: (سپاہی سے مخاطب ہو کر) جاؤ۔ اُس وکیل کو بُلا کر لے آؤ۔

عام شہری: جناب! اُس کے پاس لڑکی کا فون نمبر بھی ہوگا۔

تھانیدار: اب تم تحقیقات بھی خود ہی کرو گے۔؟

عام شہری: نہیں۔ میں نے مشورہ دیا۔

تھانیدار: ہمیں کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، جائیے۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیجئے۔

(تھانیدار مڑ کر وہیں سے چلا جاتا ہے جہاں سے ظاہر ہو گیا تھا۔)

عام شہری: ارے بھائی! تم کیوں رو رہے ہو۔ جب تمہارا کوئی قصور ہی نہیں ہے۔ تو کوئی کیوں تمہیں سزا دے گا۔ سزا تو اُن کو ہوتی ہے جو جرم کرتے ہیں۔

ٹریفک کانسٹیبل: لیکن وہ تو مر چکے۔ پھر تم ہماری جان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔؟

عام شہری: میری کیا کوئی دشمنی ہے آپ لوگوں سے جو آپ کی جان کے پیچھے پڑوں۔ میں تو اس بے گناہ لڑکی کے لئے انصاف چاہتا ہوں۔

ٹریفک کانسٹیبل: جب اُس کے ماں باپ اُس کے لئے انصاف نہیں ڈھونڈتے ہیں، تم کون ہوتے ہو؟

عام شہری: میں ایک عام شہری ہوں۔

ٹریفک کانسٹیبل: پھٹے مُنہ تیرا۔ ایسے عام شہری کا تو جنازہ اُٹھنا چاہیئے۔

(ٹریفک کانسٹیبل غُصے میں اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔ عام شہری بے چارہ سامُنہ بنا کر دوسری جانب سے نکل جاتا ہے۔ روشنیاں گُھل ہو جاتی ہیں۔)

سین ۵

(سٹیج کے اگلے حصے میں ایک سپاٹ لائیٹ روشن ہے جس کے نیچے لڑکی گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھی ہے۔ اندھیرے سے ایک بزرگ ظاہر ہو جاتا ہے اور لڑکی کے نزدیک بیٹھ کر اُسے تسلی دینے لگتا ہے۔)

بزرگ: بیٹی۔ تم کیوں پشیمان ہو۔ تمہاری تو کوئی خطا نہیں ہے۔

لڑکی: کسی کی تو ہے۔

بزرگ: خطاوار جو ہے اُس کو سزا مل جائے گی۔ اللہ سب دیکھتا ہے۔

لڑکی: لیکن یہ بے ضمیر لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ اُن کے ایک لمحے کی خوشی کیسے کسی مظلوم کی پوری زندگی ویران کر جاتی ہے۔

بزرگ: بے ضمیر لوگ کہاں سوچتے ہیں۔ سوچتے وہ ہیں جن کا ضمیر زندہ ہوتا ہے۔ وہی اُن معصوم لڑکیوں کا کرب محسوس کرتے ہیں جو اپنے ماں باپ کی عزت کے لئے چُپ چاپ زہر پی جاتی ہیں۔

لڑکی: اور وہ ماں باپ اپنی اولادوں کو قبروں میں سوتے دیکھ کر چپ چاپ خون کے آنسوں پی جاتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔

بزرگ: اور پھر جب یہی بے ضمیر لوگ صاف وشفاف کپڑے پہن کر تعزیتی مجلسوں میں شرافت کے قصیدے پڑھنے لگتے ہیں تو خون کھولتا ہے۔

لڑکی: یہی دنیا ہے پاپا جی۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ یہاں ہر چہرے پر کئی ماسک چڑھتے ہیں۔ کئی اترتے ہیں۔

بزرگ: اسی وجہ سے تو میں اس تھیٹر کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔

لڑکی: تھیٹر سے بدظن کیوں ہو گئے ہو۔؟

بزرگ: اب اس فن میں وہ پاکیزگی نہیں رہی۔ نیتوں میں کھوٹ آ گیا ہے۔ ہمارے وقت میں تھیٹروں کو مندروں کی طرح پاکیزہ تصور کیا جاتا تھا۔ ان ناٹیہ مندروں کا اپنا ایک تقدس تھا۔ اب وہ قدریں ہی نہیں رہیں۔ نہ وہ جذبہ کہیں نظر آتا ہے۔

لڑکی: لیکن سب تو ایسے نہیں ہیں۔

بزرگ: ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتی کس شدت کے ساتھ کہانیاں شروع ہو جاتی ہیں اور کلائیمیکس تو کیا اینٹی کلائیمیکس سے پہلے ہی ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ ایسے زندہ کردار نہیں دیکھے جو فنکاروں کیلئے تنگ پڑ جاتے ہیں۔ فنکار اُن کرداروں میں سما ہی نہیں پاتے۔

لڑکی: ہاں دیکھا ہے۔ ایسی کہانیاں دیکھی ہیں اور ایسے کردار بھی دیکھے ہیں۔ لیکن خدا کی دنیا میں جہاں فرشتے پلتے ہیں، وہاں ایک ابلیس بھی تو ہے۔ بس ہمیں اُس کو پہچاننا ہے اور رسوا کرنا ہے۔

بزرگ: یہ عمارت بھی اب خستہ ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں کب گر جائے گی۔

لڑکی: پاپا جی۔ عمارت کئی سالوں سے ایسے ہی کھڑی ہے اور جانے کتنے سال کھڑی رہے گی۔ مگر آپ دیکھو کتنے فنکار اس خستہ عمارت میں پل کر تھیٹر کے آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم اس عمارت کو گرنے نہیں دیں گے بلکہ اس کی مرمت کریں گے۔

بزرگ: اب مجھ میں وہ سکت نہیں رہی۔ میں بھی اس عمارت کی طرح خستہ ہو گیا ہوں۔ اب میں تھک گیا ہوں۔

لڑکی: آپ بے شک بوڑھے ہو گئے ہیں مگر آپ کی موجودگی ہی ہمیں قوت عطا کرتی ہے۔ آپ کی موجودگی سے ہی ہم ایک جھٹ ہیں۔

بزرگ: تمہاری باتوں سے مجھے حوصلہ ملا۔ میں اپنے اندر پھر وہی جذبہ محسوس کرنے لگا ہوں۔

لڑکی: بہت اچھی بات ہے۔ اب ہم جوش کے ساتھ اس عمارت کی پاکیزگی پھر سے بحال کریں گے، آپ دیکھنا۔ نورا اپنے حصے کا کوڑا اُٹھا کر لے گئی۔ اب ہر کوئی اپنے حصے کا کوڑا خود اُٹھائے گا۔ اور یہ گندگی ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گے۔

(سپاٹ لائیٹ گُل ہو جاتی ہے۔)

سین ۶

(دن کے اُجالے میں ٹریفک کانسٹیبل سٹیج پر پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر ٹہلتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پچھلی ونگ سے گویا تھانے سے سنتری باہر آتا ہے۔)

سنتری: ارے بھائی۔ تم کب آئے؟

ٹریفک کانسٹیبل: بھئی، میں گیا ہی کہاں تھا۔ میں تو اب دن رات خیالوں میں یہیں پڑا رہتا ہوں۔ جب سے عام شہری نے یہ نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ من کرتا ہے اس منحوس کی ہڈی پسلی توڑ کر، کہوں بائی بائی گارڈ۔

سنتری: ہاں بالکل۔ کم بخت نے پوری کی پوری مشینری اُلجھا کر رکھ دی ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: خدا کرے مہلک بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ کتا کاٹے۔ کم بخت گاڑی کے نیچے بھی نہیں آتا۔

سنتری: ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ سیدھی بات سمجھے گا نہیں۔ تو کوئی اُلٹی انگلی سے ٹھونک دے گا۔

(پچھلی ونگ سے محبوب خراماں خراماں آتا ہے)

محبوب: کیوں بھئی۔ کیا ہو رہا ہے؟

سنتری: ہونا کیا ہے صاحب۔ عام شہری نے تو سب کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔

محبوب: کہیں تھانیدار صاحب نے سرکاری دباؤ میں آکر اُس کی ایف۔ آئی۔ آر درج تو نہیں کر دی۔

سنتری: اور نہیں تو کیا۔

محبوب: جمہوریت میں یہی تو نقص ہے۔ چوہا بھی شیر بن جاتا ہے۔ ایک عام شہری نے احتجاج کی دھمکی کیا دے دی، قانون اور انصاف کے رکھوالے اپنے ہی اصول اور قاعدوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی خرابی ہے اس سسٹم میں۔

ٹریفک کانسٹیبل: کم بخت کسی کی بات بھی نہیں سنتا۔

محبوب: عام شہری ایسے ہی سر پھرے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی نہیں سنتے جب تک اُن کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی اب دائرہ تنگ ہونے والا ہے، دیکھتے جاؤ۔

(اسی وقت عام شہری پہنچ جاتا ہے۔)

عام شہری: لڑکی کا کچھ پتہ چلا؟

سنتری: وہ تو تب پتہ چل جائے گا جب تحقیقات ہوگی۔

عام شہری: تو کرتے کیوں نہیں؟

سنتری: تھانیدار صاحب آ جائیں گے تو کریں گے۔ ہم کون ہوتے ہیں تحقیقات کرنے والے۔

(تھانیدار صاحب بھی آ جاتے ہیں)

ٹریفک کانسٹیبل: لو وہ بھی آ گئے۔

محبوب: السلام علیکم۔

تھانیدار: وعلیکم سلام۔

محبوب: جناب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں اب کیا مسئلہ درپیش ہے۔ ہمیں کیوں تھانے میں طلب کیا گیا ہے۔؟

تھانیدار: اس عام شہری سے پوچھ لو۔ یہ تو اب ایف۔ آئی۔ آر درج کروا کر سارے شہر میں ہیرو بنا پھر رہا ہے۔

محبوب: تو اب یہ چاہتے کیا ہیں؟

عام شہری: میں چاہتا ہوں لڑکی جلد سے جلد برآمد کی جائے اور اُس کے معاملے میں تحقیقات ہو۔

تھانیدار: تحقیقات کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ Accused کا تو انتقال ہو چکا ہے۔

عام شہری: لیکن اگر اُن کے بارے میں پولیس خاموش رہے گی تو لڑکی کے ساتھ انصاف نہیں ہو پائے گا۔

تھاندار: تو گویا تم چاہتے ہو کہ ہم منسٹر صاحب اور کمشنر صاحب کو پوری سوسائٹی میں ذلیل کریں۔؟

عام شہری: اغوا کار سوسائٹی میں ننگے نہیں ہوئے تو لڑکی بدنام ہو جائے گی۔

سنتری: ارے بھئی، تم کہہ کیا رہے ہو۔ اُن کی موت کے بعد بھی تم انہیں ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ اپنے ساتھ ساتھ تم ہمیں بھی مشکل میں ڈال دینا چاہتے ہو۔ تم نہیں جانتے ایک منسٹر کا بیٹا ہے، دوسرا کمشنر کا۔

عام شہری: وہ لڑکی بھی کسی کی بیٹی ہے۔

محبوب: مجھے لگ رہا ہے یہ اپوزشن والوں کی سازش ہے۔ یہ معاملہ اگر میڈیا والوں کے ہاتھ لگ گیا وہ اسے ایسا بم بنا دیں گے کہ پوری ریاست میں آگ پھیل جائے گی۔

تھانیدار: وہی تو یہ عام شہری سمجھ نہیں رہا ہے۔ اگر یہ بات عوام تک پہنچی تو یہ تھانہ تو کیا پوری اسمبلی بھی اس آگ کو بجھا نہیں پائے گی۔

ٹریفک کانسٹیبل: جناب۔ یہ معاملہ تو یہیں حل ہو جانا چاہیئے، نہیں تو ہم بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے اور اگلے مہینے میں میری شادی ہونے والی ہے۔

محبوب: (عام شہری کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) دیکھو بھائی۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔ لیکن معاملہ اُلجھانے سے بہتر ہے اگر سلجھ جائے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ آپ چُپ چاپ اپنا ایف۔ آئی۔ آر واپس لے لو۔ چاہو تو میں دو ڈھائی لاکھ بھی دلا دوں گا۔

عام شہری: (کاندھے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے) بکواس بند کرو۔ مجھے پیسے کا لالچ دینے کی کوشش مت کرو۔ میں کوئی گرا ہوا آدمی نہیں ہوں۔ میں عزت دار شہری ہوں۔ تمہاری طرح ضمیر فروش نہیں ہوں۔ میں میڈیا کو جمع کر کے تمہاری پول نہیں کھول دوں تو عام شہری میرا نام نہیں۔

(عام شہری غصے میں نکل جاتا ہے)

سنتری: تعجب ہے۔ یہ تو کسی کی کوئی بات سنتا ہی نہیں ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: میں تو کہتا ہوں اب یہ ضرور میڈیا والوں کے پاس جائے گا۔

محبوب: موجودہ سیاست کہتی ہے کہ ایسا شخص جو دوسروں کے لئے خطرہ بن جائے، اسے لمبی چھٹی پر روانہ کر دینا چاہیئے، جہاں سے اس کا نام ونشان بھی نہیں ملے۔

تھانیدار: فی الحال آپ لڑکی کا موبائیل نمبر دے دو۔

محبوب: (مُسکرا کر) آپ اس کا کیا کرو گے۔

تھانیدار: یہ پوچھنا آپ کا کام نہیں ہے۔ آپ نمبر دو۔

محبوب: (اپنا فون دے کر) نمبر تو ان دیواروں پر بھی لکھا ہے۔

(تھانیدار چُپ چاپ نمبر ملا کر فون اپنے کان کے ساتھ لگا لیتا ہے اور تھوڑی دیر بعد محبوب سے مخاطب ہوتا ہے)

تھانیدار: کیا یہی نمبر ہے؟

محبوب: ہاں، بالکل

تھانیدار: آر یو شور؟

محبوب: یس۔ مجھے یہی نمبر دیا گیا ہے اور یہی نمبر ان دیواروں پر بھی لکھا ہے۔

تھانیدار: شاید اپنے آپ کو سمارٹ یا ہمیں بے وقوف سمجھ رہے ہو...... یہی نمبر ہے تو سُن لو...... (فون سپیکر پر رکھتا ہے اور تھوڑی دیر بعد آواز آتی ہے۔ یہ نمبر موجود نہیں ہے۔)

محبوب: یہی تو جواب ملے گا۔ کیونکہ آپ بھی فکشن اور ریلٹی کے بیچ کنفیوز ہو گئے ہیں۔ یہ نمبر جب ٹیلی فون دفتر کے کسی رکارڈ میں۔ ہے ہی نہیں، یہی تو جواب ملے گا۔ آپ سب شاید بھول رہے ہیں کہ ہم اس وقت ایک کہانی میں جیتے ہیں۔

تھانیدار: (اپنی غلطی پر شرمندہ ہوکر) اوہ مائے گارڈ...... میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا میں کون ہوں۔ ہاہاہاہا

سنتری: اور میں بھی اپنے آپ کو سنتری ہی سمجھتا رہا...... ہاہاہا

(محبوب کے بغیر باقی تینوں کردار قہقہہ لگاتے ہیں)

محبوب: ہم ایک ایسی کہانی میں جی رہے ہیں جس کا کوئی انجام ہی نہیں ہے اور یہ نمبر بھی اسی کہانی کا حصہ ہے، جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: شکر ہے خدا کا۔ میں تو جیسے کسی بھیانک خواب سے بیدار ہو گیا ہوں۔ اس ایف۔ آئی۔ آر نے تو میری نیند ہی اُڑا رکھی تھی۔ ڈر رہا تھا کہیں میری سگائی نہ ٹوٹ جائے۔ مشکل سے ایک رشتہ مل گیا تھا اور اب تو مجھے اُس لڑکی سے محبت بھی ہونے لگی تھی۔ اب تو جیسے بال بال بچ گیا ہوں۔

تھانیدار: اور مجھے یہ پریشانی کھائے جا رہی تھی کہ منسٹر اور کمشنر صاحب کا معاملہ میڈیا والوں کے ہاتھ لگ جاتا تو میرا پتہ نہیں کس جہنم میں تبادلہ کر دیا جاتا۔

سنتری: میں بھی اپنے کردار میں بالکل کھو ہی گیا تھا۔

محبوب: مگر میں اپنے کردار میں کہیں فٹ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ کہانی بے جان سی لگ رہی تھی۔

سنتری: کیا کہہ رہے ہو۔ یہ کہانیاں تو کئی ایوارڈ لے چکی ہیں۔ تم ہمارے کہانی کار کو چیلنج کرتے ہو؟

محبوب: اس بار تو تمہارا کہانی کار بھٹک گیا ہے اور کہانی پٹری سے بالکل اُتر گئی ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: وہ کیسے؟

محبوب: Logically تو ایف۔ آئی۔ آر کہیں لگ ہی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ میں پہلے ہی لڑکی کے وجود سے انکار کر چکا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر سرکار کے دباؤ میں ایف۔ آئی۔ آر لگ بھی گیا تو آگے کی کاروائی کیسے ہوگی۔ accused مر چکے ہیں۔ victim کا کوئی اتہ پتہ ہی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں تو ایف۔ آئی۔ آر کا کوئی مطلب ہی نہیں رہا۔

ٹریفک کانسٹیبل: لیکن میں نے تو لڑکی دیکھی ہے۔ میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔

تھانیدار: یس۔ دیٹ از اپوئنٹ۔ (Yes that is a point)

محبوب: مجھے تو لگتا ہے اس کہانی میں کوئی دم نہیں ہے۔ (محبوب دیواروں پر کچھ پڑھنے لگتا ہے اور مسکرا کر تھانیدار کی طرف مخاطب ہوتا ہے) یہ کہانی کہیں درج نہیں ہوگی۔ نہ اس کے کرداروں کے نام دیواروں پر لکھے جائیں گے۔

سنتری: ہاں بالکل۔ نوراتو اب نہیں آتی۔ کرداروں کے نام کون لکھے گا۔

تھانیدار: کیوں۔ وہ کیوں نہیں آتی؟

سنتری: پتہ نہیں۔ اب تو دس پندرہ دن ہوئے۔

محبوب: میری مانو تو اس کی چھٹی کرا دو۔ وہ جتنا صفائی کرتی ہے، اُس سے زیادہ لکھ لکھ کر ان دیواروں کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اب تک ہم نے جتنے ڈرامے کھیلے ہیں۔ ہر ڈرامے کے کردار اُس نے دیواروں پر لکھ ڈالے ہیں اور ہم سب کے فون نمبر بھی۔

تھانیدار: پگلی ہے بے چاری۔

ٹریفک کانسٹیبل: مجھے لگتا ہے ہمیں چائے منگوانی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے تب تک لڑکی کا بھی پتہ چل جائے گا۔

تھانیدار: ٹھیک ہے۔ بلاؤ سپاہی لونڈے کو۔

(ٹریفک کانسٹیبل نکل جاتا ہے۔ باقی سارے کردار گھبرا کر دیواروں پہ اپنے کرداروں کے نام تلاش کرنے لگتے ہیں۔ دھیرے دھیرے اندھیرا ہو جاتا ہے)

سین ٧

(شام کا وقت ہے۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا ہے جس سے سٹیج بالکل روشن ہے۔ عام شہری سائیکلو روم کے نزدیک چاند کو دیکھتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُداسی میں گم ہو جاتا ہے اور ایک آہ بھر کر ناظرین کی طرف چلنے لگتا ہے۔)

عام شہری: عجیب ذہنی اضطراب ہے اور من اُداس۔ فکروں کے ایک سمندر میں جیسے ڈوبا جا رہا ہوں۔ لیکن اُس کا پتہ نہیں چل رہا۔ تخیّل کے جیسے سارے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ آخر وہ گئی تو گئی کہاں۔ سمجھ میں نہیں آتا میرا خیال اُس تک پہنچ کیوں نہیں رہا۔ اس طرح کی بے بسی تو میں نے آج تک کبھی محسوس نہیں کی......وہ اگر اغوا کاروں کے ساتھ ہی مر گئی ہوتی، پھر تو اس کی لاش بھی مل جانی چاہیئے تھی۔ اور اگر جان بوجھ کر ڈبو دی گئی ہو تو......تو مجھے بھی ڈبو دیا جائے گا۔ نہیں، میرے ڈوب جانے سے کہانی کا رُخ ہی بدل جائے گا۔ دونوں کی بدنامی ہو گی۔

(عام شہری اسی طرح خیالوں میں ڈوبا ہے اور سائیکلو روم کے پیچھے سے لڑکی ظاہر ہو جاتی ہے۔)

لڑکی: آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

عام شہری: میں اغوا شدہ لڑکی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

لڑکی: وہ تو میں ہی ہوں۔ میں ہی تو اغوا ہو گئی ہوں۔

عام شہری: جانتا ہوں۔ لیکن میں تمہارے نہیں، اُس کردار کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو میرے ذہن میں ہے مگر مجھے مل نہیں رہی۔

لڑکی: آئی ایم سوری۔ مجھے لگا آپ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

عام شہری: پلیز ڈونٹ کنفیوز می۔ تمہیں نہیں پتہ میں کس قدر پریشان ہوں۔

لڑکی: آپ پریشان ہیں۔ یہ تو آپ کے چہرے سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن میں اس پریشانی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔

عام شہری: میرے چہرے سے کیا پتہ چلتا ہے؟

لڑکی: یہی کہ آپ بے حد پریشان ہیں۔

عام شہری: نہیں۔ اتنا بھی پریشان نہیں ہوں۔ میں بس اُس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو اغوا ہوگئی ہے۔ مجھے میری کہانی کی فکر ہے اور کچھ نہیں۔

لڑکی: میں بھی اُسی لڑکی کے بارے میں بات کر رہی ہوں جو اس وقت آپ کو مل نہیں رہی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ مر گئی ہو۔

عام شہری: کیسے؟...... کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ اغوا کاروں کے ساتھ مر گئی۔؟

لڑکی: ہوسکتا ہے، اُس سے پہلے؟

عام شہری: پہلے کب؟

لڑکی: یہی دس پندرہ روز پہلے۔

عام شہری: مطلب؟

لڑکی: مطلب...... جب آپ نے مجھے پہلی بار اُس بس سٹاپ پر دیکھا۔

عام شہری: تم اُس وقت مر گئی تھی تو بس سٹاپ پر کیا کر رہی تھی؟

لڑکی: میں اپنے عاشق کا انتظار کر رہی تھی تا کہ اُس سے بدلہ لے سکوں۔

عام شہری: کیسا بدلہ؟

لڑکی: اپنے مرنے کا

عام شہری: کیا اُس نے تمہیں مارا؟

لڑکی: اُسی نے مجھے مرنے کے لئے مجبور کیا۔ میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر۔ محبت کے نام پر میرا استحصال کر کے میری آبرو کو اپنی ہوس کا شکار بنا کر۔ مجھے اپنے غریب ماں باپ کی عزت بچانے کے لئے مرنا پڑا اور میرے ماں باپ نے اُف کئے بغیر مجھے دفن کر دیا۔ تا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ لیکن میں مر نہ سکی۔ میری روح بھٹکتی رہی تا کہ اپنی موت کا بدلہ لے سکوں۔

عام شہری: نہیں۔ میری کہانی کا ایسا بھیانک انجام نہیں ہو سکتا۔ تم جاؤ یہاں سے۔ میرا دماغ خراب مت کرو۔

(لڑکی چُپ چاپ نکل جاتی ہے اور عام شہری کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ وہ سٹیج پر اِدھر اُدھر پھرتا رہتا ہے جب تک اندھیرا ہو جاتا ہے۔)

سین......۸

(دونوں لفنگے پچھلی ونگ سے مایوس حالت میں چلے آتے ہیں)

لفنگہ ۱: اب کیا سوچ رہے ہو؟

لفنگہ ۲: اب سوچنا کیا ہے۔ تمہیں اب بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اِنہوں نے کیسا دھوکہ کیا۔

لفنگہ ۱: ہاں، دھوکہ تو کیا۔ لیکن ہم زندہ بھی تو ہو سکتے ہیں۔

لفنگہ ۲: ارے بے وقوف۔ تھانیدار صاحب نے جو کہا تم نے سُنا نہیں؟ ہماری لاشوں کی شناخت بھی ہو چکی ہے۔ ہمارے رول ختم۔

لفنگہ ۱: پھر تو ہمارے ساتھ مذاق ہی ہو گیا۔

لفنگہ ۲: مذاق نہیں۔ انہوں نے ہماری توہین کی ہے۔ ہم جیسے ہونہار اور تجربہ کار فنکاروں کو دو ڈائیلاگ دے کر چلتا کر دیا۔

لفنگہ ۱: لیکن انہوں نے تو کہا تھا ہم ڈرامے میں ولن ہیں۔

لفنگہ ۲: کہا تو تھا۔ مگر ہیروئن کو ہاتھ تک لگانے نہیں دیا۔ اب تم ہی بتاؤ۔ ولن ایسا ہوتا ہے؟

لفنگہ ۱: وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔

لفنگہ ۲: اسی لئے میں انہیں رول واپس دے رہا ہوں۔ تمہیں رول کرنا ہے تو کرو۔

لفنگہ ا: نہیں۔ میں بھی رول واپس کروں گا۔

(تھوڑی دیر بعد الہڑ نوجوان ویسے ہی گیٹ اَپ میں چائے کے تین گلاس لے کر آتا ہے۔)

الہڑ نوجوان: کیوں بھئی۔ یہ لوگ کہاں گئے؟

لفنگہ ۲: ہمیں کیا معلوم تم کن لوگوں کو ڈھونڈھ رہے ہو۔

الہڑ نوجوان: یہاں تین اداکار تھے جنہوں نے چائے منگوائی۔

لفنگہ ا: ہم تو وہی ہیں۔

لفنگہ ۲: ہاں بالکل۔ ہم بھی تو اداکار ہیں۔ ہم بھی چائے کا حق رکھتے ہیں۔

(نوجوان کا موبائل فون بجتا ہے اور وہ چائے کے گلاس نیچے رکھتا ہے۔ وہ فون اینٹنڈ کرنے لگتا ہے اور لفنگے ایک ایک گلاس اٹھا کر پینے لگتے ہیں۔)

الہڑ نوجوان: Hello, who is that؟...... یار میں کس کس کا نمبر یاد رکھوں۔ کم آن۔ اوپن اپ؟...... اوو۔ ٹُونکل۔ مائے سویٹی...... سوری بے بی۔ آئی ایم ٹو بیوزی بائے گارڈ۔ میں اس وقت تھیٹر میں ہوں...... سنیما نہیں، تھیٹر۔ جہاں ڈرامے کھیلے جاتے ہیں...... او میڈم۔ Mind your language میں کوئی ایسا ویسا نہیں۔ ایک بارن ایکٹر ہوں...... او۔ کے۔ تم دس منٹ انتظار کرو۔ میں بیس منٹ میں پہنچ جاتا ہوں...... تب تک تم ریسٹورنٹ میں بیٹھو۔ آلیس کریم کھاؤ۔ بٹ پلیز۔ برگر مت کھانا...... برگر کھا کھا کر تم ذرا موٹی ہوگئی ہو۔ اینڈ یو نو۔ آئی ڈونٹ لایک فیٹی گرلز...... او کے بے بی۔ لو یو۔

(یہ لڑکا فلائینگ کِس مار کر چائے کا تیسرا گلاس اٹھا کر پینے لگتا ہے۔)

الہڑ نوجوان: اب بتاؤ۔ آپ کو میری ایکٹنگ کیسی لگی؟

لفنگہ ۱: یہ آپ ایکٹنگ کرر ہے تھے؟

الہڑ نوجوان: ارے یار۔ یہ تو میں نارمل فون کر رہا تھا۔ میں ڈرامے کا پوچھ رہا ہوں۔ اوپننگ میں ہی تو میری اینٹری ہے۔

لفنگہ ۲: اچھا وہ......وہاں بھی تو آپ فون ہی کرتے ہو۔

الہڑ نوجوان: وہی تو۔ سر نے کیا رول لکھا ہے میرے لئے۔

لفنگہ ۲: ارے رہنے دو۔ وہ بھی کوئی رول ہے۔ رول تو ہم نے بمبئی میں کئے ہیں۔ تالیوں سے پورا ہال گونجتا تھا۔

الہڑ نوجوان: تم بمبئی گئے ہو؟

لفنگہ ۱: لو۔ ہم تو وہاں تین سال رہ کر آئے ہیں۔

الہڑ نوجوان: سچ؟۔ وہاں تین سال کیا کرتے رہے؟

لفنگہ ۱: وہاں کیا کرتے ہیں۔ فلموں میں ہی تو کام کرتے ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں

الہڑ نوجوان: کون کون سی فلم میں کام کیا ہے؟

لفنگہ ۲: بہت ساری فلموں میں کام کیا ہے۔ اب تو ان کا نام بھی یاد نہیں۔ کچھ تو فلاپ بھی ہو گئیں۔ اور فلاپ فلموں کا نام کون یاد رکھتا ہے۔

الہڑ نوجوان: پھر واپس کیوں آ گئے؟

لفنگہ ۲: اس کو تھیٹر میں کام کرنے کا شوق ہو گیا۔ لیکن یہاں کوئی خاص عزت نہیں ملی۔

الہڑ نوجوان: کیوں؟

لفنگہ ۱: کیا یار۔ دو چار ڈائیلاگ دے کر ہمارا رول ہی گول کر دیا۔ ہمیں جہلم میں ڈبو دیا۔

الہڑ نوجوان: نہیں نہیں۔ ایسا مت کرو۔ آپ لوگ کہانی کار سے ملو۔ وہ جہلم سے نکال دیں گے۔

لفنگہ ۲: لیکن ہم تو مر چکے ہیں۔ ہماری لاشیں بھی شناخت ہو چکی ہیں۔

الہڑ نوجوان: کہانی کار کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو زندہ کر دے یا آپ کی روحوں سے کام کروائیں۔ آپ مل تو لو......

(الہڑ نوجوان گلاس ٹرے پر اٹھا کر واپس چلا جاتا ہے۔ لفنگے سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔)

لفنگہ ۲: لگتا ہے اس نے صحیح مشورہ دیا۔ ہمیں کوشش کر لینی چاہئیے۔

لفنگہ ا: چلو

(دونوں لفنگے بھی چلے جاتے ہیں۔ سٹیج خالی رہ جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد بزرگ لمبا جاڑو ہاتھ میں لے کر اطمینان سے صفائی کرتا ہوا سٹیج پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ پچھلی ونگ سے تھانیدار، ٹریفک کانسٹیبل، پولیس سنتری آتا ہے)

تھانیدار: ارے پاپا جی، یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ تو ہم سب کے استاد ہیں۔ آپ اس طرح جاڑو ہاتھ میں لے کر صاف صفائی کریں گے۔ یہ تو ہمارے لئے شرم کی بات ہے۔ لائیے یہ جاڑو مجھے دیجئے......

بزرگ: اپنے گھر کی صفائی کرنے میں کوئی شرم نہیں۔

ٹریفک کانسٹیبل: لیکن آپ ہمیں بھی تو بتا سکتے تھے۔

بزرگ: میں کیوں بتاتا، آپ لوگوں کو خود یہ احساس نہیں تھا؟

تھانیدار: بالکل۔ یہ ہماری لاپرواہی ہے۔

سنتری: ویسے ہماری بھی کوئی غلطی نہیں ہے۔ نورا تو آتی تھی صفائی کرنے۔ پتہ نہیں کئی دنوں سے کیوں نہیں آتی ہے۔

بزرگ: وہ پگلی ہے۔ اس پر کیا بھروسہ ہے۔ جب من کرے، تب آئے گی۔

تھانیدار: اور کوئی پوچھنے والا بھی تو نہیں ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: دراصل وہ ہم سب کو پیاری ہے نا۔ اسی لئے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ پاپا جی تو بالکل بیٹی کی طرح رکھتے ہیں۔

سنتری: بالکل۔ ورنہ اتنی چھوٹ کسے ملتی ہے۔ ہر وقت سب کو تنگ کرتی رہتی ہے اور جتنا صفائی کرتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تو کانگڑی کے کوئلے سے ان دیواروں کو گندا کر دیتی ہے۔

(اسی کے ساتھ سنتری جیب سے رومال نکال کر دیواروں کی صفائی کرنے لگتا ہے۔)

تھانیدار: نہیں۔ یہ کام ایسے نہیں ہوگا۔ تم بازار جا کر ایک بڑا سا کپڑا لے آؤ۔ (جیب سے پیسہ دیتے ہوئے) اور ساتھ میں ایک بالٹی اور ایک مگ لے آؤ۔

ٹریفک کانسٹیبل: میں تو کہتا ہوں نورا کی چھٹی کر دیتے ہیں۔ آج سے ہم خود صفائی کیا کریں گے۔

سنتری: (جاتے ہوئے) ہاں، بالکل۔

تھانیدار: وہ سب تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم جلدی سے سامان لے کر آؤ۔

(سنتری نکل جاتا ہے اور عام شہری آ جاتا ہے)

عام شہری: واہ۔ یہ ہوئی نا بات۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ گرد و نواح صاف ہو تو خیالات بھی پر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ اس گندگی سے تو جمود سا آ گیا تھا۔ انسان کچھ سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔

بزرگ: مگر گندگی تو ہمارے اندر ہے۔ جب تک وہ دور نہیں ہوتی جمود رہے گا۔

عام شہری: آج ہم گرد و نواح کی صفائی کریں گے۔ کل سے ایک نئی کہانی شروع ہوگی۔

تھانیدار: نئی کہانی؟۔ جو کہانی شروع کی ہے اس کا کیا کرو گے؟

عام شہری: وہ کہانی اس قدر الجھ گئی ہے۔ اب سلجھنا مشکل ہے۔

تھانیدار: ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس کہانی کے پیچھے ہم سب نے محنت کی ہے۔ وہ کہانی تم بدلنا چاہو گے۔ کردار تو نہیں بدلیں گے۔ کردار تو ہمارے اندر رلین ہو گئے ہیں۔

عام شہری: کہانی بدل جاتی ہے تو کرداروں کو بھی بدلنا ہوگا۔

بزرگ: کوئی کیسے اپنا کردار مار سکتا ہے۔ وہ تو سراسر قتل ہو جائے گا۔ ہر کردار جو ایک بار تخلیق ہوتا ہے، اُسے اپنے انجام تک پہنچنا ہی ہوگا۔ بیچ رستے میں چھوڑ دیتے ہیں تو وہ کہانی کار کا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔

عام شہری: (قہقہہ لگاتا ہے) ہاہاہا۔ یہ کیسی بات کہہ دی آپ۔ کہانی کار کے اپنے ہی کردار اُس کا گریبان پکڑ لیں گے۔

یہ تو میں پہلی بار سُن رہا ہوں۔

بزرگ: یہ بات تمہیں ہضم نہیں ہوگی۔ کیونکہ تم ایک نامور کہانی کار ہو۔ تمہاری ہر کہانی ایک شاہکار ہےجس دن کوئی کہانی انجام سے پہلے الجھ جائے گی، اس دن سمجھ میں آجائے گا نامکمل کہانی کے کردار کس طرح عقرب اور مار بن کر تمہاری گردن سے آویزاں ہو جائیں گے۔

عام شہری: (حقیقت سے منکر ہونے کی کوشش) غلط...... بالکل غلط۔ یہ ایک بے ہودہ خیال ہے۔ میں...... میں اس خیال کو نہیں مانتا۔

بزرگ: میں نے ایک عمر تھیٹر کرتے گزاری ہے۔ میں نے ایسے کئی حادثے دیکھے ہیں۔

عام شہری: لیکن میں نے آج یہ پہلی بار سُنا ہے۔ میں کیسے مان لوں گا۔

بزرگ: جس دن اس کا تجربہ ہو جائے گا۔ اپنے آپ مان جائیں گے۔

عام شہری: میں سب کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ کل جب میری نئی کہانی منظرِ عام پر ہوگی آپ اپنے بے ہودہ خیال پر نادم ہوں گے اور میری کل کی کہانی بھی ایک شاہکار ہوگی، یہ چلینج دے کر جاتا ہوں۔

(عام شہری جوش اور جذبے کے ساتھ نکل جاتا ہے)

تھانیدار: پاپا جی۔ ہم نئی کہانی پر کام نہیں کریں گے۔

بزرگ: نئی کہانی جب تیار ہوگی۔ تب دیکھا جائے گا۔

تھانیدار: پھر تو ہم کردار بنا سکرپٹ کے بھی کہانی کو انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔

بزرگ: ہو سکتا ہے۔

(سنتری صفائی کا سارا سامان لے کر آتا ہے۔ ہر اداکار کوئی نہ کوئی آلہ اٹھا کر صفائی کا ابھیان شروع کرتا ہے اور ایسے میں پردہ گر جاتا ہے۔)

سین 9

(پردہ اُٹھتا ہے۔ سٹیج پر لڑکی کاغذ کے کچھ اوراق ہاتھ میں لے کر گویا سکرپٹ یاد کرتے ہوئے ادھر ادھر پھرتی ہے اور تھوڑی دیر بعد محبوب پہنچ جاتا ہے۔)

محبوب: کیوں میڈم۔ آپ ابھی تک وہی سکرپٹ یاد کر رہی ہیں۔؟

لڑکی: یاد تو کر چکی، اب یوں ہی ورق گردانی کر رہی ہوں۔

محبوب: اب یہ سکرپٹ بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔

لڑکی: کیوں؟

محبوب: اب یہ سکرپٹ رد ہو گیا ہے۔ کہانی کار اب نئی کہانی پر کام کر رہا ہے۔

لڑکی: میں کیسے مانوں۔ میں تو اپنے کردار سے مطمئن ہوں۔

محبوب: تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم محض ایک کردار ہو اس کہانی کی۔

لڑکی: میں کسی کہانی کی کردار نہیں ہوں۔ میں اس سوسائٹی کی ہر وہ لڑکی ہوں جو محفوظ نہیں ہے جو کمزور ہے، بے بس ہے۔ لیکن زندہ رہنا چاہتی ہے۔ مجھے کسی سکرپٹ کی ضرورت نہیں ہے۔

محبوب: واہ۔ اس قدر خود اعتمادی قابلِ داد ہے۔

لڑکی: مجھے کسی کہانی کار کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ایک کہانی بھی ہوں اور اُس کہانی کی زندہ کردار بھی۔

محبوب: ویسے دیکھا جائے تو سچ ہی کہہ رہی ہو۔ تم ہی آج کل ہر گھر کی کہانی ہو۔ ہر فساد کی جڑ۔ ساری دنیا میں ہر فتنہ تمہاری وجہ سے ہے۔ انسانی تاریخ میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں ہیں، آدھی سے زیادہ تمہاری خاطر ہوئیں ہیں۔

مرد بے چارے تو مرتے ہی رہے۔

لڑکی: مرد تو اپنی ہوس کے لئے مرتا ہے۔

محبوب: محبت کو ہوس کا نام دے کر تم ہماری محبت کی توہین کر رہی ہو۔

لڑکی: ہوس کا نام بدل کر ہمیشہ عورت کو بے وقوف بناتے رہے ہو۔

محبوب: یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو؟

لڑکی: (مسکرا کر) تم سے نہیں۔ لیکن جنرلی تو ایسا ہی ہوتا ہے

محبوب: یہ عورت کی مکاری ہے۔ وہ دنیا کے ہر جرم میں شامل تو رہتی ہے۔ لیکن اُس کا الزام اپنے سر نہیں لیتی۔ خلیل جبران کہتا ہے۔ قاتل ہی مجرم نہیں ہے۔ مقتول خود بھی اپنے قتل کی سازش میں شامل ہے۔ کیونکہ وہی ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن حالات میں وہ قتل ہو جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں جو کچھ لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کے لئے ان کا فیشن اور اس کی نیوڈیٹی ذمہ دار ہے۔

لڑکی: واہ۔ کتنی صفائی سے اپنے جرم کے لئے جواز پیش کیا۔ یعنی جمہوری نظام میں بھی عورت کو اپنی مرضی کا لباس پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ مرد کی حیوانیت بھڑک نہ اُٹھے۔ وہ بے قابو نہ ہو جائے۔ شرم آنی چاہیئے ایسے مردوں کو جو ایسے خیالات اور ایسی توقعات پالتے ہیں۔

محبوب: یہ انسانی فطرت ہے۔

لڑکی: اور یہی فطرت مرد کو جابر اور عورت کو مجبور بنا لیتی ہے۔ اپنی ہوس کے لئے مرد اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ اسے نہ عورت کی جسمانی کمزوری نظر آتی ہے نہ اس کی ذہنی کمزوری۔ میرا بس چلے تو میں ایسے مرد کو سرِ عام پھانسی لگا دوں۔

محبوب: کس مرد کو؟۔ تم کس کی بات کرتی ہو؟

لڑکی: نہیں۔ میں جنرل بات کرتی ہوں۔

محبوب: نہیں، تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ شاید مجھ پر بھروسہ نہیں رہا۔

لڑکی: بھروسہ ہے۔ لیکن میں ڈرتی ہوں

محبوب: اپنے کردار سے باہر آ کر دیکھو۔ میں وہی مرد ہوں جس کی محبت کی تم قسمیں کھاتی ہو۔

لڑکی: تو سنو۔ نورا مر چکی ہے۔

محبوب: کب؟

لڑکی: یہی دس پندرہ روز پہلے۔ اُس نے اپنی نسیں کاٹ لیں تھیں۔

محبوب: کیوں؟

لڑکی: کیونکہ وہ بن بیاہی پریگنٹ تھی۔ کسی نے اسی تھیٹر میں اس کی نفسیاتی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔

محبوب: تمہیں کس نے کہا؟

لڑکی: میں نے خود اسے الٹیاں کرتے دیکھ لیا۔ میں نے اسے پوچھا یہ کہاں ہوا۔ اس نے یہاں کا نام تو لے لیا۔ لیکن اُس شخص کا نام نہیں لیا۔ پھر وہ دو دن یہاں نہیں آئی۔ تیسرے دن میں اس کے گھر گئی تو وہاں اس کی تجہیز و تکفین ہو رہی تھی۔ میں نے خود اُس کی کٹی نسیں دیکھ لیں۔

محبوب: لیکن یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟

لڑکی: کیسے بتاتی، جو بات اُس کے غریب ماں باپ نے بھی کسی کو نہیں بتائی، وہ میں تمہیں کیسے بتاتی۔ ان بے چاروں نے بھی نسیں کٹنے کی وجہ اُس کا پاگل پن بتایا۔ مگر میں جان گئی تھی۔ باولی ہو کر بھی وہ ایک عورت ہی تھی۔ جان دے دی۔ مگر بدنامی نہیں لی۔

محبوب: اس بات کی تمہارے علاوہ اور کس کو خبر ہے

لڑکی: پاپا جی کو۔

محبوب: اور کسی کو مت کہنا۔ اب تو یہی بہتر ہے کہ کسی کو کچھ خبر نہ ہو۔

لڑکی: مگر اس کا وہ قاتل ہر قیمت پر رسوا ہو جانا چاہیئے۔

محبوب: تو تم نورا کو بدنام کرو گی۔

لڑکی: لیکن اُس بے ضمیر کی پہچان تو کرنی ہے۔

محبوب: کیسے کرو گی؟

لڑکی: میں نے تمہیں کہہ دیا ہے۔ میں ایسا کھیل کھیل سکتی ہوں جس کے لئے کسی سکرپٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔
مگر تب تک تم چُپ رہنا۔ کسی کو کچھ نہیں کہنا۔
(لڑکی نکل جاتی ہے۔ محبوب وہیں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور روشنی گُھل ہو جاتی ہے۔)

سین......۱۰

(سٹیج خالی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سنتری ظاہر ہو جاتا ہے اور دیواروں کو قریب سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے پیچھے ٹریفک کانسٹیبل نمودار ہو جاتا ہے۔)

ٹریفک کانسٹیبل: کیوں میاں! اب ان دیواروں میں کیا تلاش کر رہے ہو؟

سنتری: یہ دیکھو، کچھ ہی دن پہلے کتنی محنت سے یہ دیوار دھو ڈالی تھی۔ آج پھر وہی نام اور وہی نمبر لکھ ڈالے ہیں اُس باولی نے۔

ٹریفک کانسٹیبل: کیا نورا آ گئی ہے؟

سنتری: اور نہیں تو کیا۔ یہ تو اسی سرپھری کا کام ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: لیکن میں نے تو نہیں دیکھا۔ وہ آتی کب ہے؟

سنتری: میں نے بھی کہاں دیکھا۔ میں دیکھ لیتا تو قسم سے اُس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔

ٹریفک کانسٹیبل: شاید ہم سے پہلے آ کر چلی جاتی ہے یا شاید ہمارے بعد آتی ہو۔

(اتنے میں بزرگ بھی آ جاتا ہے اور سنتری اس سے شکایت کرتا ہے)

سنتری: باباجی! یہ دیکھا آپ نے۔ نورا نے پھر ان دیواروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔

بزرگ: ہاں، دیکھ لیا۔

سنتری: آپ کچھ کہتے کیوں نہیں۔ کتنی محنت سے ساری دیواریں دھو ڈالیں تھیں۔

بزرگ: کئی بار سمجھایا۔ مگر وہ باولی کس کی بات سنتی ہے۔ جو جی میں آتا، وہی کرتی ہے۔

سنتری: نہیں، اب میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔ قسم سے ساری دیواریں صاف کروا کر ہی چھوڑوں گا۔

بزرگ: تم اسے کہاں دیکھو گے۔ وہ پہلے کی طرح تھوڑا آتی ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: کیوں؟ کہیں شادی تو نہیں کر دی؟

بزرگ: نہیں، اس کے ساتھ ٹریجڈی ہوگئی ہے۔ بے چاری کسی کو منہ نہیں دکھا پا رہی ہے۔ اسی وجہ سے کبھی صبح تڑکے آتی ہے اور ہمارے آنے سے پہلے چلی جاتی ہے۔ کبھی پھر ہمارے جانے کے بعد آتی ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل: مگر ایسا ہو کیا گیا ہے؟

بزرگ: اپنی ہی بستی میں کسی نے تیز آب چھڑکا ہے۔ سارا منہ جلا دیا ہے۔

(سب افسوس کرتے ہیں)

سنتری: اُس شخص کے خلاف تو تھانے میں ایف۔ آئی۔ آر درج کرنا چاہیئے۔

بزرگ: میں نے کہا تھا۔ لیکن وہ اس شخص کا نام ہی نہیں لیتی۔

ٹریفک کانسٹیبل: کیوں؟

بزرگ: کوئی وجہ ہوگی۔ دنیا میں ہزاروں معاملے ہوتے ہیں۔ کوئی کس کس کی وجہ ڈھونڈتا پھرے۔

(بزرگ مقابل کی ونگ سے چلا جاتا ہے)

سنتری: بے چاری۔ کتنی دکھی ہوگئی ہوگی۔ لڑکیوں کو اپنی سُندرتا کتنی پیاری ہوتی ہے۔ دیکھا نہیں، گالوں پر کتنا پاؤڈر ملا کرتی تھی۔

ٹریفک کانسٹیبل: ہونٹوں پر بھی عجیب لال رنگ کی لپ سٹک لگاتی تھی۔

سنتری: بے چاری

(سپاہی اور ٹریفک کانسٹیبل افسوس کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔)

(دھیرے دھیرے روشنیاں گھل ہو جاتی ہیں)

سین......11

(اندھیرے سٹیج پر ایک سپارٹ لائٹ روشن ہو جاتی ہے جس کی روشنی میں تھانیدار اور محبوب بیٹھا ہے۔ دونوں کے سامنے شراب کے گلاس ہیں۔)

تھانیدار: کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔

محبوب: نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔

تھانیدار: کچھ تو ہے۔ تم کئی دنوں سے تھیٹر بھی تو نہیں آتے ہو۔

محبوب: وہاں کرنے کو اب رہ کیا گیا۔

تھانیدار: سو تو ہے۔ پھر بھی ایک دوسرے سے ملاقات تو ہوتی تھی۔

محبوب: سچ مانو، اب وہاں جانا بھی اچھا نہیں لگتا۔

تھانیدار: پھر کیا ارادہ ہے۔ تم یوں ہی بیکار بھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی دوسرا تھیٹر جوائن تو نہیں کیا ہے۔

محبوب: کیا کہہ رہے ہو۔ پاپا جی کا تھیٹر چھوڑ کر کوئی دوسرا تھیٹر کیسے جوائن کرے گا۔ جو عزت فنکار کو پاپا جی کے تھیٹر میں ملتی ہے، وہ اور کہاں۔ وہ ہر فنکار کو اولاد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہم نے بھی اداکاری ان سے سیکھی ہے۔ مگر اب سننے میں آیا ہے کہ وہ بھی بے دل ہو گئے ہیں۔ وہ تھیٹر ہمیشہ کے لئے بند کر کے تھیٹر بلڈنگ کسی ساہوکار کو کرایہ پر دے رہا ہے۔

تھانیدار: نہیں یار۔ تم نے غلط سنا ہے۔ پاپا جی کو اگر تھیٹر بند کرنا ہوتا تو نورا کو پھر سے کام پر کیوں رکھتا۔

محبوب: نورا پھر کام پر آئی ہے؟

تھانیدار: میں نے تو نہیں دیکھا۔ مگر کہتے ہیں صبح شام آجاتی ہے۔

محبوب: جھوٹ...... یہ جھوٹ ہے۔ وہ اب نہیں آسکتی۔

تھانیدار: کیوں؟

محبوب: کیوں کہ وہ مر چکی ہے۔

تھانیدار: کیا کہہ رہے ہو۔نورا مر چکی ہے؟

محبوب: ہاں۔

تھانیدار: تعجب ہے۔وہ مرگئی ہے تو دیواروں پر پھر سے کون لکھنے لگا ہے؟

محبوب: کیا مطلب؟

تھانیدار: ہم نے تو ساری دیواریں دھوڈالیں تھیں۔پھر اُن دیواروں پر پھر سے وہ نمبر اور نام کون لکھ رہا ہے۔کہیں نورا کی روح تو نہیں......

(محبوب پوری بوتل اٹھا کر منہ میں انڈیل دیتا ہے اور سپارٹ لائٹ گُل ہوجاتی ہے)

سین......۱۲

(شام کا وقت ہے۔تھوڑی دیر میں کہیں سے ایک جوان لڑکی منہ چھپائے جاڑو ہاتھ میں لے کر سٹیج کی صفائی کرنے لگتی ہے۔پھر اچانک جاڑو چھوڑ کر دیواروں پر لکھنے لگتی ہے۔تھوڑی دیر بعد عام شہری نورا کی آمد سے خوش ہوکر آتا ہے۔)

عام شہری: نورا۔اری پگلی۔تم اس طرح منہ چھپائے یہاں چھُپ چھُپ کر کیوں آتی ہو۔کیا تم سمجھتی ہو تمہارا منہ جل گیا ہے۔تم بدصورت دِکھتی ہوگی۔اری پگلی، ایسا نہیں ہے۔عورت کی خوبصورتی اُس کے چہرے سے نہیں، اس کے عورت ہونے کے احساس میں ہے۔اس کے تن کے ایک ایک انگ میں ہے۔جسم کے ایک ایک لمس میں، اس کی بوٗ میں ہے۔(اچانک عام شہری اس عورت کے نزدیک پہنچ کر رُک جاتا ہے)......نہیں، تم نہیں ہو۔

لڑکی: کیوں؟۔میں کیوں نہیں؟

عام شہری: کون ہو تم؟

لڑکی: نورا

عام شہری: نہیں۔تم نورا نہیں ہوسکتی۔میں اس کے جسم کی بوُ پہچانتا ہوں۔ میں دھوکہ نہیں کھا سکتا۔

لڑکی: سچ کہا۔تم دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ کیونکہ میں نورا نہیں۔اس تھیٹر کی ایک فنکار ہوں جس کے ساتھ صبح سے شام تک کام کرنے کے باوجود تم اُس کے جسم کی بوُ پہچان نہیں سکتے۔لیکن صفائی کرنے والی ایک باولی لڑکی کے میلے کچیلے چیتھڑوں میں لپٹے جسم کی بوُ پہچاننے میں دھوکہ نہیں کھاسکتے۔

عام شہری: یہ سب کیا ہے؟

لڑکی: منٹو کا فارمولا۔

عام شہری: منٹو کا فارمولا؟۔اس کا کیا مطلب کیا ہے۔؟

لڑکی: کیونکہ ہم جانتے ہیں منٹو مرا نہیں ہے۔آج بھی کسی منٹو کو اُس بوُ کی تلاش ہوگی جو جاڑو پونچھا کرنے والی کسی غریب باولی لڑکی کے جسم سے آتی ہوگی۔ خاک اور تیل کی ملی جلی بوُ۔منٹو جانتا تھا ہر عورت کے جسم سے ایک خاص مہک آتی ہے جو وہی مرد پہچان لیتا ہے جو اُس عورت کے بہت پاس گیا ہو۔ ایک شوہر کی طرح۔

عام شہری: (بوکھلاہٹ میں) لیکن یہ فارمولا مجھ پر کیوں آزمایا جا رہا ہے؟

بزرگ: (کہیں سے ظاہر ہو جاتا ہے) کیونکہ نورا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

عام شہری: (گھبرا کر) کیا؟

بزرگ: وہ کنواری تمہارے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

(اب مختلف ونگوں سے سارے کردار ایک ایک کر کے ظاہر ہو جاتے ہیں اور عام شہری کو آہستہ آہستہ گھیر لیتے ہیں)

محبوب: وہ باولی بھی آخر ایک عورت ہی ثابت ہوئی جس نے جان دے دی۔لیکن بدنامی نہیں سہی۔

عام شہری: نہیں۔

تھانیدار: اُس باولی نے اپنی نسیں کاٹ لیں۔مگر اپنی زبان پر تمہارا نام نہیں لیا۔

عام شہری: اُف میرے خدا۔

(عام شہری کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔سارے کردار دھیرے دھیرے اس کے گرد گھیرا ڈالتے ہیں۔جب گھیرا تنگ ہو جاتا ہے تو عام شہری خدا کو پکارنے لگتا ہے۔تب اوپر سے پھانسی کا پھندا گرنے لگتا ہے۔عام شہری اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو یہ بھی پہنچ سے دور معلوم ہوتا ہے۔یہاں سب منجمد ہو جاتے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے۔)

............☆☆☆............

☆......آنند لہر

سرحد کے پیچھے

اسٹیج سے پردہ اٹھتا ہے۔ کچھ لوگوں کے پھٹے پرانے کپڑے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک طرف کچھ درختوں کی ٹہنیاں، دوسری طرف پھٹے پرانے کپڑے اور ایک ٹوٹا ہوا برتن۔ ایک کردار جس نے انتہائی بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے ہیں، کھڑا ہو کر ان ٹہنیوں پر تھوک رہا ہے۔ اتنے میں ایک دوسرا کردار اسٹیج پر آتا ہے۔

دوسرا کردار: رام۔رام۔رام

(مگر پہلے والا کردار تھوکتا ہی جاتا ہے اور اس کی طرف نہیں دیکھتا)

دوسرا کردار: رام۔رام

پہلا کردار: حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔

دوسرا کردار: رام۔ رام، میری طرف حیرانی سے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں موہن ہوں تمہارے بچپن کا دوست۔

رام: اب کیا لینے آئے ہو۔ جاؤ لڑو، فساد کرو، لوٹ مار کرو، دوشیزاؤں کی عزت لوٹو۔ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو۔

موہن: یہ کیا کہہ رہے ہو۔

رام: وہی کہہ رہا ہوں جو کہنا چاہیئے۔

موہن: رام اس بربادی کو آبادی میں بدلنا ہے۔

رام: سب کچھ تو تباہ ہو گیا ہے، برباد ہو گیا۔

موہن: کچھ بھی تباہ نہیں ہوا۔ تعمیر جب مرضی اور جہاں سے مرضی شروع کرو۔

رام: اور بربادی؟

موہن: وہ شروع ہو گئی مگر ایک دن اسے ختم ہونا ہوتا ہے اور ایک نئی آبادی کو جنم لینا ہوتا ہے۔

رام: قبرستان سے باہر آ کر موت کو شرمندہ کروں؟

موہن: ایسا کیوں سوچ رہے ہو۔

رام: زندگی تو پہلے ہی شکست کھا چکی ہے۔ میں اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔

موہن: رام ابھی زندگی میں بہار باقی ہے۔

رام: مگر وہ بہار تو خزاں کے قبضے میں ہے۔

موہن: رام مگر،

رام: تم ہی موہن ہو میرے دوست، میں جان گیا ہوں۔

موہن: ہاں ہاں رام تمہارے بچپن کا دوست (پھر رام اور موہن آپس میں گلے ملتے ہیں)

موہن: یہ سب کیسے ہوا؟

رام: میرا گریباں چاک ہے یہاں۔ میری سانسیں بھی پریشان ہیں۔ (اپنی قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے)

رام: دیکھو موہن! اچھی طرح دیکھو، میرا گریباں چاک ہے۔ میں پوچھتا ہوں ہم سرحد پر کیا اس لئے لڑتے ہیں تاکہ سرحد کے پیچھے بیٹھے لوگ ملاوٹ کر سکیں، دوشیزاؤں کی عزت لوٹ سکیں، بچوں کو یتیم کر سکیں، فساد کر سکیں۔ ایسی دنیا سے تو میرے لئے یہ ویرانہ ہی اچھا ہے۔

موہن: مگر یہ ہوا کیسے؟

رام: موہن تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا۔

موہن: ہاں ہاں۔

(پردہ گر جاتا ہے اور شہنائی بجنے کی آواز آتی ہے۔ پھر شادی کے گانوں کی آواز پھر ڈھول بجنے کی آواز پر بھانگڑے کی آواز)۔

(پردہ اٹھتا ہے شادی کا منڈپ سجا ہوا ہے، پنڈت جی منتر پڑھ رہے ہیں۔ ہون کنڈ میں آگ جل رہی ہے)۔

پنڈت جی: کنیا دان کا وقت آ گیا ہے۔

(اتنی دیر میں ایک دلہن کو وہاں پر سجا کر لایا جاتا ہے۔ وہ دولہے یعنی رام کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ پھر منتروں کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر تک منتروں کا اچارن جاری رہتا ہے۔ پھر دولہا اور دولہن ہون کنڈ میں جلتی ہوئی آگ کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ عورتیں سہاگ گاتی ہیں۔

اتنی دیر میں اچانک رحیم رام کے کان میں کانا پھوسی کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

رام: یہ کیا کہہ رہے ہو رحیم؟

رحیم: ہاں بھائی، یہ سچ ہے۔

رام: تو پھر میں بھی چلوں گا۔

رحیم: نہیں رام۔

رام: نہیں رحیم، یہ ملک کی عزت کا سوال ہے۔

رحیم: میں جو ہوں جان دینے کے لئے۔

رام: مگر میرا بھی کچھ فرض ہے۔

رحیم: لیکن۔ رکو رام۔

رام: میں اب نہیں رک سکتا۔ اب جبکہ ملک پر حملہ ہو گیا ہے۔

رحیم: اچھا رام تم سہاگ رات کے بعد آ جانا۔

رام: جب موت کے ساتھ تم لوگ سہاگ رات منا رہے ہو گے تو میں کیسے بیوی کے ساتھ سہاگ رات منا سکتا ہوں؟

(دلہن کا نام کرن ہے)

رام: کرن۔

کرن: آپ جائیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی اور یہ دعا کروں گی کہ آپ جنگ جیت کر آئیں۔

رحیم: رام۔

رام: بولو رحیم۔

رحیم: مگر جنگ کا دوسرا نام موت ہے۔

رام: ہم اکٹھے ہی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہماری موت اکٹھی ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔

(رام اور رحیم وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ پردہ گر جاتا ہے۔ پھر آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ بموں کی آوازیں، توپوں کی آوازیں، ٹینکوں کی آوازیں، ہر طرف ایک شور مچ جاتا ہے۔ پھر چیخوں کی آوازیں۔ ہر طرف آوازیں ہی آوازیں۔ فوجی بینڈ کی دھنوں کی آوازیں۔ پردہ اٹھتا ہے۔ جنگ ہوتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ کچھ سپاہی دوسروں پر حملہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں)۔

رحیم: (جو کہ زخمی حالت میں ہے) رام

رام: بولو رحیم (گولیاں چلاتے ہوئے) میں ان سب کو مار کر ہی دم لوں گا۔

رحیم: میرے ہوتے ہوئے دشمن کے ناپاک قدم کسی بھی صورت میں اس زمین پر نہیں آ سکتے۔

رام: یا تو جنگ جیت کے گھر جائیں گے، نہیں تو موت کو گلے لگائیں گے۔

(پھر دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں)۔

رحیم: رام، تم دشمن کو ادھر سے روکو میں ادھر جاتا ہوں۔

رام: مگر تم اکیلے۔

رحیم: ہمارے ساتھ کے کئی لوگ مارے جا چکے ہیں اور باقی خطرے میں ہیں۔ یہ وقت باتوں میں الجھنے کا نہیں بلکہ کچھ کرنے کا ہے۔

رام: مگر۔۔۔۔

رحیم: ہم یہ پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں یا جنگ جیت کر جائیں گے یا یہیں سرحد پر مر جائیں گے۔

رام: رحیم۔

رحیم: رام مجھے جانے دو اور تم ادھر دشمنوں کو روکو۔

رام: نہیں تم اکیلے مت جاؤ۔ وہاں پر کافی دشمن ہیں۔

رحیم: تم پرواہ مت کرو، میں اکیلا ہی مر جاؤں گا۔

رام: میں تمہیں اکیلا نہیں مرنے دوں گا۔

رحیم: میں جا رہا ہوں۔

رام: رکو۔ رحیم رکو۔

رحیم: نہیں اب مجھے روکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

(گولیاں چلنے کی آواز آتی ہے اور ہر طرف شور مچ جاتا ہے)۔

رحیم: میرا جسم چاہے چھلنی ہو جائے مگر میں تمہیں آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ قطعاً آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔

(پردہ گرتا ہے)

(پردہ اٹھتا ہے)

(ایک دفتر کے باہر ایک سپاہی بیٹھا ہوا ہے)۔

رام: (سپاہی سے) مجھے آفیسر سے ملنا ہے۔

(سپاہی اندر جاتا ہے اور پھر باہر آتا ہے)۔

سپاہی: تم جا سکتے ہو۔

(کمرے میں آفیسر بیٹھا ہے جس کا رینک برگیڈیر ہے۔ رام کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی آفیسر کو سیلوٹ دیتا ہے۔

آفیسر: تم ٹھیک تو ہو۔

رام: حضور میں بالکل ٹھیک ہوں مگر میرا بھائی رحیم اس جنگ میں مارا گیا ہے۔

آفیسر: تمہارا بھائی۔

رام: میرا بھائی۔

آفیسر: رحیم۔

رام: ہاں، رحیم میرا بھائی۔

آفیسر: تمہاری باتیں سن کر لگتا ہے کہ رام ہی رحیم ہے۔ اچھا تمہارے بھائی کو میرا نمسکار ہے۔ اب تم چھٹی پر جا سکتے ہو۔

رام: یہاں کوئی میرے گھر سے پیغام تو نہیں آیا۔

آفیسر: کس بات کا پیغام؟

رام: میں نے انہیں رحیم کی موت کا پیغام بھیجا گیا مگر بدقسمتی سے کوئی جواب نہ آیا۔

آفیسر: (گھنٹی بجائی) جوان وردی پہنے ہوئے اندر آتا ہے۔

آفیسر: رام کے گھر سے کوئی پیغام تو نہیں آیا ہے۔

سپاہی: نہیں حضور۔

(پردہ گر جاتا ہے اور فوج کا بینڈ بجتا رہتا ہے)۔

رام کا گھر ایک کھنڈر بن گیا ہے۔ چاروں طرف سامان بکھرا ہوا ہے۔ ایک کونے میں رحیم کی تصویر پڑی ہوئی ہے جس پر کافی گرد جمی ہے۔

رام: (چاروں طرف دیکھتے ہوئے) یہ میرے گھر کو کیا ہو گیا ہے، میرے شہر کو کیا ہو گیا ہے۔

ارے بھائی مجھے بتاؤ کیا یہ ہی میرا گھر ہے، میرا یعنی رام کا گھر ہے۔

(پھر وہ روتا ہے ہر چیز کو چومتا ہے۔ ارے بھائی، کوئی تو مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا، کیسے ہوا۔

ایک شخص: میں پہچان گیا ہوں۔ تو رام ہے مگر رحیم کہاں ہے؟

رام: رحیم جنگ میں مارا گیا مگر میرا دوسرا بھائی سمنت کہاں ہے؟

شخص: وہ فساد میں مارا گیا۔

رام: عجیب بات ہے، ایک بھائی جنگ میں مارا گیا اور دوسرا بھائی فساد میں۔ کیا ہوا یہاں؟

شخص: یہاں فساد میں لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر جلائے، ایک دوسرے کو مارا۔ فساد کئی دنوں تک ہوتا رہا۔

رام: مگر کسی نے روکا نہیں۔

شخص: نہیں۔ یہ فساد بالکل نہیں رک سکتا تھا کیونکہ فساد کو روکنے والے بھی فساد میں شامل ہو گئے تھے۔

رام: مگر ہمارے ماں باپ۔

شخص: یہاں پر کیمپ لگے ہیں شاید وہ کسی کیمپ میں ہوں۔

رام: مگر رحیم کی ماں۔

شخص: وہ بھی جھلس گئی۔ اب وہ اسپتال میں ہے۔

رام: مگر ایسا کیوں ہوا؟

شخص: ایسا کیوں ہوتا ہے، اس بات کا آج تک کسی کو علم نہیں۔

رام: یہ گھر۔۔۔؟

شخص: یہ گھر بھی باقی گھروں کی طرح جلایا گیا۔

(رام پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر گھومتا ہے۔ پردہ گر جاتا ہے اور رام کی آواز آتی ہے۔ رام کی آواز۔ ایک ٹکٹ شولہ پور کی۔)

آواز: پانچ روپئے۔

رام کی آواز: مگر ریٹ تو ساڑھے چار روپئے ہے۔

آواز: یہ لکھا ہوا ریٹ ہے اور ہر لکھی ہوئی چیز پر ضروری نہیں کہ عمل ہو۔

رام: مگر۔

آواز: فوجی یہ سول ہے۔ فوج نہیں ہے۔

رام: ہے بھگوان، یہ کیا سن رہا ہوں۔

(پردہ اٹھتا ہے۔ ایک گھر ہے۔ لوگ یوں بیٹھے ہوئے ہیں جیسے ماتم کر رہے ہوں۔ گھر کا سارا سامان بے ترتیبی سے پڑا ہوا ہے۔ کھانے کے برتن بھی بکھرے پڑے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص پردے کے ایک طرف سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)۔

بوڑھی عورت: کون؟

رام: میں رام ہوں۔

بوڑھی: کون رام؟

رام: گنیش کا دوست۔

بوڑھی: اندر آؤ۔

رام بوڑھی کے قریب جاتا ہے۔ بوڑھی اسے دیکھ کر رونے لگتی ہے اور روتے ہی رہ جاتی ہے۔

رام: ماں۔

بوڑھی: ہاں۔ بولورام۔

رام: میرے دوست گنیش کا کیا ہوا؟

بوڑھی: (روتے ہوئے) بازار سے وہ ایک دن پنیر لایا تھا۔

رام: پھر کیا ہوا؟

بوڑھی: گنیش نے اس پنیر کو بڑے شوق سے بنوایا تھا۔

رام: پھر۔

بوڑھی: دن بھر اس پنیر کا ذکر کرتا رہا۔ کیونکہ شام کو اسے کھانا جو تھا اور ہم لوگ اتنے امیر تو نہیں کہ روز پنیر کھا سکیں۔

رام: تو شام کو۔

بوڑھی: ہاں شام کو ہم نے اس پنیر کو بنایا اور پھر کھایا اور کھانے کے فوراً بعد گنیش بیمار ہو گیا۔

رام: مگر کیوں؟

بوڑھی: کیونکہ اس پنیر میں ملاوٹ تھی۔

رام: آپ اسے اسپتال نہیں لے گئے؟

بوڑھی: اسے اسپتال تو لے گئے، مگر ڈاکٹر وہاں نہ تھا۔

رام: کہاں گیا تھا ڈاکٹر؟

بوڑھی: ڈاکٹر منسٹر نے بلایا تھا، وہ وہاں گیا ہوا تھا۔

رام: پھر؟

بوڑھی: جو دوائیاں گنیش کو دی گئیں ان سے وہ اور بیمار ہو گیا۔

رام: کیا؟

بوڑھی: ہاں بیٹا۔

رام: مگر کیسے؟

بوڑھی: کیونکہ دوائیوں میں ملاوٹ تھی۔

رام: تو پھر؟

بوڑھی: وہ ملاوٹ والی دوائیاں کھانے کے بعد مر گیا۔

رام: میں عجیب باتیں سن رہا ہوں۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک لڑکی جو ادھ جلی ہوتی ہے، وہاں آتی ہے۔

لڑکی: مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔

رام: کیا ہوا ہے تمہیں؟

لڑکی: وہ میرا خاوند میرے پیچھے آ رہا ہے۔

رام: مگر اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟

لڑکی: وہ مجھے زندہ جلانا چاہتا ہے۔

رام: مگر کیوں؟

لڑکی: کیونکہ میرے ماں باپ نے مجھے جہیز کم دیا ہے۔

رام: جہیز کم دیا ہے؟

لڑکی: کم یا زیادہ نہیں بلکہ اس کے مطابق نہیں رہا تھا۔

رام: اب:

لڑکی: اب وہ مجھے جلانے کے لئے آ رہا ہے۔

رام: مگر تم نے شادی کیوں کی؟

لڑکی: کیا کبھی کوئی یہ سوچ سکتا تھا کہ انسان اتنا بھی گر سکتا ہے۔

رام: اب ہم کس کے لئے سرحد پر لڑیں اور یہاں تک کہ رحیم نے اپنی جان بھی دے دی۔

(رام اسٹیج پر ہے اور وہ تمام گھر والے بھی)

لڑکی: اچھا (یہ کہہ کر بھاگ جاتی ہے)۔

رام: ارے رکو۔

لڑکی: کیوں؟

رام: کیونکہ ہم تمہیں بچائیں گے۔

لڑکی: اب لوگوں میں دوسروں کے حق کے لئے لڑنے کی طاقت ختم ہوگئی ہے۔

رام: یہ عجیب سلسلہ ہے۔
اسٹیج پر ایک ماں اپنے بچے کو مارتے ہوئے گزرتی ہے۔

رام: ارے کیوں مار رہی ہو اسے۔

ماں: یہ اسکول میں پڑھنے کی ضد کر رہا ہے۔

رام: کس اسکول میں؟

ماں: جہاں سے اسے نکالا گیا ہے۔

رام: مگر کیوں نکال دیا گیا ہے؟

ماں: کیونکہ فیس دینے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔

رام: آزادی کے بعد بھی ایسا ہی ہے۔ بھگوان، یہ سب کیا ہے۔ یہ دنیا میرے قابل نہیں۔ اس دنیا سے شمشان گھاٹ اچھے ہیں۔ اس دنیا سے قبرستان اچھے ہیں جہاں خاموشی ہے، جہاں زندگی کا سکون ہے۔
(پردہ گر جاتا ہے۔)

رام: اس دنیا سے تو جانوروں کی دنیا اچھی ہے، پرندوں کی دنیا اچھی ہے۔
(پردہ اٹھتا ہے۔ وہ پہلے والا نظارہ۔ موہن رام سے مخاطب ہے)۔

موہن: رام باہر آؤ۔

رام: اس دنیا سے یہ شمشان بہتر ہیں، یہ قبرستان بہتر ہے۔

موہن: مگر رام۔۔۔۔؟

رام: ہاہاہا اب اگر مگر میں کچھ نہیں۔

موہن: رام، میں کہہ رہا ہوں کہ آؤ باہر چلیں اور اس دنیا کو پھر آباد کریں۔

رام: ایسا ہو سکتا ہے؟

موہن: ہر اچھا کام ہر وقت ہو سکتا ہے اور پھر جب درختوں پر سے گرے ہوئے پھول دوبارہ اگ سکتے ہیں اور پھر درخت کی ٹہنیاں از سر نو پھولوں کو جنم دے سکتی ہیں اور ساون ایک بار جا کر دوبارہ آسکتا ہے، تو ہر حال میں یہ دنیا پھر آباد ہو سکتی ہے۔

موہن: سنو رام، مندر میں گھنٹیوں کی آواز چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ قدرت آج بھی انسان پر مہربان ہے۔

پھر مسجد سے اذاں کی آواز آتی ہے۔

موہن: دیکھو رام، قدرت کہہ رہی ہے کہ خدا گناہ کو معاف کرنے کو تیار ہے، مگر اس کے قدموں میں خود کو گرانے کی ضرورت ہے۔

پھر گرجا گھر سے گھنٹے بجنے کی آواز آتی ہے۔

موہن: دیکھو رام گرجا کے اندر یہ گھنٹے کی آواز، مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز اور مسجد سے نکلتی ہوئی اذاں کی تائید کر رہی ہے۔

یہ گرجا گھر کا گھنٹہ

یہ شیو مندر سے نکلتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز۔

کو سنو۔

رام: مگر۔

موہن: جو ہو گیا سو ہو گیا، اب آگے جو کرنا ہے اس کے بارے میں سوچو۔ اجڑے گھروں کو بسانا ہے۔ ٹوٹے دلوں کو جوڑنا ہے۔

رام: ٹھیک کہا تم نے۔

موہن: باہر آؤ اور جلدی باہر آؤ۔

رام: آؤ دنیا کومل کر کہیں......

ایسا شنکھ بجا اے پنڈت
خون رگوں میں پھر سے دوڑے
ایسی بات سنا اے ملا
ٹوٹے ہیں جو رشتے جوڑے

مندر میں ہو آرتی ایسی
مسجد میں ہو ایسی اذاں پھر
پریم نگر کی ان سڑکوں پر
گنگا اور جمنا ہوں رواں پھر

گیتا کے شلوک ہوں جن میں
ایسی نمازیں ہم کو پڑھا دے
رام، محمد ایک ہوں سارے
ایسی گاتھا ہم کو سنا دے

ایسی بات سنا دے ساتھی
بچے جھولیں، جھولوں میں پھر
کلیاں گائیں، چلیں ہوائیں
آگ نہ چمکے پھولوں میں پھر

رشوت والے رشوت چھوڑیں
گھڑا پاپ کا چوک میں توڑیں
کوئی کرے نہ دیش کا سودا
ایسا لگے ایمان کا پودا

دشاسن دربار نہ ہو پھر
کوئی نہ کھینچے کسی کی ساڑی
عیسیٰ کو پھر ملے نہ سولی
مریم پوجے دنیا ساری

دھرتی کانپی، امبر ٹوٹا
کلیوں پر جب چلے ہتھوڑے
ایسا شنکھ بجا اے پنڈت
خون رگوں میں پھر سے دوڑے

پانی برسے ریگستاں میں
بھوک مٹے ہندوستاں میں
ننگے کو کپڑا پہنائیں
ہم افلاس کو دور بھگائیں

دھرم چلے دنیا میں ایسا
جس میں مندر مسجد سارے
نغمہ عشق کا مل کر گائیں
پریم کی ہر سو چلیں پھوہارے

ایسا شنکھ بجا اے پنڈت
خون رگوں میں پھر سے دوڑے
(پردہ گر جاتا ہے)

............☆☆☆............

☆......مشتاق مہدی

خواب

کردار

ا۔نور	تیس سال کی عمر کا نوجوان سنگ تراش
۲۔روحی	سنگ تراش کی خیالی محبوبہ......ایک مورتی
۳۔کاکا	نور کا گھریلو بوڑھا ملازم
۴۔بابا	بستی کا ذی عزت بزرگ

سین......ا

ایک چھوٹی سے خوبصورت پہاڑی کے سامنے پھیلا ہوا پتھروں کا ایک سلسلہ...... پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی ہَٹ ہے۔

ہَٹ کے سامنے ایک باغیچہ ہے۔

اور باغیچے میں ایک طرف......ایک جواں لڑکی کی نامکمل مورتی ہے، سنگ تراش نور......مورتی کے قریب ہی کھڑا کچھ سوچ رہا ہے۔

دور دور تک پھیلی ہوئی وادی خاموشیوں میں ڈوبی ہوئی ہے اور......سارا ماحول چاندنی میں نہایا ہوا......

نور: (اپنے آپ سے بڑبڑاتا ہوا)۔

چاندنی رات کا یہ آکاش...... یہ پُر اسرار خوشبوؤں میں ڈوبی ہوئی وادی...... یہ خاموشی......

یہ بولتے ہوئے بے زباں پتھر...... یہ مدہوش کُن منظر...... یہ سب کچھ میرا ایک خواب ہے، ایک حسین خواب......

(ایک شوخ شرارتی ہنسی پاس ہی سنائی دیتی ہے جیسے پتھر کی مورتی میں جان آئی ہو...... جیسے مورتی کے بدن سے آواز نکلی ہو...... نور مورتی کے اور قریب آتا ہے۔)

نور: تم...... روحی تم

روحی: (نور کے تصور میں...... نور کے سامنے...... ایک حقیقت سی جاگ اٹھتی ہے...... بولتی ہوئی......)

روحی: تمہارے خواب کی چاندنی...... تمہارے خواب کی ایک روشن حقیقت......

نور: مجھے احساس ہے۔

روحی: (روٹھے ہوئے لہجے میں) صرف احساس

نور: روحی احساس زندگی کی ایک مقدس صداقت ہے، میں...... میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں......

روحی: کس بات کا......؟

نور: تمہارا...... تمہاری محبت کا...... مجھ میں تمہارے جنون کا...... تمہارے بغیر میری کہانی نامکمل ہے۔ تمہارے بغیر میں خود کو...... میں خود کو ادھورا محسوس کرتا ہوں۔

روحی: جیسے یہ مورتی ابھی نامکمل ہے۔

نور: مورتی مکمل ہے۔ مجھ میں تمہارا خواب زندہ ہے اور یہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

کیا میں نہیں چاہتا...... تمہیں سراپا سامنے دیکھوں۔

تیری زلفوں کے گھنیرے سایوں میں حیات کی ساری تلخیاں بھول جاؤں...... حیات کے معنی پاؤں......

روحی: تو پھر انتظار کس کا......؟

نور: وقت کا

روحی: وقت بے رحم ہے۔

نور: ایک چہرہ ہے اُس کا......وقت کا دوسرا چہرہ معصوم ہے۔

روحی: کچھ بھی ہو......میں......میں ابھی تک ادھوری ہوں، ایک نامکمل تخلیق......

نور: روحی میں تمہیں مکمل کروں گا۔ ہاں میں تمہیں مکمل کروں گا اور اُس کے بعد......

(کاکا......نور کا ذاتی ملازم اچانک قریب آ کر کہتا ہے۔)

کاکا: چھوٹے سرکار......

نور: (چونک اٹھتا ہے)

کاکا: اٹھیئے آپ......رات گہری ہو چکی ہے۔ کھانا کھایئے۔ پھر سو جایئے۔

نور: (ایک طویل سانس لے کر)......کاکا......آج نہ معلوم میری نیند کہاں گم ہو گئی ہے۔ جاؤ تم کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔

کاکا: اور آپ......

نور: میں بس یہیں اپنی رات روحی کی آغوش میں گزار دوں گا۔

کاکا: پھر وہی روحی......چھوٹے سرکار آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ سونے کا......نہ اپنا نہ دوسروں کا......یہ روحی کون ہے۔ آخر میں بھی تو سنو......

نور: ایک دن......ہاں ایک دن کاکا تم اُسے سنو گے اور دیکھو گے بھی۔

کاکا: اچھا یونہی سہی......اس وقت تو اٹھیئے آپ......

نور: نہیں کاکا نہیں......آج کی رات تو کسی کی آمد کی رات ہے۔ کوئی میرے قریب کچھ کہہ رہا ہے۔ میں سن رہا ہوں کاکا، ہاں ہاں میں سُن رہا ہوں اُس کی آواز......

(کاکا حیران حیران سا اندر ہٹ کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ نور کے تصور میں......روحی جوگن بنی گاتی ہے۔)

جو گیا میری نندیا لوٹی
رتیاں بیتیں آس نہ ٹوٹی
جو گیا میری......
تیری تان پہ یہ من ہاری
میں دیوانی پریم کی ماری
تو جگ کا، میں جگ سے چھوٹی
جو گیا میری نندیا لوٹی......
بن بن آئی کاٹ کے رستے
نگر نگر میں پاپ ہیں ستے
کیسے بچوں میں کرموں پھوٹی
جو گیا میری نندیا لوٹی......
جوگی مو پہ تھوڑی دیا کر
آؤں کیسے بیچ سمندر
بادل کالے، ناؤ بھی ٹوٹی
جو گیا میری نندیا لوٹی......

(گیت ختم ہوتا ہے۔نور نیم مدہوش سا معصوم معصوم نظروں سے مورتی کو دیکھے جا رہا ہے...... آسماں پر چاندنی بادلوں کے ایک ٹکڑے کے سائے میں سو جاتی ہے)

Change Over

سین ۲

خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔
نور ہٹ کے سامنے باغیچے میں ہے۔اُس کے آس پاس کئی مورتیاں ہیں جو مکمل کی ہیں اُس نے......

نور کے ایک ہاتھ میں ہتھوڑا اور دوسرے ہاتھ میں چھینی ہے۔ایک نامکمل مورتی کی تخلیق میں اُس کے ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے ہیں۔ یکا یک رُک کر خوبصورت مورتی کے ادکھلے ہونٹوں کو چھو کر کہتا ہے:

نور: آج بڑی پیاری دھوپ ہے۔

روحی: (مورتی اچانک روحی کا روپ دھارن کرتی ہے۔) تمہیں پسند ہے۔

نور: ہاں...... ہر وہ چیز...... جو تمہاری طرح سُندر ہو۔

روحی: اور دوسرے رنگ کی چیزیں.......... مم...... میرا مطلب...... رات.......... بدصورتی..........

نور: اُس سے نباہ کرتا ہوں۔

روحی: کیوں......؟

نور: کیونکہ میں اس زمین پر اپنی مرضی سے نہیں آیا ہوں، یہ سب کچھ کسی اور کی تخلیق ہے...... میں...... تم...... ہم سب اسی تخلیق کا حصہ ہیں...... تماشہ بھی اور تماشائی بھی۔

روحی: لیکن کہانی اس کے آگے بھی ہے۔

نور: میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

روحی: ہر دوسری چیز پہلی چیز کی پہچان ہے۔تاریکی نہ ہوتی تو پھر روشنی کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا...... روشنی کو روشنی کہنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ اس معنی میں یہ دونوں رنگ حیات کے لئے ضروری ہیں۔خوبصورتی، بدصورتی، رات، دن......

نور: میں...... میں کب کہتا ہوں۔غیر ضروری ہیں۔ایک بات پوچھوں روحی۔

روحی: پوچھو:

نور: حیات کے پیچھے کون ہے۔

روحی: انسان......

نور: اور انسان کے پیچھے...... میرا مطلب انسان کے اندر۔

روحی: (شوخی سے) حیات

نور: (قدرے چیخ کر) تو پھر حیات کا یہ کون سا چہرہ ہے روحی...... یہ کون سا روپ ہے جو اپنے ہی رنگ سے روٹھا...... اپنے ہی رقص سے بے زار ہے کیوں روحی کیوں...... آخر کیوں...... ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جواب دو روحی......

روحی: تم...... تم چاہتے کیا ہو؟

نور: میں چاہتا ہوں...... زندگی اپنے حقیقی روپ میں سامنے آئے...... اپنی ساری کہانیوں کے ساتھ...... اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ...... اور اپنی ساری......

(نور کی بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

بابا...... بستی کا ایک ذی عزت بزرگ اپنی مخصوص چال سے چلتا ہوا...... قریب آ کر آواز دیتا ہے۔)

بابا: نور بیٹے...... کیا ہو رہا ہے۔ ارے کس سے باتیں کر رہے ہو۔

نور: (قدرے چونک کر)

آپ۔ آئیے...... بابا...... بیٹھے...... بیٹھئے نا...... آج بہت دنوں کے بعد آنا ہوا۔

بابا: (قریب ہی ایک کرسی پر بڑی شان سے بیٹھ کر)

ہاں...... کچھ کام ہی ایسے تھے...... کیا کہوں...... نور...... بستی میں شادی ہو یا کوئی اور مسئلہ...... بابا کا پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔

نور: (ہنس کر عقیدت سے) میں جانتا ہوں...... بابا...... اور یہ بھی جانتا ہوں...... ساری بستی میں آپ کا کتنا مان ہے۔

بابا: خیر...... ہٹاؤ یہ قصہ...... تم سناؤ بیٹے۔ کسی گجر رہی ہے۔ کیا ہو رہا ہے آج کل......

نور: ہونا کیا ہے بابا...... صبحوں کو شام رنگ دیتا ہوں اور پتھروں کو اُن کے نشاں...... میرا مطلب...... یہ......

بابا: مورتیاں...... تمہاری بنائی ہوئی مورتیاں بہت خوبصورت ہیں، بیٹے...... بہت سندر ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ ویسے بیٹے یہ کام تم کب سے کرتے ہو۔

نور: کچھ یاد نہیں ہے بابا...... ہوش سنبھالا تو پتھروں کا یہ عالم عجیب سا لگا۔ اپنا سا لگا۔ چھوٹے بڑے ہر قسم کے پتھر مجھے اپنی جانب کھینچتے گئے، کھینچتے گئے جیسے ان میں کسی عکس کی تلاش ہو۔ جیسے کسی دھڑکن کی پکار ہو۔ جیسے......

بابا: جیسے تمہارا خواب ہو۔

نور: ہاں بابا...... کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔

بابا: مگر نور...... یہ تمہاری زندگی کا ایک روپ ہے۔ ایک وقتی روپ...... ایک جنون...... ایک کھیل

نور: کیا مطلب......؟

بابا: تمہاری زندگی کا ایک اور روپ بھی ہے۔ وہ تمہارا اصلی روپ ہے، تمہاری اپنی ایک دنیا ہے۔ اپنے لوگ ہیں جنہیں تم بُھلا کر یہاں بیٹھے ہو بیٹے......

نور: نہیں بابا...... میں نے کوئی دنیا بھلائی نہیں ہے۔ دنیا مجھے یاد ہے اور دنیا کے لوگ بھی...... مگر سچ تو یہ ہے اُس دنیا سے زیادہ مجھے پتھروں کی یہ دنیا عزیز ہے۔ یہاں ان پتھروں میں کوئی بناوٹ نہیں...... زہر میں بجھا ہوا کوئی قہقہہ نہیں...... پیٹھ پیچھے کوئی فساد، کوئی قتل نہیں...... یہاں ان پتھروں میں سچائی ہے، حسن ہے۔ میری محبت ہے میرا فن ہے...... میرا سب کچھ ہے یہاں......

بابا: سب کچھ...... آ...... ہا...... ہا (طنزاً ہنس کر) سب کچھ ہے یہاں۔ ان پتھروں میں تمہاری ضروریات کی لاکھوں کروڑوں چیزیں جنم لیتی ہیں......؟ نوجوان...... میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ میں ڈر رہا ہوں...... پتھروں کا فریب تمہیں کہیں الجھا نہ دے۔

نور: (قدرے غصے سے) بابا میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔

بابا: میں جانتا ہوں، بیٹے۔

نور: آپ میرے فن کی توہین کر رہے ہیں۔

بابا: نہیں نور......تمہارا فن کار میری پہچان کی آنکھ میں ہے۔ میں اُس کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے اُس کے ساتھ ہمدردی ہے، محبت ہے۔ مگر......

نور: مگر کیا......؟

بابا: بیٹے ہر ایک بات حدوں کے اندر اچھی لگتی ہے۔ حدیں ٹوٹ جاتی ہیں تو سب کچھ بکھر جاتا ہے۔ ختم ہو جاتا ہے۔ میری مانو تو واپس چلے جاؤ......اپنے شہر...... اپنے لوگوں میں......تیرے اپنے تجھے بُلا رہے ہیں بیٹے......

نور: میرے اپنے مجھے بُلا رہے ہیں۔ (آہستگی سے جیسے اپنے دل میں کہہ رہا ہو)......بابا......تم نہیں سمجھو گے۔ میں اگر جاؤں تو یہاں میری اپنی کہانی مجھ سے روٹھ جائے گی۔ میری اپنی دنیا ویرانیوں کا مزار بن جائے گی۔ میری روحی مجھے پھر کبھی نہیں ملے گی......کبھی نہیں بابا۔

بابا: (نور کو خیالوں میں غرق دیکھ کر)

کیا سوچ رہے ہو نور......

نور: کچھ نہیں بابا، کچھ نہیں......(کچھ وقفے کے بعد ہٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں)۔

کاکا......کاکا......بابا آئے ہیں۔ چائے لاؤ۔

بابا: (زیرِ لب مسکرا کر)

نہیں بیٹے......میں نے چائے پی لی ہے۔ پھر کبھی۔

نور: آج نہیں تو پھر کب

بابا: کبھی سہی......اچھا......خدا حافظ......

(بابا کو جاتے دیکھ کر......نور کچھ فکر مند سا......مورتی کے قریب آ کر......اُس کی آغوش میں سر رکھ دیتا ہے......روحی اُس کے تصور میں ابھرتی ہے)۔

روحی: سنا......تم نے

نور: ہاں......سنا......زمانہ باتیں کر رہا ہے۔ کرنے دو۔

روحی: مگر زمانہ ایک سچ ہے......اور بابا......زمانے کی ایک مقدس آنکھ ہے۔ ایک تجربہ ہے۔

نور: مجھے انکار نہیں۔ بابا تیری میری کہانی سے لاکھ انجان سہی۔ لیکن اُس کی باتوں میں ایک شفیق باپ جھلکتا ہے۔ میرا اپنا باپ۔

روحی: تو پھر اُسے اُس کا بیٹا دے دو۔

نور: تم......تم چاہتی ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔

روحی: نہ چاہتے ہوئے بھی میری ایک یہی چاہ ہے۔

نور: کیا......؟

روحی: تمہاری خوشی......تمہارے اپنوں کی خوشی۔ تمہیں تمہارا اپنا شہر......اپنا گھر......

نور: اور تم......

روحی: میں تو ایک تخلیق ہوں تمہاری۔

نور: روحی تم......میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ تمہاری باتیں......

روحی: عجیب سی ہیں۔ میں تمہیں اپنے قریب بھی دیکھنا چاہتی ہوں اور اپنے سے دور بھی......

نور: روحی......آخر یہ کیسی محبت ہے۔ یہ کیسا انتظار ہے، یہ عذاب کیا ہے......

روحی: وقت......یہ وقت ہے، جس کے سامنے انسان مجبور ہے۔

نور: میں اب اور برداشت نہیں کر سکتا روحی......تم سامنے کیوں نہیں آتی ہو۔ سراپا......صرف ایک بار روحی......صرف ایک بار۔

روحی: تمہاری تخلیق ابھی نامکمل ہے......

نور: میری تخلیق...... روحی...... تم اصل میں اُسی کی تخلیق ہو جو خالق ہے۔ مالک ہے۔ تیرا بھی میرا بھی، اس سارے جہاں کا...... میں تمہیں تیرے عکس کی پہچان دے رہا ہوں یا پھر یوں کہنا چاہیئے، میں تجھ میں اپنے خواب کا عکس ڈھونڈ رہا ہوں۔

روحی: کچھ بھی ہو۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے لئے کیا ہوں۔

نور: مجھ میں تحلیل ایک کہانی...... میرے جنم کی پہلی اور آخری چیخ...... روحی تم نہ ہوتی۔ تو شاید ہی میں پتھروں کے اس نگر میں ہوتا۔

روحی: تب تم فن کار بھی نہ ہوتے۔

نور: یہ سچ ہے۔

روحی: تب تمہیں اتنے سارے لوگ بھی نہیں جانتے۔

نور: یہ بھی جھوٹ نہیں۔

روحی: تب تمہیں لوگ دیوانہ بھی نہ کہتے۔

نور: اوہ...... مجھے انکار نہیں۔ مجھے انکار نہیں۔ تمہاری ایک ایک بات سچی ہے۔

روحی: تو پھر جھوٹ کیا ہے۔

نور: مجھ میں میرا وہم......اور کچھ نہیں......اور کچھ نہیں......

جوگیا گیت کے بول فضا میں گونجتے ہیں

من پاپی کو کیا سمجھاؤ
اگن جلی میں کیسے بتاؤں
بھولے چہروں کی باتیں چھوٹی
جوگیا میری نندیا لوٹی

Change Over

سین......۳

ہٹ کے اندر ایک بڑے کمرے میں......(کمرہ ایک آرٹسٹ کا) ایک کرسی...... ایک میز...... دیواروں پر کچھ کپڑے آویزان اور کچھ مورتیاں تقریباً مکمل۔ نور کے ہاتھوں میں ہتھوڑا اور چھنی ہے اور وہ اپنے کام میں مگن ہے۔ اتنے میں کاکا چائے کی ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

کاکا: چھوٹے سرکار...... چائے رکھ دوں۔

نور: (بغیر اُس کی طرف دیکھے...... اپنے کام میں گم سا)۔ ہاں کاکا...... رکھ دے۔

کاکا: (کاکا چھوٹی سی میز پر ٹرے رکھتا ہے اور پھر چائے رکھتے ہوئے کہتا ہے)۔ بڑے صاحب کی چٹھی آئی ہے۔

نور: (کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔)

کاکا: یہ اس ہفتے میں اُن کی تیسری چٹھی ہے۔

نور: جانتا ہوں کاکا...... چٹھی میں نے پڑھ لی ہے۔

کاکا: کیا لکھا ہے......؟

نور: (کرسی پر بیٹھ کر چائے کی پیالی اٹھاتا ہوا)

وہی...... بڑے سرکار کی بڑی باتیں...... سماج ...... دولت...... لوگ...... تنگ آ گیا ہوں میں اُن کی باتوں سے......

کاکا: (شفقت سے) وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، آپ ہی کے بھلے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ آخر وہ آپ کے والد ہیں۔

نور: والد...... اس لفظ کا مجھے احترام ہے کاکا...... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کو وہ جو چاہیں، میں وہی کروں۔ میری اپنی ایک دنیا ہے۔ اپنی ایک سوچ ہے۔

کاکا: سوچوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں...... آدمی اپنا گھر اپنا شہر ہی چھوڑ دے۔

نور: کاکا......شہر چھوڑنے کی وجہ اور کچھ نہیں۔ روحی ہے، صرف روحی۔

کاکا: ہونہہ......(غصے سے) پھر وہی روحی...... جانتے ہو۔ راتوں کو جاگ جاگ کے آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ میں بڑے سرکار کو کیا جواب دوں۔ بیگم صاحبہ پوچھے تو میں کیا کہوں......

نور: (چائے کی پیالی رکھ کر) کہنا پاگل ہے، کسی کی سنتا نہیں۔

کاکا: چھوٹے سرکار......میری مانئے تو کچھ دنوں کے لئے شہر چلیں۔

نور: کیوں کاکا...... یہاں کا ماحول تمہیں اچھا نہیں لگا۔

کاکا: میری بات چھوڑیئے...... بوڑھا آدمی ہوں۔ نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ میں آپ کے لئے کہہ رہا ہوں اور ہاں......ٹھیک یاد آ گیا...... بیگم صاحبہ کی صحت بھی خدا کرے اچھی ہو۔

نور: ماں کیا ٹھیک نہیں تھی۔ جب تم شہر گئے تھے۔

کاکا: کہاں ٹھیک تھی...... بے چاری کو آپ ہی کا غم لگا ہے۔ کہتی تھیں......مرنے سے پہلے بیٹے کی شادی کرتی تو سکون سے مرتی......

نور: (ماں کے تصور میں کھو سا جاتا ہے)۔

ماں......میری اچھی ماں......

کاکا: چھوٹے سرکار......بیگم صاحبہ نے آپ کے لئے چاند سی بہو ڈھونڈ رکھی ہے۔ کہتی تھی نور کی پسند میں جانتی ہوں...... یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔

نور: کاکا......میں ماں کے لئے یہ قربانی دوں گا۔ ماں کی پسند لو میں اپناؤں گا۔

کاکا: سچ......سچ چھوٹے سرکار۔

نور: ہاں کاکا......آخر ایک ہی تو چاہ ہے امی کی......

کاکا: اور روحی......

نور: روحی عام سی لڑکی نہیں ہے وہ سمجھ دار ہے۔ اُس کی خوشی میری ہی خوشی میں ہے۔

کاکا: یہ کیسی لڑکی ہے۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

اچانک آس پاس کی بستی میں دور ایک شور سا اٹھتا ہے۔ نور چونک سا جاتا ہے۔

نور: کاکا...... یہ شور کیسا ہے۔

کاکا: چھوٹے سرکار...... بستی میں آج بہت بڑا میلا ہے۔ دور دور سے لوگ آئے ہیں۔ جائیے آپ بھی جائیے۔ دیکھ آئیے......

نور: میں بھی جاؤں...... کاکا کہاں جاؤ...... ایک میلے میں تو کھو گیا ہوں اور کس میلے میں کھو سکتا ہوں۔

(کاکا منہ بناتا ہوا نکل جاتا ہے۔)

Change Over

سین......۴

(کمرے میں ہلکا اندھیرا ہے۔)

لیکن باہر کھلی چاندنی کی روشنی کمرے کی کھڑکیوں سے داخل ہو کر...... کمرے کی ہر ایک شے کو صاف سامنے لاتی ہے۔

روحی کا بُت تخلیق کے آخری مراحل میں ہے۔

بلکہ اب مکمل ہے۔

(نور...... مورتی کے قریب فن کارانہ مسرت ہونٹوں پر لئے ہوئے ہے۔)

نور: (پُر مسرت آواز میں)

انہی تاریکیوں میں تم نے جنم لیا ہے۔

انہی تاریکیوں میں تم کہیں کھو گئی...... انہی تاریکیوں میں...... میں پھر تمہیں آج پاؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آج چاند کی چودھویں کہانی بھی ہے۔

روحی: تمہارا مطلب ہے چودھویں رات۔

نور: ہاں...... تمہاری پسند، میری پسند کتنی ایک سی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں......

کاکا: (اچانک کمرے میں داخل ہو کر) چھوٹے سرکار......

نور: (چونک کر) ہاں......

کاکا: چھوٹے سرکار......او......ہو...... یہاں اتنا اندھیرا کیوں ہے۔ بتی کیوں بجھا دی ہے۔

نور: بس یونہی کاکا...... سچ پوچھو تو اندھیرے میں چلنا اچھا لگتا ہے...... تاریکیوں میں روشن حقیقتیں بھلی لگتی ہیں...... آج...... آج میں منزل کے قریب آ گیا ہوں کاکا۔ آج میری تخلیق مکمل ہو گئی ہے۔

کاکا: چھوٹے سرکار...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں...... میں یہ کہنے آیا ہوں۔ کھانا پروس دوں۔ دوپہر میں بھی تو کچھ کھایا نہیں ہے۔

نور: کیا کہتے ہو کاکا...... دوپہر تو...... (اچانک کچھ یاد آ کر مسکرا کر) کاکا...... کتنا خیال ہے تمہیں میرا۔

کاکا: چھوٹے سرکار...... آپ کا بچپن میری گود میں کھیلا ہے۔ آپ کی جوانی میری آنکھوں کے سامنے مسکرائی ہے۔ خیال میں نہ رکھوں...... تو پھر اور کون رکھے گا۔

نور: ہاں...... یہ بات تو ہے۔

کاکا: تو پھر آپ اٹھیئے نا۔

نور: نہیں کاکا...... آج مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ آج مجھے خاموشی چاہیئے۔ مکمل خاموشی...... تم جا کے کھانا کھاؤ اور سو جاؤ......

کاکا: مگر چھوٹے سرکار......

نور: کاکا...... میں جو کہتا ہوں۔ وہ کرو...... جاؤ...... جاؤ نا۔

(کاکا آہستہ سے قدم اٹھا کر کمرے سے باہر نکلتا ہے۔نور مورتی کے قریب آکر اُس کے خوبصورت سراپا کو غور سے دیکھ کر...... یکا یک جذباتی ہو کر کہتا ہے)۔

نور: تخلیق مکمل ہوگئی۔ میرا خواب آج پورا ہو گیا۔روحی جواب دو...... کچھ تو کہو......

(روحی سراپا سامنے آکر......مورتی سے بدن پا کر مسکرا دیتی ہے......)

روحی: داسی کیا بولے گی۔

نور: داسی نہیں، روحی......تم میری رانی ہو۔ میری حیات ہو میری دھڑکن ہو...... میرا......میرا سب کچھ ہو تم......

روحی: نور......میرے نور......

نور: میرا خواب......میرے خواب کا انوکھا، اچھوتا گلاب...... کتنے یگوں کے بعد کی یہ ملاقات ہے۔ میں...... میں تمہیں اپنے اتنا قریب پا کے حیات میں ایک نئی ہلچل سی محسوس کر رہا ہوں روحی......جیسے سات زمانوں کی یہ گردش تمہارے اور میرے لئے ہے۔صرف اور صرف ہم دونوں کے لئے۔

روحی: سچ......
نور سچ......مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔

نور: روحی......میں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤ......
کاکا......(آواز دے کر) کاکا......آؤ اور دیکھو......سارے زمانے سے کہو......
یہ......یہ میری روحی ہے......یہ......

کاکا: چھوٹے سرکار......آپ نے مجھے بُلایا ہے۔

نور: ہاں......کاکا...... یہ میری روحی ہے دیکھو......غور سے دیکھو...... دیکھو......یہی میری روحی ہے۔

کاکا: چھوٹے سرکار یہ تو......

نور: ہاں یہی میری روحی ہے۔میری کتاب......میری تخلیق......میری کہانی......کا
میری کہانی......

کاکا: (پریشان اور حیران سا) مگر سرکار......چھوٹے سرکار یہ تو۔۔۔۔

نور: (بات کاٹ کر جذباتی لہجے میں) یہ بولتی ہے۔ یہ چلتی ہے میرے ساتھ، میرے
سنگ......روحی تم بھی کہو......تم بھی کہو اسے......

کاکا: چھوٹے سرکار آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ پتھر بولتے نہیں ہیں۔ پتھر چلتے نہیں ہیں......

نور: (چلا کر)

تم جھوٹ کہتے ہو۔ کاکا تم جھوٹ کہتے ہو۔ یہ برسوں سے میرے ساتھ چلی
ہے۔ برسوں سے میں اس کی آواز سنتا ہوں۔ برسوں سے مجھے اس کا انتظار
ہے۔ یہی میری روحی ہے۔ غور سے دیکھو کاکا...... (روحی کی طرف اشارہ
کرکے)۔ چھو کے دیکھو۔

کاکا: (پریشانی کے عالم میں) چھوٹے سرکار......او...... ہو...... یہ آپ کیا کہہ رہے
ہیں......آپ کو آج کیا ہو گیا ہے۔

نور: مجھے کچھ نہیں ہوا ہے کاکا......روحی سے پوچھو......میری محبت سے پوچھو......کیا
میں جھوٹ کہتا ہوں۔ روحی جواب دو اسے......روحی جواب دو......جواب دو
روحی۔

(خاموشی کا ایک وقفہ گزر جاتا ہے۔ نور حیرت سے مورت کو تکنے لگتا ہے، بلکہ
پاگلوں کی طرح گھور گھور کے دیکھتا ہے......پھر یکایک سنبھل سا جاتا ہے۔)

نور: خاموشی...... یہ کیسی خاموشی ہے۔ یہ سناٹا کیا ہے۔ روحی تم نہیں سُن رہی ہو
کیا......جواب دو......روحی......روحی جواب دو......

ضمیر: (نور کے سامنے مورتی کے پاس ہی دوسرا نور کھڑا قہقہے لگاتا ہے) آ......ہا......
ہا......ہا......تمہارا فریب۔

نور: میرا فریب......دھوکہ......مگر کیوں......مجھ سے کیوں۔

ضمیر: آ...... ہا...... ہا......ہا...... مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ فن کار، اپنی تخلیق سے پوچھو......روحی سے پوچھو...... پتھر بولتے ہیں (آہا......ہا......ہا) پتھر نہیں بولتے ہیں۔ آہا......ہا......ہا...... پتھر بولتے ہیں......آہا......ہا......

نور: (چونک سا جاتا ہے۔ ہوش میں جیسے آتا ہے) اوہ......فریب......دھوکہ، تو کیا میں اپنے ہی زندان میں اتنے سال جلتا رہا......اپنے ہی خیال کے قفس میں بھٹکتا رہا...... کیوں...... کس کے لئے...... روحی تمہارے لئے...... اور تم پتھر ہو......پتھر......صرف پتھر......

(نور پاگلوں کے سے انداز میں روحی کے ارد گرد گھومتا ہے۔ کاکا خاموشی سے اُسے دیکھے جا رہا ہے)۔

نور: (مورتی کے قریب آ کر اُس کے ہاتھوں کو چھوتا ہے) یہ...... یہ ہاتھ...... ہاں یہی وہ ہاتھ ہیں جن میں...... میں نے پھولوں کے گلدستے دیکھے تھے جنہیں میرے گلے میں محبت کی مالائیں ڈالنی تھیں۔ مگر...... مگر یہ تو بے جان ہاتھ ہیں......ان میں کوئی حیات نہیں۔ کوئی حرکت نہیں۔ میں انہیں کاٹ دوں گا...... (ہتھوڑا ہاتھ میں لے کر)......ہاں ہاں میں انہیں کاٹ دوں گا...... (کھٹاک۔ ہتھوڑا اچلتا ہے۔ ہاتھ کٹتے ہیں)۔

نور: ہونٹ...... (انگلیوں سے مورتی کے ہونٹوں کو چھو کر) یہی وہ ہونٹ ہیں۔ جو گلابوں کے شہر کی داستاں سناتے تھے مجھے......یہ آج......آج چپ کیوں ہیں۔ پتھر نہیں بولتے...... ہاں ہاں، پتھر نہیں بولتے...... میں ان ہونٹوں کو اس چھینی سے کاٹ دوں گا۔ ہاں میں انہیں کاٹ دوں گا...... میں انہیں کاٹ دوں گا...... اس ہتھوڑے سے......

(کھٹاک......مورتی کے ہونٹ فرش پر بکھرتے ہیں۔ مورتی کے خوبصورت بدن کو تکنے لگتا ہے)۔

نور: یہ...... یہ راگ بدن ایک فریب تھا ایک زہر...... جس نے میرے سارے وجود
زہریلا کر دیا...... یہ...... آنکھیں...... (آہا...... ہا...... ہا) یہی وہ آنکھیں ہیں
جن میں تیرتی ہوئی شراب نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ یہی وہ آنکھیں ہیں۔ فریب
آنکھیں...... خواب کی دُھند میں الجھا دینے والی آنکھیں...... میری دشمن
آنکھیں...... میں انہیں بے نور کر دوں گا...... میں ان آنکھوں کی روشنی چھین لوں
گا...... میں...... میں ان آنکھوں کو اس زمین پر بے نشان کر دوں گا...... میں......
ہتھوڑا تیزی سے چلتا ہے۔ مورتی فرش پر لڑھک جاتی ہے۔ نور وحشت زد
انداز میں چیختا چلاتا ہوا سارا سامان ادھر ادھر پھینک دیتا ہے۔ کمرے میں ایک
پل کے لئے بھونچال سا آتا ہے)۔
(کچھ دیر بعد...... نور اس جنون سے باہر آتا ہے۔ کچھ سنبھل سا جاتا ہے۔ فرش
بیٹھتا ہے)

نور: (بیٹھا ہوا اپنا سر پکڑے) اوہ کاکا...... یہ کیا ہو گیا۔ یہ اندھیرا کیوں ہو گیا......

کاکا: چھوٹے سرکار...... بتی جلا دوں۔

نور: نہیں کاکا...... نہیں...... اب کچھ فائدہ نہیں...... مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا
ہے...... کچھ بھی نہیں، کاکا......

کاکا: چھوٹے سرکار...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

نور: کاکا...... میں...... میں اندھا ہو گیا ہوں......

کاکا: نہیں......

نور: چاروں طرف دھند ہے کاکا...... گہری گھور سیاہی...... خاموشی...... خاموشی اور
تنہائی...... اور کچھ بھی نہیں کاکا...... اور کچھ بھی نہیں...... اور......!

..........☆☆☆..........

☆......بلراج بخشی

قانونِ شکن

کردار:

ملزم، سرکاری وکیل، جج، چوبدار، بس کنڈکٹر، دوتین مسافر
مالی، چائے والا، لڑکی، پولیس کا سپاہی، بموں کا ماہر، دوگاہک

سین......ا

مقام : کمرۂ عدالت

کردار : ملزم، جج، وکیل، چوبدار، بس کنڈکٹر

(کمرۂ عدالت میں حاضرین بیٹھے ہیں۔ ملزم کٹہرے میں اور وکیل اپنی جگہ پر ہے۔ جج آکر کرسی پر بیٹھتا ہے)

جج: کاروائی شروع کی جائے۔

وکیل: یور آنر......اس مقدمے کا ملزم ایک ایسا قانون شکن ہے.....ایک ایسا انارکسٹ ہے جو ملک میں افراتفری، انارکی اور لاقانونیت پھیلانے کی کئی کوششیں کر چکا ہے.... لیکن ہماری مستعد پولیس.. . ہماری لا اینڈ آرڈر مشینری .... اور ہمارے باشعور شہریوں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ (ملزم کی طرف ہاتھ اٹھا کر) یہ ہے وہ خطرناک ملزم یور آنر...جس نے جمہوریت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی...

جج: (ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا تمہیں یہاں ہتھکڑی میں لایا گیا تھا؟

ملزم: ہاں یور آنر.....

جج: (وکیل کو دیکھ کر سختی سے) حالانکہ عدالت کی ہدایات ہیں کہ ملزموں کو ہتھ
لگا کر نہ لایا جائے.....(پھر ملزم کی طرف دیکھتا ہے) عدالت میں لاتے
کیا پولیس نے تمہارے چہرے پر نقاب ڈالا تھا؟

ملزم: نہیں یور آنر.......

جج: (وکیل کی طرف دیکھ کر، سخت لہجے میں) تم لوگ آخر انسانی حقوق کا
کیوں نہیں رکھتے.....جبکہ سپریم کورٹ نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ کسی
ملزم کو گرفتار کرتے وقت یا عدالت میں لاتے وقت نقاب پہنایا جائے
اور اسی لیے تمام پولیس اسٹیشنوں میں نقابوں کی باضابطہ سپلائی کی
ہے.....اور اسی لیے ہر ہتھکڑی کے ساتھ دو نقاب بھی فراہم کیے جا
ہیں.....یہ عدالت پبلک پراسیکیوٹر سے کہنا چاہتی ہے کہ اس بات کی تحقیق
کی جائے کہ ملزم کو نقاب کیوں نہیں پہنایا گیا.....اور اس کے لیے کون ذمہ
ہے.....وکیل صفائی کون ہے؟

وکیل: ملزم کا کوئی وکیل نہیں ہے یور آنر.....

جج: کیوں؟.....کیا ملزم کے پاس وکیل کے لیے فیس نہیں ہے؟..... پڑوسی ملک
کی کئی خفیہ ایجنسیاں یہاں کام کر رہی ہیں.....کیا ان میں سے کوئی ایجنسی
کی فنڈنگ نہیں کر رہی ہے؟

وکیل: پتہ نہیں یور آنر.....اس قسم کے لوگ اپنی بینک بُک کبھی نہیں دکھاتے.....

جج: پھر یہ کیسا انارکسٹ ہے کہ.....ایک وکیل کرنے کی بھی جس کی اوقات نہیں.....
خود کو انارکسٹ کہلوا رہا ہے....(ملزم سے مخاطب ہو کر) اگر تمہارے پاس و
کے لیے فیس نہیں ہے تو یہ عدالت اپنے خرچ پر تمہیں وکیل فراہم کر سکتی ہے.....

ملزم: نہیں یور آنر.....

جج: کیوں؟

ملزم: عدالت کے پینل پر ہمیشہ کم تر اور گھٹیا وکیل ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے جڑے ہوتے ہیں..... یہ وکیل.... لیڈر بننے کے قابل نہیں ہوتے... اور... ورکر..... وہ بننا نہیں چاہتے..... اس لیے پارٹی کے نعرے لگانے کے انعام کے طور پر..... حکومت انہیں عدالت کے کھاتے سے..... یا کسی دوسرے سرکاری محکمے کے کھاتے سے.... کوئی نہ کوئی پنشن لگا دیتی ہے..... میں اپنا مقدمہ خود لڑوں گا.....

جج: ہم م م م..... ملزم میں سرکشی اور بغاوت کے..... واضح آثار..... دکھائی دیتے ہیں..... خیر..... کاروائی شروع کی جائے....

وکیل: جناب..... ہمارا پہلا گواہ ایک بس کنڈکٹر ہے....

(چوبدار آواز لگاتا ہے)

چوبدار: بس کنڈکٹر حاضر ہو و و و.....

(بس کنڈکٹر آ کر دوسری طرف کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہے)

وکیل: تم نے ملزم کو پہلی بار کب..... اور..... کہاں دیکھا تھا؟

کنڈکٹر: جی بس میں..... میں اس بس میں کنڈکٹر تھا.....

وکیل: ملزم نے بس میں کیا کِیا؟

کنڈکٹر: او..... ساب جی..... اس نے تو بس میں ہنگامہ کھڑا کر دیا.....

وکیل: کیسے؟

(ڈراپ)

سین......۲

(مقام : بس کے اندر)

کردار : ملزم، بس کنڈکٹر، کچھ دوسرے مسافر

(بس کے اندر کا منظر ہے۔ مسافر سیٹوں پر بیٹھے ہیں۔ ملزم بھی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔

کنڈکٹر سواریوں کو ٹکٹیں دے رہا ہے۔ اچانک ملزم کنڈکٹر کو بلاتا ہے)

ملزم: او بھائی.....کنڈکٹر ساب......

کنڈکٹر: (اس کی طرف دیکھ کر) کیا ہے؟

ملزم: (ایک طرف ہاتھ اٹھا کر) وہ کیا لکھا ہے؟

کنڈکٹر: کیا لکھا ہے؟

(ایک تختی لگی ہے جس پر لکھا ہے: 'سواری اپنے سامان کی خود ذمہ دار ہے')

ملزم: یہ دیکھو..... یہاں لکھا ہے.... سواری اپنے سامان کی خود ذمہ دار ہے.....

کنڈکٹر: ہاں....لکھا ہے....تو؟

ملزم: تو کیا؟.....ارے میرا سامان تو تم نے چھت پر رکھا ہے.....میں یہاں بیٹھا ہوں....اور لکھ دیا ہے کہ سواری اپنے سامان کی خود ذمہ دار ہے.....اب بتاؤ ...میں یہاں بیٹھ کر سامان کی ذمہ داری کیسے سنبھال سکتا ہوں؟

کنڈکٹر: ارے بھائی.....یہ سب تو ایسے ہی لکھا رہتا ہے.....یہ بسوں کے محاورے ہوتے ہیں ان کا کوئی مطلب نہیں ہوتا.....جیسے....وہ دیکھو....لکھا ہے....مہربانی کر کے سیٹ پر پاؤں نہ رکھیں....حالانکہ یہ لکھنا ہی بے کار ہے کیوں کہ سیٹ پہلے ہی اتنی چھوٹی ہے کہ اس پر بیٹھنا بھی مشکل ہے....پاؤں کیسے رکھیں گے؟...یا وہ دیکھو.... گاڑی چلتے وقت کھڑکی سے سر نہ نکالیں.....لو جی.....اب اُلٹی کرتے وقت سر تو باہر نکالنا پڑے گا نا جی.....

ملزم: اگر یہ باتیں بے مطلب کی ہیں تو لکھا ہی کیوں ہے؟....میرے سامان کا بیگ چھت پر ہے.....تو جب بھی کوئی آدمی گاڑی کی چھت سے اپنا سامان اتارے گا تو کیا مجھے ہر بار نیچے اتر کر دیکھنا پڑے گا کہ کوئی میرا سامان تو نہیں لے جا رہا ہے؟

کنڈکٹر: ایسے کون کسی کا سامان لے جاتا ہے.....آخر دنیا میں دین دھرم نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے کہ نہیں؟

ملزم: پھر لکھا کیوں ہے؟ سامان دین دھرم کے حوالے کر دیتے.....گارنٹی دو کہ میرا سامان کوئی نہیں لے جائے گا.....

کنڈکٹر: میں کیسے گارنٹی دے سکتا ہوں؟

ملزم: تو پھر سامان نیچے لے آؤ....بس کے اندر....میں اپنے پاس رکھوں گا.....

کنڈکٹر: بس کے اندر سامان رکھنے کی اجازت نہیں ہے....

ملزم: تو پھر گارنٹی دو.....

کنڈکٹر: تم بھی تو بس میں ہو....تمہاری زندگی کی گارنٹی ہے کوئی؟

ملزم: انسان کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی....انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کی گارنٹی ہوتی ہے....اور اسی لیے سرکار بھی انسان کی گارنٹی نہیں دیتی.....اور یہ بات بھی تمہیں لکھوانا چاہیئے تھی کہ سواری اپنی زندگی کی بھی خود ذمہ دار ہے لیکن تم نے نہیں لکھوایا.....(اونچی آواز میں) میں کہتا ہوں یہ جو لکھا ہوا ہے اسے مٹاؤ....یہ کنزیومر ایکٹ کے خلاف ہے....(دوسرے مسافروں کی طرف دیکھ کر)....بھائیو....کیا آپ کا سامان بھی چھت پر ہے؟

مسافر: ہاں ہاں....ہمارا سامان بھی چھت پر ہے....

ملزم: (اونچی آواز میں) تو آپ بولتے کیوں نہیں....اگر آپ کا سامان چوری ہو جائے....یا کوئی اٹھا کر لے جائے....تو یہ تو بڑے آرام سے وہ لکھا ہوا دکھا دے گا....کہ سواری اپنے سامان کی خود ذمہ دار ہے.....

مسافر: ہاں ہاں.....یہ ٹھیک کہہ رہا ہے.....

ملزم: تو پھر میرا ساتھ دو....انقلاب....انقلاب....

مسافر: زندہ باد....زندہ باد.....

ملزم: انقلاب.....انقلاب.....

مسافر: زندہ باد.....زندہ باد.....

(ڈراپ)

سین......۳

مقام : کمرۂ عدالت

کردار : ملزم، جج، وکیل، چوبدار، کنڈکٹر، مالی

(عدالت کے اندر کا سین۔ مالی کے سوا سب سین 1 کے تسلسل میں ہیں)

جج: پھر کیا ہوا؟

کنڈکٹر: پھر جناب.....اس نے شور مچایا کہ اخبار والے آ گئے.....(خوش ہو کر) دوسرے دن اس کا اور میرا.....دونوں کا فوٹو اخبار میں چھپا تھا.....جی ہاں.....

وکیل: تم کتنے عرصے سے بس میں کنڈکٹر ہو؟

کنڈکٹر: میں تو پیدا ہی بس میں ہوا تھا جی.....

(سب ہنس پڑتے ہیں)

جج: (سخت لہجے میں) سیدھی طرح جواب دو.....

کنڈکٹر: میں سچ کہہ رہا ہوں ساب جی ..... گاؤں میں کوئی ڈاکٹر تھا ہی نہیں..... میری ماں شہر کے اسپتال جا رہی تھی کہ گاڑی میں ہی ڈلیوری ہوگئی..... اور میرے باپ نے فیصلہ کرلیا کہ وہ مجھے ٹرانسپورٹر بنائے گا.....

وکیل: اچھا..... جب سے تم..... یہ ٹرانسپورٹری..... میرا مطلب ہے..... بس کنڈکٹری کر رہے ہو..... تب سے آج تک..... کسی اور سواری نے ایسا سلوک کیا ہے جیسا اس ملزم نے کیا تھا؟

کنڈکٹر: او..... نہیں جی..... کبھی نہیں.....

وکیل: دیٹ اِز آل یور آنر..... میں عدالت کو محض یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ملزم کا سماجی برتاؤ عام آدمی سے ہٹ کر ہے..... میرا دوسرا گواہ ہے..... گوگڑ بابا..... پارک کا مالی...
(چوبدار آواز لگاتا ہے)

چوبدار: مالی حاضر ہو و و.....

(کنڈکٹر کٹھرے سے باہر آتا ہے اور مالی آکر کٹھرے میں کھڑا ہو جاتا ہے)

وکیل: تم نے ملزم کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا؟

مالی: گوگڑ بابا پارک میں سرکار..... میں وہاں مالی ہوں.....

وکیل: ملزم وہاں کیا کر رہا تھا؟

مالی: سرکار..... ملزم وہاں ایک خلاف قانون حرکت کرنے لگا تھا..... میں نے روکا تو جھگڑا کرنے لگا.....

وکیل: عدالت کو پوری بات بتاؤ.....

مالی: سرکار..... میں مالی ہوں..... سارا دن گرمی میں..... سردی میں..... کام کرکے کیاریوں میں پھول اگاتا ہوں..... لال، پیلے، نیلے، بنفشی اور بے شمار قسم کے رنگوں کے خوبصورت پھول..... اور یہ آدمی..... اتنی محنت سے اگائے گئے پھولوں کو توڑنے لگا تھا.....

وکیل: تو اگر ایک دو پھول توڑ بھی لیتا تو کون سی قیامت آجاتی ؟

مالی: سرکار..... پارکوں کی Privatisation ہو چکی ہے.....یہ پارک ایک Self Financing یونٹ ہے.....لوگ آتے ہیں.....اتنے خوبصورت پھول دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور وہاں رکھے بکسے میں ایک.....دو......یا پانچ روپے کا سِکہ ڈال دیتے ہیں.....اسی آمدن سے ہماری تنخواہ..... پارک کی دیکھ ریکھ کا خرچ.....اور کمپنی کا منافع نکالا جاتا ہے.....اگر ہر آدمی ایسے ہی پھول توڑنا شروع کر دے تو میں ہر روز نئے نئے پھول کیسے اگاؤں گا.....

وکیل: پھر کیا ہوا؟

(ڈراپ)

سین......۴

(مقام : پارک)

کردار : ملزم، مالی

(پارک کا سین۔ پھول لگے ہوئے ہیں۔ مالی ہاتھ میں کھرپا لیے کام کر رہا ہے۔ملزم ہاتھ بڑھا کر پھول توڑنے لگتا ہے تو مالی کھڑا ہو کر کہتا ہے)

مالی: کیا کر رہے ہو؟

ملزم: (اس کا ہاتھ پھولوں کے پاس جا کر رک جاتا ہے اور وہ مالی کی طرف مڑتا ہے) پھول دیکھ رہا ہوں.....

مالی: (اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے) پھول آنکھوں سے دیکھتے ہیں یا ہاتھوں سے؟

ملزم: اصل میں مجھے پھولوں سے پیار ہے.....میں انہیں چھونا چاہتا ہوں.....

مالی: چھونے کی اجازت نہیں ہے.....

ملزم: میں شاعر ہوں.....

مالی: تو؟

ملزم: میں کچھ پھولوں کو ہاتھ میں لے کر.... تنہائی میں بیٹھ کر.... انہیں دیکھنا چاہتا ہوں.... محسوس کرنا چاہتا ہوں.....

مالی: پھولوں کو توڑنے کی اجازت نہیں ہے.....

ملزم: تم نے شاید مجھے ٹھیک سے سنا نہیں..... میں شاعر ہوں.... مجھے پھولوں سے پیار ہے....

مالی: پھولوں سے پیار ہے تو انہیں دیکھو نا..... کس نے منع کیا ہے.... پھول تو ہوتے ہی اسی لیے ہیں کہ کوئی انہیں دیکھے.....

ملزم: میں ان پھولوں کو چھونا چاہتا ہوں.... ان کا لمس..... ان کی نازکی محسوس کرنا چاہتا ہوں..... لیکن اس کے لیے کیاری کی مٹی میں نہیں..... بلکہ ہاتھوں میں کچھ پھول لے کر تنہائی میں بیٹھنا چاہتا ہوں.....

مالی: نہیں..... پھول توڑنا منع ہے.....

ملزم: ایسا کون سا قانون ہے کہ میں پھول نہیں توڑ سکتا......

مالی: (ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر اشارہ کرتا ہے) وہ بورڈ دیکھ لو..... پتہ چل جائے گا.....

ملزم: کیا ہے ان بورڈوں پر؟

مالی: ان پر لکھا ہے کہ پھول توڑنا منع ہے.....

ملزم: کیا تمہیں یہ بورڈ لگانے کا قانونی حق ہے؟

مالی: بالکل.... جب سے پرائیویٹائزیشن ہوئی ہے.... بہت سے قانون بدل گئے ہیں..... پہلے تو جو بھی پارک میں آتا تھا پھول توڑ توڑ کر پھینکتا رہتا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا..... مگر اب یہ پارک ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے زیرانتظام ہے..... کمپنی والے ہر روز ایک ایک پھول گنتے ہیں..... اور اگر پھول کم ہوں تو میری تنخواہ میں سے پیسے کٹ جاتے ہیں..... یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر موسم میں طرح طرح کے کئی بے موسمی .... مگر لاجواب پھول کھلے رہتے ہیں..... جنہیں دیکھ کر لوگ خود بخود..... کہے بغیر ہی جیبوں سے پیسے نکال کر اس بکسے میں ڈال دیتے ہیں......

(ڈراپ)

سین......۵

مقام : کمرۂ عدالت

کردار :ملزم، جج، وکیل، چوبدار، مالی، سپاہی

(عدالت کے اندر کا منظر۔سپاہی کے سوا سبھی سین نمبر 3 کے تسلسل میں ہیں)

جج: (وکیل کو مخاطب کر کے) کیا قانون میں شاعروں کو.پھول توڑنے جیسی کچھ خاص سہولتیں حاصل ہیں؟

وکیل: نہیں یور آنر..... میں نے قانون کی ساری کتابیں دیکھ لیں..... شاعروں کے بارے میں قانون نے نہ جانے کیوں غیر قانونی خاموشی اختیار کر رکھی ہے.... اور شاید اسی لیے شاعروں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے..... کوئی بھی اپنے آپ کو شاعر کہلوانے لگتا ہے اور اس کے لیے اسے نزدیک کے تھانے میں اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی..... خیر.... (مالی سے) پھر کیا ہوا......

مالی: پھر سرکار.....اس آدمی نے میرے ایک نہ سنی اور کئی پھول توڑ لیے.....

وکیل: تمہارے سامنے؟

مالی: بالکل سرکار.....میرے سامنے.....بڑی دیدہ دلیری سے.....

وکیل: پھر تم نے کیا کیا.....

مالی: میں کیا کر سکتا تھا سرکار؟.....میں غریب آدمی ہوں.....بال بچوں والا.....جو آدمی .....پھول توڑنا منع ہے.....کا بورڈ دیکھ کر بھی اتنی دلیری کے ساتھ پھول توڑ سکتا ہے..... پھول کیا جی..... قانون توڑ سکتا ہے.....آپ اندازہ لگائیے.....کتنا خطرناک ہوگا.....کیا پتہ مجھے چاقو یا گولی مار دے.....آج کل کسی کی جان لے لینا.....سانس لینے سے بھی زیادہ آسان ہوگیا ہے سرکار.....

وکیل: پھر؟

مالی: پھر میڈیا والے آ گئے سرکار.....میں سیدھا تھانے میں چلا گیا اور اس کے خلاف رپورٹ لکھوا دی.....

وکیل: کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ آدمی یہی تھا؟

مالی: بالکل یہی تھا سرکار.....اتنے خطرناک آدمی کو تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا.....جو بورڈ پر لکھا ہونے کے باوجود پھول توڑنے کی اتنی جرأت رکھتا ہے.....

وکیل: (جج کو کچھ کاغذات دیتے ہوئے) یہ رہی اس FIR کی کاپی یور آنر.....اینڈ دیٹ اِز آل.....تم جا سکتے ہو مالی.....میرا اگلا گواہ پولیس کا ایک سپاہی ہے.....

چوبدار: سپاہی حاضر ہو و و.....

(مالی کٹہرے سے باہر آتا ہے اور سپاہی آ کر کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہے)

وکیل: کیا تم ملزم کو پہچانتے ہو؟

سپاہی: جی ہاں جناب.....(ملزم کی طرف اشارہ کر کے) وہ ہے جناب.....

وکیل: تم نے پہلی بار اسے کہاں اور کن حالات میں دیکھا تھا؟

سپاہی: جناب میں سڑک پر ڈیوٹی کر رہا تھا.....

(ڈراپ)

سین ٦

(مقام : سڑک)

کردار : ملزم، سپاہی

(سڑک کا سین۔ سپاہی ادھر ادھر ٹہل رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی ہے۔ ایک طرف سے ملزم آتا ہے اور سپاہی سے کچھ دور ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سپاہی کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کے آس پاس چکر لگا کر اسے حیرت سے دیکھتا ہے لیکن ملزم اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا کھڑا ہے۔ تھک ہار کر سپاہی اس کے قریب آتا ہے)

سپاہی: (سخت لہجے میں) یہاں کیوں کھڑے ہو؟

ملزم: تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟

سپاہی: میں تو یہاں ڈیوٹی کر رہا ہوں.....

ملزم: اور.....میں یہاں.....بس یوں ہی کھڑا ہوں.....کیوں؟

سپاہی: نہیں.....تم یہاں کسی وجہ کے بغیر کھڑے نہیں ہو سکتے.....

ملزم: کیوں؟.....یہاں کھڑا ہونا کوئی جرم ہے؟

سپاہی: ہاں.....یہاں کھڑے ہونا قانوناً جرم ہے.....

ملزم: کیوں؟

سپاہی: یہ نو پارکنگ زون ہے.....

ملزم: کون سا زون؟

سپاہی: نو پارکنگ زون.....قانون کے مطابق یہاں کوئی گاڑی کھڑی نہیں ہو سکتی.....

ملزم: میرے پاس کوئی گاڑی ہے؟

سپاہی: نہیں.....

ملزم: کوئی فور وہیلر؟

سپاہی: نہیں.....

ملزم: ٹُو وہیلر؟

سپاہی: نہیں.....

ملزم: سائیکل؟

سپاہی: نہیں.....

ملزم: میرے یہاں کھڑے ہونے پر قانون کو کیا خطرہ لاحق ہو گیا؟

سپاہی: یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے.....لیکن نو پارکنگ زون میں تمہارے کھڑے ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے.....ہو سکتا ہے تمہارا کوئی خفیہ ایجنڈا ہو.....قانون رِسک نہیں لے سکتا.....

ملزم: یار، یہ کمال کا قانون بنایا ہے تم لوگوں نے.....نہیں جاتا میں یہاں سے.....کیا کر لو گے؟

سپاہی: یعنی تم قانون کو چیلنج کر رہے ہو؟

ملزم: میں قانون کو چیلنج نہیں کر رہا ہوں.....میں صرف یہاں کھڑے ہونے کا اپنا بنیادی حق استعمال کر رہا ہوں....

سپاہی: میں تمہیں قانون کے نام پر حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے فوراً چلتے پھرتے نظر آؤ....ورنہ تمہارے خلاف کاروائی کی جائے گی......

ملزم: (غصے سے) نہیں جاتا میں یہاں سے.....میں دھرنا دے رہا ہوں یہاں....دنیا بھر کے قانون میرے پیچھے لگا رکھے ہیں....جینا تو پہلے ہی حرام کر رکھا ہے .....اب کہیں کھڑے ہونا بھی جرم ہو گیا.....

(ملزم دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے)

(ڈراپ)

سین......۷

(مقام : کمرۂ عدالت)

کردار ملزم، جج، وکیل، چوبدار، سپاہی، چائے والا

(عدالت کے اندر کا منظر۔ چائے والے کے سوا سبھی سین نمبر 5 کے تسلسل میں ہیں)

جج: (سپاہی سے) لیکن تمہیں قانون کو اتنی سختی سے لاگو کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

سپاہی: عام طور پر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پولیس موقعۂ واردات پر.....بہت دیر سے پہنچتی ہے.....اس وقت.....جب مجرم.....جرم کر کے فرار ہو جاتے ہیں.....لیکن اس لیے پولیس نے اپنا طریقۂ کار ہی بدل لیا ہے.....ہمیں نئی قسم کی ٹریننگ دی جاتی ہے.....اب ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہم.....ہم جرم ہونے کا انتظار نہ کریں.....بلکہ جرم ہونے ہی نہ دیں.....اور.....جرم ہونے سے پہلے ہی اسے روکیں.....اگر ملزم وہاں کھڑا رہتا.....تو.....یا .....تو.....یہ خود اشارہ کر کے کسی گاڑی کو کھڑی کروا لیتا.....یا راستے میں کھڑے.....اس ملزم کو مسافر سمجھ کر کوئی نہ کوئی گاڑی خود ہی وہاں کھڑی ہو جاتی.....اور اس طرح.....یہ آدمی قانون کی خلاف ورزی کا باعث بنتا.. ...اسی لیے جناب.....میں نے ملزم کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا تھا.....اگر.....عدالت سمجھتی ہے کہ میں نے غلط کیا ہے تو..

جج: (تعریفی لہجے میں) نہیں نہیں.....عدالت کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہماری پولیس میں تم جیسے ایماندار اور فرض شناس لوگ موجود ہیں.....جن کی وجہ سے سماج میں نظم وضبط قائم ہے.....یہ عدالت تمہارے اعلیٰ افسروں سے سفارش کرے گی کہ وہ تمہاری فرض شناسی کے اعتراف میں تمہیں مناسب میڈل یا انعام سے سرفراز کرے.....خیر.....پھر تم نے کیا کِیا؟

سپاہی: جناب میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ.....جاؤ.....کسی گزیٹڈ افسر سے یہاں کھڑے ہونے کی اجازت لے آؤ.....اور پھر آرام سے کھڑے رہو.....

وکیل: پھر کیا ہوا؟

سپاہی: پھر جناب.....یہ نہیں مانا.....اور.....اس نے وہاں دھرنا دے دیا.....میں نے تھانے میں جا کر اس آدمی کے خلاف رپورٹ لکھوا دی.....کیا کرتا.....

وکیل: اور.....یور آنر.....یہ ہے اس FIR کی نقل.....آپ نے دیکھا یور آنر کہ یہ ملزم.....لگا تار.....ایک ایک کر کے.....کسی نہ کسی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا بہانہ ڈھونڈ کر میڈیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے.....(سپاہی سے) تم جا سکتے ہو.....اگلا گواہ ایک چائے والا ہے یور آنر.....

جج: چائے والا؟

وکیل: ہاں یور آنر.....

جج: پہلے بس کنڈکٹر.....پھر مالی.....سپاہی.....اور اب چائے والا.....کیا سرکاری وکیل کو احساس ہے کہ گواہوں کا معیار لگا تار گرتا جا رہا ہے؟

وکیل: یور آنر.....اس کی وجہ یہ ہے کہ.....ملزم کا.....اپنا کوئی معیار نہیں ہے.....اس کا اپنی کوئی سوشل بیک گراؤنڈ بھی نہیں ہے.....

جج: تو اس قسم کے مقدموں کا فیصلہ بھی عدالت کے باہر ہی کر لینا چاہیئے...... عدالت کا بھی کوئی سوشل اسٹیٹس ہوتا ہے.. .....آئندہ کے لیے..... مقدمے پیش کرتے وقت عدالت کے وقار کو مدنظر رکھا جائے.....خیر کارروائی جاری رہے.....

چوبدار: چائے والا حاضر ہو و و و.....

(سپاہی کٹھرے سے باہر آتا ہے اور چائے والا آکر کٹھرے میں کھڑا ہو جاتا ہے)

وکیل: تم.....ملزم کو جانتے ہو؟

چائے والا: اسے تو میں ساری عمر نہیں بھول سکتا، جناب...

وکیل: کیوں؟

چائے والا: میں چائے کی دکان چلاتا ہوں جناب.....ایک دن یہ میری دکان میں آیا.....اور.....آتے ہی اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا.....

وکیل: یور آنر... میں عدالت کی توجہ ایک بات کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ.....اس کیس میں ابھی تک جتنے بھی گواہ پیش ہوئے ہیں سب کا یہی کہنا ہے کہ.....اس نے آتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا.....جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک پیشہ ور ہنگامہ باز ہے.....اور جہاں بھی جاتا ہے.....ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے تحت..... سستی سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے..... چھوٹی چھوٹی باتوں کا سہارا لے کر عوامی امن و سکون میں خلل ڈالتا ہے... ...اور میڈیا کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے.. ... خیر...(چائے والے سے) تم اسے کب سے جانتے ہو؟

چائے والا: جب سے اس نے میری دکان پر آکر ہنگامہ کیا.....

وکیل: تفصیل سے بتاؤ.....

(ڈراپ)

سین ۸

مقام: چائے کی دکان

کردار: ملزم، چائے والا، دو گاہک

(چائے کی دکان کا منظر۔ دو گاہک میز پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ چائے والا ایک کپڑے سے میز صاف کر رہا ہے جہاں دو گاہک چائے پی رہے ہیں۔ ملزم آکر وہاں بیٹھ جاتا ہے)

ملزم: ایک کپ چائے لاؤ بھائی.....

(چائے والا جاتا ہے اور اسی وقت چائے لے آتا ہے)

ملزم: (چائے کا گھونٹ بھر کر) کتنے دنوں سے بنا کر رکھی ہے.....

(چائے والا اس کی طرف دیکھتا ہے مگر کچھ نہیں کہتا اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ ملزم دوسرے گاہکوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے)

ملزم: او...ہو...ہو.....بڑی گرمی ہے یار.....

گاہک: (چھت کی طرف دیکھ کر) ہاں....پنکھا بند ہے....بجلی چلی گئی ہے.....

ملزم: پتہ نہیں بجلی کب آئے گی.......

چائے والا: بھائی چپ رہو.....اور خاموشی سے چائے پیو، جیسے یہ دونوں پی رہے ہیں.....اس قسم کی باتیں نہ کرو......

ملزم: (غصیلی آواز میں) کیوں نہ کروں.....

(چائے والا اسے دیوار پر لگی ہوئی ایک چھوٹی سی تختی دکھاتا ہے)

ملزم: کیا لکھا ہے اس تختی پر؟

چائے والا: وہاں لکھا ہے.....مہربانی کر کے یہاں سیاسی گفتگو نہ کیجیے.....

ملزم: لیکن.....میں نے سیاسی گفتگو کہاں کی....

چائے والا: بس....اب تم سیاسی گفتگو شروع کرنے ہی والے ہو.....

ملزم: تمہیں کیسے اندازہ ہو گیا کہ میں سیاسی گفتگو شروع کرنے والا ہوں؟

چائے والا: ابھی تم نے کہا....بڑی گرمی ہے.....اور اس آدمی نے کہا.....ہاں بجلی نہیں ہے اس لیے پنکھا بند ہے.....اب تم کہو گے..... پتہ نہیں بجلی کب آئے گی.....پھر دوسرا آدمی کہے گا.....بجلی کا کوئی بھروسہ نہیں، جانے کب آئے.....پھر تم کہو گے ....یہ حکومت بجلی کے بارے میں کچھ کرتی ہی نہیں.....پھر دوسرا کہے گا جب سے یہ حکومت آئی ہے بجلی کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے.....پھر دوسرا کہے گا.....ایک بجلی کیا جی....ہر طرف بیڑا غرق ہو رہا ہے.....پھر یہ کہے گا یہ حکومت سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچا رہی ہے.....تم کہو گے.....لیکن لوگ انقلاب کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے.....پھر یہ کہے گا....دراصل یہ پارٹی سسٹم ہی غلط ہے....یہ کہے گا.....سسٹم نہیں جی پارٹیاں غلط ہیں.....پھر تم کہو گے..... پارٹیاں بھی غلط ہیں.....سسٹم بھی ....اور لیڈر بھی....بس ہو گئی نا بحث شروع.....

ملزم: تمہیں کیسے پتہ کہ یہی ہونے والا تھا؟

چائے والا: ارے میں تم بھوکے ننگے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں.....تین آدمی آتے ہو اور بڑی شان سے آرڈر دیتے ہو.....اوئے ....ایک بٹا تین ....ایک کپ چائے کو تین کپوں میں ڈالتے ہو.....اور پھر ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر ملک کی سیاست پر بحث کرتے ہو.....ارے..... مجھے ساری عمر ہو گئی ایک بٹا تین والے تم بھوکوں ننگوں کی یہی باتیں سنتے سنتے.....اسی لیے جب کوئی گاہک ایسی باتیں شروع کرتا ہے تو میں اسے وہ تختی دکھا دیتا ہوں....اور وہ اچھے شہری کی طرح خاموش ہو جاتا ہے....لیکن تم....تم تو ہنگامہ کھڑا کر رہے ہو.....

(ڈراپ)

سین 9

مقام : کمرۂ عدالت

کردار : ملزم، جج، وکیل، چوبدار، سپاہی، چائے والا، لڑکی، بموں کا ماہر

(عدالت کے اندر کا منظر۔ چائے والے کے سوا سبھی سین نمبر 7 کے تسلسل میں)

وکیل: (ملزم سے) اب بتاؤ.....تم نے ایسا کیوں کیا؟ چائے کی دکان پر ہنگامہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟

ملزم: ملک کی سیاسی.... یا سماجی صورت حال پر اظہار خیال کرنا میرا آئینی حق ہے..... آئین نے مجھے تحریر و تقریر کی آزادی دی ہے.....

جج: لیکن اس حق کا استعمال صحیح جگہ پر ہونا چاہئیے.....نہ کہ چائے کی دکان پر....بس اسٹینڈ.... یا ریلوے اسٹیشن پر جہاں اس قسم کی باتوں سے لا اینڈ آرڈر خراب ہونے کا امکان ہوتا ہے....تحریر و تقریر کی آزادی کے نام پر افراتفری پھیلانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی.....

وکیل: آبجکشن یور آنر.....یہ باتیں میں نے کرنا تھیں.....

جج: Objection Sustained.....لیکن یار.....جج بھی ایک انسان ہی ہوتا ہے....وہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی شکل بھی ٹیلی ویژن پر دکھائی دے..... فیصلہ سناتے وقت اس پر بھی کیمرا فوکس کیا جائے.....لیکن ہمیں تو میڈیا سے بات تک نہیں کرنے دی جاتی.....کبھی کبھی ہمارا بھی بولنے کا من کرتا ہے بھائی.....

وکیل: آپ نے ٹھیک کہا یور آنر.....لیکن قانون.....

جج: (ٹھنڈی سانس لے کر) ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے.....کارروائی جاری رکھو.....

وکیل: (چائے والے سے) پھر تم نے کیا کیا؟

چائے والا: پھر جناب.... جب یہ خاموش نہیں ہوا تو لوگ اکٹھا ہونے لگے..... میڈیا والے آگئے..... تو میں نے قریب کے تھانے میں اس کے خلاف..... لا اینڈ آرڈر کی رپورٹ لکھوادی.....

وکیل: اور یور آنر...... یہ ہے ملزم کے خلاف تیسری ایف۔ آئی۔ آر کی نقل..... تو عدالت نے دیکھا کہ یہ ملزم قدم قدم پر..... جان بوجھ کر..... ارادتاً..... قانون شکنی کر رہا ہے تاکہ ماحول درہم برہم ہو..... لا اینڈ آرڈر خراب ہو..... میڈیا اس بات کو پھیلائے..... اور پڑوسی ملک کو ہم پر حملہ کرنے کا جواز مل جائے..... خیر...... پراسیکیوشن کا اگلا گواہ ایک..... ایک لڑکی ہے.... ایک جوان اور خوبصورت لڑکی......

(حاضرین سے لڑکی لڑکی کی آوازیں آتی ہیں۔ جج بھی آگے جھک کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے)

چوبدار: (ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے) لڑکی حاضر ہو و و و....

(چائے والا کٹہرے سے باہر آتا ہے اور لڑکی آکر کٹہرے میں کھڑی ہو جاتی ہے)

وکیل: تم نے ملزم کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟

لڑکی: میں اینٹی نیشنل پارک میں بنچ پر بیٹھ کر کسی کا انتظار کر رہی تھی..... یہ آیا اور سامنے والی بنچ پر بیٹھ گیا.....

وکیل: اینٹی نیشنل پارک؟..... یہ کون سا پارک ہے؟

لڑکی: جی وہی پارک ...... جہاں لوگ آکر حکومت کے خلاف تقریریں کرتے ہیں.....

وکیل: لیکن وہ تو فریڈم پارک ہے....

لڑکی: اب نہیں ہے.....لوگوں نے فریڈم کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا..... لوگوں نے کہا ہمیں پتہ ہی نہیں فریڈم کیا ہوتی ہے.....اس لیے حکومت نے نام بدل کر اینٹی نیشنل پارک رکھ دیا.....اب وہاں حکومت کے خلاف تقریریں بھی زیادہ ہوتی ہیں.....

وکیل: کیوں؟.....زیادہ کیوں؟

لڑکی: اینٹی نیشنل تقریریں کر کے آپ انٹرنیشنل میڈیا کے ہیرو بن جاتے ہیں.....انسانی حقوق کمیٹیاں آپ کے گھر پر گیس سلنڈر پہنچاتی ہیں.....آپ کے گھر پر ڈینگو کے مچھر مار چھڑکاؤ کے لیے سرکاری ٹیم آتی ہے.....اور..... سیکورٹی کے لیے سپاہی مل جاتے ہیں....جس سے انسان کا سوشل اسٹیٹس بڑھ جاتا ہے......

وکیل: خیر.....تو.....اینٹی نیشنل پارک میں کیا ہوا؟

لڑکی: میں ایک بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی....یہ آیا اور سامنے والی بنچ پر بیٹھ گیا...

جج: سامنے والی بنچ کتنی دور تھی؟

وکیل: آئی آبجکٹ ..... یور آنر...ابھی اسی بات پر آپ کے ساتھ بحث ہو رہی تھی.....فیصلہ بھی آپ ہی کریں گے اور وکالت بھی؟

جج: آئی ایم ساری.....جب گواہ اتنا خوبصورت ہو.....تو کبھی کبھی جج کو بھی سوال پوچھنا اچھا لگتا ہے.....

وکیل: (لڑکی سے) بنچ پر بیٹھ کر ملزم نے کیا کیا؟

لڑکی: سر.....یہ مجھے گھورنے لگا.....

وکیل: کتنی دیر تک گھورتا رہا...

لڑکی: بڑی دیر تک....

وکیل: تم نے اسے گھورنے سے منع نہیں کیا؟

لڑکی: سچ کہوں.....تو..... پہلے مجھے اس کا گھورنا اچھا لگا.....لیکن پھر پریشانی ہونے لگی.....میں نے اس سے کہا بھی.....کہ مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے.....حالانکہ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی تھی.....

وکیل: ہوسکتا ہے تمہیں واقعی غلط فہمی ہوئی ہو؟

لڑکی: اس بارے میں کسی عورت کو غلط فہمی نہیں ہوسکتی.....

وکیل: ہوسکتا ہے تمہاری شکل کسی سے ملتی ہو.....مثلاً.....اس کی کسی رشتہ دار لڑکی سے؟ کھوئی ہوئی بہن سے؟

لڑکی: کسی کی بہن.....بیٹھے بٹھائے.....اپنے آپ نہیں کھو جاتی.....اس کا اغوا کیا جاتا ہے.....اور جہاں تک گھورنے کی بات ہے.....تو جج صاحب..... مرد عورت کو ہمیشہ ایک ہی مقصد کے لیے گھورتا ہے.....یہ مرد کی فطرت ہے .....ہر عورت یہ بات اچھی طرح جانتی ہے.....اور اگر نہیں جانتی تو پھر اس کو ریپ کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہئیے.....

وکیل: (ملزم سے) تم اسے کیوں گھور رہے تھے؟

ملزم: میں گھور نہیں رہا تھا.....میں اسے دیکھ رہا تھا.....

وکیل: ایک ہی بات ہے.....کیوں دیکھ رہے تھے؟

ملزم: ایک بات نہیں ہے..... گھورنا الگ بات ہے.....اور.....دیکھنا الگ.....میں شاعر بھی ہوں.....میرے ساتھ لفظوں کی بحث نہ کرو.....

وکیل: اچھا.....تو تم.....شاعر.....بھی.....ہو.....یعنی شاعر ہونے کے علاوہ.....کچھ اور بھی ہو؟

ملزم: ابھی تک کچھ اور ہونے کا موقع ہی نہیں ملا.....میں کہہ رہا تھا کہ میں شاعر بھی ہوں.....اس لیے لفظوں کے بارے میں مجھ سے بحث مت کرو..... گھورنا الگ ہوتا ہے.....اور دیکھنا الگ.....

وکیل: چلو الگ ہی سہی.....کیوں دیکھ رہے تھے؟

ملزم: (حیرت سے) کیوں دیکھ رہا تھا؟.....کمال کرتے ہو وکیل صاحب..... میں مرد ہوں..... یہ عورت ہے..... مرد ہمیشہ سے عورت کو دیکھتا آیا ہے.....عورت میں کشش ہوتی ہے.....مرد اس کشش کی طرف خود بخود کھنچتا ہے.....یہ.....یہ.....یہ ایک قدرتی بات ہے..... Natural Phenonmenon ہے.....مرد اگر عورت کی طرف دیکھے گا نہیں .....تو محبت کیسے ہوگی..... عشق کیسے ہوگا .....ریموٹ کنٹرول سے؟

وکیل: ہم م م م.....تو دیکھتے ہی تمہیں اس لڑکی سے عشق ہو گیا.....کیوں؟

ملزم: یہ میں نے کب کہا؟.....حالانکہ پہلی نظر میں بھی عشق ہو سکتا ہے..... لیکن اس دن ایسا کچھ نہیں ہوا.....اصل میں عام طور پر عشق سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھنے کا مرحلہ ہوتا ہے.....ایک ضروری اسٹیج.....اچھا لگنے کا مرحلہ.....اور..... اور.....سچ پوچھو تو مجھے یہ لڑکی اچھی لگی تھی.....(لڑکی کو دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں).....سیاہ زلفوں میں گھرا ہوا اس کا پھول جیسا چہرہ.....اور چہرے پر صبح کی پہلی کرنوں کی چمک.....کمان جیسی بھوؤں کے نیچے..... گھنی پلکوں کے جھروکوں میں سے جھانکتی ہوئی سیاہ آنکھیں.....گلاب کی پنکھڑیوں جیسے اس کے ہونٹ.. ...اور.....اور.....پتلی کمر.....میں تو فدا ہو گیا تھا.....

جج: (حیرت سے) یہ تو واقعی شاعر ہے.....

وکیل: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ آدمی خطرناک ہے یور آنر.....(ملزم سے) تم جانتے ہو کہ عورتوں کو گھورنا.....یا.....دیکھنا.....جرم ہے؟

ملزم: جرم ہے؟.....کس نے جرم بنا دیا.....اور کب سے؟.....دنیا بھر کی شاعری عورتوں کی تعریفوں سے بھری پڑی ہے.....عورت کی ہر حرکت پر.....اس کے چلنے پر.....اس کے رکنے پر.....اس کے دیکھنے کے انداز پر.....اس کے نظریں اٹھانے.....پاچھکانے پر.....کمر کے بل کھانے پر.....ابرو کی اٹھان پر.....انگڑائی

پر.....عورت کے جسم کے ہر حصے.....اس کی ہر ادا کی تعریف میں.....شاعروں نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے.....آنکھوں کو جھیلیں کہا .....زُلفوں کو گھٹائیں.... ہونٹوں کو پھول کی پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے..... یور آنر.....شاعر اگر عورت کو دیکھے گا نہیں.....اس کی صورت کو روح میں بسائے گا نہیں.....تو حسن کی تعریف میں گیت کیسے لکھے گا؟ محبت کے نغمے کیسے گائے گا؟.....مرد عورت کو دیکھے گا نہیں تو محبت کیسے ہوگی؟ عشق کیسے ہوگا؟.....اور.....اور آپ کہتے ہیں کہ عورتوں کو دیکھنا جرم ہے؟

وکیل: بالکل جرم ہے.....قانون کے خلاف.....

ملزم: یہ قانون کب بنا؟..... پہلے تو نہیں تھا یہ قانون.....

وکیل: کچھ دن پہلے..... پارلیمنٹ میں قانون قانون کھیل رہے تھے..... تو.....اتفاق سے یہ قانون بن گیا.....خیر.....(لڑکی سے) پھر تم نے کیا کِیا؟

لڑکی: میں نے تھانے میں جا کر اس کے خلاف رپورٹ لکھوا دی....

وکیل: اور..... یور آنر..... یہ ہے ملزم کے خلاف FIR نمبر چار....

لڑکی: جج صاحب.....میں اپنی رپورٹ واپس لینا چاہتی ہوں.....

جج: کیوں؟

لڑکی: اصل میں مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی.....اب مجھے ملزم کے دیکھنے کا انداز یاد آ رہا ہے.....اور.....ابھی ابھی محسوس ہوا..... کہ مجھے بھی ملزم سے محبت ہونے لگی ہے.....

میں.....سوچ رہی ہوں کہ میں شاید زندگی بھر اسی کے انتظار میں تھی.....میں رپورٹ واپس لینا چاہتی ہوں.....

جج: رپورٹ واپس نہیں لی جا سکتی.....قانون.....چابی سے چلنے والا کوئی کھلونا نہیں ہے جسے جب چاہا چلا دیا جب چاہا روک دیا.....قانون کو پہلے تو ہلانا

بھی مشکل ہوتا ہے......لیکن ایک بار قانون جب اپنی راہ پر چل پڑتا ہے تو انجام تک پہنچ کر...... یا پہنچا کر ہی دم لیتا ہے.....کارروائی جاری رہے.....

وکیل: (لڑکی سے) تم جا سکتی ہو.....تو..... یور آنر.....اب تک ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ ملزم کو جب جب اور جہاں جہاں موقع ملا.....اس نے قانون شکنی کر کے امن میں خلل ڈالا اور.....سماج کے نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی.....لیکن اب.....میں عدالت کو.....ملزم کی شخصیت کا ایک گھناؤنا پہلو دکھانا چاہتا ہوں.....ایک ایسا.....خطرناک.....ایسا خوفناک پہلو جس سے سماج کے نظام کے خلاف ملزم کی شدید violence.....اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے.....اس کے اندر کا چھپا ہوا شیطان.....اور انارکسٹ صاف نظر آنے لگتا ہے.....جو صرف اس انتظار میں رہتا ہے کہ موقع ملتے ہی زندگی کو موت میں بدل دے.....اپنی بات کی تائید میں ایک FIR پیش کرنا چاہتا ہوں یور آنر (جج کو کچھ کاغذات پیش کرتا ہے)۔

جج: کیا ہے اس FIR میں؟

وکیل: یور آنر.....اس FIR میں عینی شہادتوں نے بیان کیا ہے کہ اس آدمی نے کتنی بربریت.....کتنی بے رحمی سے.....اور.....کتنے ظالمانہ انداز میں..... ایک جاندار کی.....جان لے لی.....

جج: شہادتوں کو کیوں نہیں پیش کیا گیا؟

وکیل: یور آنر.....شہادتوں کے بیان.....اس ظالم شخص کی.....بے رحمی..... اور.....اس کے برتاؤ کی خوفناک تفصیلات کے ساتھ.....اس قدر بھرے ہوئے ہیں جنہیں سن کر.....یہاں کمرۂ عدالت میں موجود کئی لوگوں کے غش کھا جانے کا اندیشہ ہے.....اور گواہ بھی اس خوفناک منظر کی تفصیلات بتا کر درد و کرب کی کیفیت سے دوبارہ نہیں گزرنا چاہتے.....عدالت بذات خود بیانوں کا ملاحظہ کر سکتی ہے.....میں.....کھلی عدالت میں اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا کہ اس.....آدمی

نے.....ایک.....کتے کو.....پیٹ پیٹ کر مار ڈالا یور آنر.....

جج: کیا....(حیرت سے) کتے کو پیٹ پیٹ کر مار ڈالا؟.....لیکن کیوں؟

وکیل: اسی سے پوچھتے ہیں.....بتاؤ.....تم نے کتے کو کیوں مار ڈالا؟

ملزم: جج صاحب....میں ایک جھگی جھونپڑی علاقے سے گزر رہا تھا.....
ایک جھونپڑی کے باہر میں نے دیکھا کہ.....کھاٹ پر سوئے ہوئے دو مہینے کے ایک بچے کا پاؤں.....ایک کتا منہ میں دبا کر گھسیٹتا پھر رہا تھا.....کتے نے اسے گھسیٹ گھسیٹ کر مار ڈالا....میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے غصہ آ گیا.....اور....
میں نے کتے کو مار دیا.....

وکیل: وہ بچہ تمہارا بھتیجا تھا؟

ملزم: نہیں.......

وکیل: وہ بچہ تمہارا بھانجا تھا

ملزم: نہیں.....

وکیل: وہ بچہ تمہارا رشتے دار تھا

ملزم: نہیں.....

وکیل: وہ بچہ تمہارا کیا لگتا تھا؟

ملزم: کوئی بھی نہیں.....

وکیل: غور کیجیے یور آنر.....ذرا غور کیجیے.....اس بچے کی ماں.....اس کا باپ.....اور بستی کے دوسرے لوگ.....خاموشی سے.....اپنی آنکھوں کے سامنے بچے کو مرتا ہوا دیکھتے رہے....مگر انہوں نے قانون اپنے ہاتھوں میں نہیں لیا.....کتے کے خلاف کوئی غیر قانونی کاروائی نہیں کی....اب آپ اس شخص کو غور سے دیکھیے....یہ آدمی جو بچے کا کوئی نہیں تھا.....جس کا بچے سے کوئی رشتہ نہیں تھا.....اس آدمی نے.....اس کتے کو.....انتہائی بے دردی سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالا

.....اور وہ بھی بچے کو بچانے کے لیے نہیں.....بلکہ اس وقت.....جب کہ بچہ مر چکا تھا.....اس نے کتے کو انتقاماً مار دیا.....اور.....یور آنر.....قانون انتقام کی اجازت نہیں دیتا.....

جج: حالانکہ کتوں کے خلاف تشدد کا استعمال قانوناً جرم ہے.....امریکہ میں لوگ کتوں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ سوتے وقت شوہر اور بیوی اپنے درمیان کتے کو سُلاتے ہیں اور.....اور تم نے اسے پیٹ پیٹ کر مار دیا؟

ملزم: لیکن ..... شوہر اور بیوی کے درمیان سونے والے کتے..... بھوکے.....خارش زدہ.....اور آوارہ نہیں ہوتے..... یور آنر.....

جج: (جج کھڑا ہو کر چلاتا ہے) خاموش.....کتا انسان کے بغیر نہیں رہ سکتا.....کتے ہمارے سماج کا لازمی حصہ ہیں.....اس لیے تمہیں ہمارے کتوں کی سماجی زبوں حالی.....اور ان کی خراب صحت پر طنز کرنے کا کوئی حق نہیں.....اب ہماری حکومت انہیں ہیلتھ کارڈ جاری کرنے والی ہے.....(جج بیٹھ جاتا ہے اور غصے میں ہانپنے لگتا ہے)

ملزم: ہیلتھ کارڈ کے باوجود ان کا مقابلہ ان غیر ملکی کتوں سے نہیں کیا جا سکتا.....جن کا معیار زندگی.....یہاں کے انسانوں سے بھی بہتر ہوتا ہے.....

جج: کیا تمہیں پتہ ہے کہ.....مقامی کتوں کو.....ان کی اقتصادی پسماندگی کے بارے میں بھڑکا کر.....ان میں بے اطمینانی.....اور.....غیر ملکی کتوں کے خلاف منافرت پھیلانے کی کوشش میں تم پر.....مزید فرد جرم عاید ہو سکتی ہے؟

ملزم: (حیرت سے) لیکن ہم اچانک کتوں کے بارے میں اتنی سنجیدگی سے کیوں سوچ رہے ہیں یور آنر؟.....کیا ہم نے.....ملک کے انسانوں کو درپیش مسائل ختم کر دیئے ہیں؟

جج: ہم اپنے مسائل کے خاتمے کا انتظار نہیں کر سکتے.....ہمیں دنیا کے ساتھ بھی قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے.....جس طرح ہم نے بجلی، ٹیلی ویژن،

موبائل فون، گاڑی، ٹرین، جہاز، برگر، پیزا..... بریڈ.....اور ہر چیز..... غیر ملکیوں سے سیکھی ہے.....اسی طرح انہوں نے جب ہمیں بتایا کہ کتا ہمارا وفادار دوست ہے تو ہماری آنکھیں کھل گئیں....اور.....ہم نے آوارہ کتوں کو زہر دینے پر پابندی لگا دی.....اب ہم کتوں کے لیے الگ بستیاں بنا رہے ہیں.... او..ر...او..ر...تم نے اس کتے کو مار ڈالا....وحشی انسان؟

ملزم: جناب وہ کتا پاگل ہو گیا تھا....

جج: کیا؟.... پاگل ہو گیا تھا؟....تب تو تمہارا جرم زیادہ سنگین اور گھناؤنا ہو جاتا ہے....کیونکہ کوئی پاگل انسان.....اگر قتل بھی کر دے تو اسے پھانسی نہیں دی جاتی...سزا نہیں دی جاتی.....اور تم نے.....تم نے ایک پاگل کتے کو مار دیا؟..... تمہیں اپنے انسان ہونے پر شرم آنی چاہیئے.....اب ہم عالمی انسانی برادری کو کیا منہ دکھائیں گے؟

ملزم: لیکن یور آنر.....وہ ایک آوارہ کتا تھا....

وکیل: آوارہ کتا.....آوارہ کتا.....میں آج تک نہیں سمجھا کہ ان کتوں کو آوارہ کیوں کہا جاتا ہے .... یور آنر..... اگر روزی روٹی کی تلاش آوارگی ہے.....تو ہاں.... یہ کتے آوارہ ہیں.....یہ سارے لوگ.....تم جیسے یہ سارے لوگ.....جو عمر بھر..... یہاں سے وہاں .....وہاں سے یہاں.....جاتے آتے رہتے ہیں.... جانتے ہو ان کے آنے جانے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟...روزی روٹی .....تو روزی روٹی کی تلاش میں پھرنے والے ..... یہ لوگ کیا آوارہ ہیں؟...اگر نوکری.... یا کام کی تلاش میں مارے مارے پھرنا آوارگی نہیں ہے.....تو پھر روزی روٹی کی تلاش میں کسی کتے کا یہاں وہاں بھٹکنے کو آوارگی کیسے کہا جا سکتا ہے؟.....آپ نے دیکھا نہیں یور آنر.....کہ اسی لیے.....نہ صرف کتے.....بلکہ تمام جانور سر جھکائے .....زمین پر ہی کھانے کے لیے کچھ ڈھونڈتے رہتے ہیں.....اسی لیے انہیں سر اٹھانا نہیں آتا.....صرف انسان ہی ہے جو سر اٹھا کر چلتا ہے دوسرا کوئی جانور نہیں

.....ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں یور آنر..... کہ کتے..... فلمی پوسٹروں پر نیم عریاں عورتوں کی تصویریں دیکھنے کے لیے آوارگی نہیں کرتے..... بلکہ وہ تو..... کھانے کی تلاش میں یہاں وہاں آتے جاتے ہیں..... اس لیے قانون کے مطابق کسی بھی کتے کو آوارہ نہیں کہا جاسکتا.....

ملزم: آئی ایم ساری.... یور آنر..... مجھے پتہ نہیں تھا کہ اب ہمارے.... اور کتوں کے بیچ کوئی فرق نہیں رہا.....

جج: (سرد لہجے میں) قانون سے لاعلمی..... معافی کا باعث نہیں بن سکتی Ignorance of law is no excuse.....

وکیل: یور آنر..... عدالت نے دیکھا کہ..... ملزم نہ صرف ایک عادی قانون شکن ہے بلکہ اس کی فطرت میں کتنی violence ہے..... اب میں عدالت کے سامنے ایک گواہ پیش کرکے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ملزم نہ صرف عادی قانون شکن.... اور.... پُرتشدد انسان ہے.... بلکہ اسے سماجی ذمہ داری کا احساس تک نہیں ہے..... اور..... یہ شخص اپنے کردار..... اور..... عمل سے سماج کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے..... میرا آخری گواہ ہے..... بم ڈسپوزل اسکواڈ کا ایک ماہر..... (چوبدار کی طرف دیکھتا ہے)

چوبدار: بموں کا ماہر حاضر ہو و و و....

(بموں کا ماہر آکر کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہے)

وکیل: تم بم ڈسپوزل اسکواڈ میں ہو؟

ماہر: ہاں جناب۔

وکیل: بم ڈسپوزل اسکواڈ کا کیا کام ہوتا ہے؟

ماہر: جہاں بم پڑا ہو...... ہم اس کے پاس جاکر اسے Diffuse کرتے ہیں..... یعنی ناکارہ کردیتے ہیں.....

وکیل: پھر وہ پھٹتا نہیں؟

ماہر: ناکارہ ہونے کے بعد نہیں پھٹتا.....جی نہیں

وکیل: اور اگر تمہارے پہنچتے ہی پھٹ جائے تو؟

ماہر: حالانکہ ہم احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرتے ہیں.....لیکن کئی بار یہ پھٹ بھی سکتا ہے.....

وکیل: تم نے پہلے کبھی کسی بم کو Diffuse کیا ہے؟

ماہر: کئی بار.....جناب.....

وکیل: اپنی جان خطرے میں ڈال کر؟

ماہر: اب.....یہ تو ہمارا کام ہے سر.....

وکیل: اور اگر یہ خطرناک کام کرتے وقت بم پھٹ جائے.....اور تم مر جاؤ.....تو پھر؟

ماہر: تو پھر کیا جناب.....میری آخری رسوم کی ادائیگی کے دوران.....کچھ بندوقوں کے فائر سے.....مجھے سلامی دی جائے ٹیلی ویژن پر کمرشل دیکھ دیکھ کر پریشان.....میرے محلے والوں کا موڈ بندوقوں کی فائرنگ کے منظر سے ٹھیک ہو جائے گا.....اور وہ چاہنے لگیں گے کہ اس قسم کے منظر انہیں متواتر دیکھنے کو ملتے رہیں.....اور ایک دن کے لیے ملنے والی اس اہمیت سے.....میرے گھر والوں کو بھی خوشی ہوگی، جسے وہ کئی دنوں تک یاد کر کے سوچتے رہیں گے کہ کاش یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہے.....پھر میرے گھر والوں کو exgratia grant میں بیس ہزار روپیہ.....میری بیوی کو سلائی مشین.....اور گھر والوں کو ایک میڈل مل جائے گا.....سلائی مشین سے میری بیوی پھٹے پرانے کپڑوں کی مرمت کر کے اپنے آپ کو برسرِ روزگار سمجھے گی.....اور.....بیس سال بعد.....میڈل دکھانے سے.....میرے بچوں کو نوکری ملنے میں.....شاید.....آسانی ہو جائے.....

وکیل: نوکری ملنے میں شاید آسانی ہو جائے..... یور آنر..... دیکھا آپ نے؟.....ایک طرف یہ بہادر ہے.....یہ جیالا ہے.....جو.....بیس سال کے بعد

.....بچوں کو شاید مل جانے والی نوکری کے لیے.....یہ الفاظ نوٹ کیجئے یور آنر..... شاید مل جانے والی نوکری.....اور اس شاید مل جانے والی نوکری کی ہلکی سی امید میں....اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے....میں تمہارے جذبے کو سلام کرتا ہوں .....اے فرض شناس بہادر انسان.....اور دوسری طرف یہ خودغرض آدمی ہے جو لوگوں کی جان خطرے میں ڈال سکتا ہے.....(ماہر سے مخاطب ہوکر)...تم نے پہلی بار اس آدمی کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟

ماہر: میں نے پہلی بار اسے ریل کے ایک ڈبے میں دیکھا تھا.....وہ..... دراصل یوں ہوا کہ ہمارے دفتر میں پولیس کا فون آیا کہ ریل کے ڈبے میں شاید ایک بم ہے.....ہم فوراً وہاں پہنچے.....ریل کا ڈبہ خالی تھا.....سب مسافر اتر چکے تھے.....ہم بڑی احتیاط کے ساتھ.....آہستہ آہستہ ڈبے میں گئے تو دیکھا کہ یہ آدمی وہاں ایک سیٹ پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا.....

جج: ڈبہ خالی تھا؟

ماہر: جی ہاں .....ڈبے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا.....میں نے اس سے پوچھا.....بم کہاں ہے.....اس نے اپنی سیٹ کے نیچے اشارہ کیا اور کچھ لکھنے لگا.....میں نے سیٹ کے نیچے دیکھا.....وہاں ایک گٹھری پڑی تھی.....میں نے اس سے پوچھا کیا اس میں بم ہے.....اس نے کہا..... مجھے کیا پتہ؟ خود دیکھ لو.....خیر میں نے گٹھری کو بڑی ہوشیاری سے چیک کیا.....لیکن .....اس میں کچھ نہیں تھا....کوئی بم نہیں تھا....میں نے پوچھا تم کیا لکھ رہے ہو....اس نے کہا شاعری کر رہا ہوں......

(لڑکی کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سبھی اُچک کر لڑکی کی طرف دیکھتے ہیں۔ جج بھی ادھر ادھر دیکھتا ہے)

جج: عدالت میں کون رو رہا ہے؟

وکیل: یہ لڑکی رو رہی ہے یور آنر.....

جج: (لڑکی سے) تم کیوں رو رہی ہو؟

لڑکی: میں کتنی بدنصیب ہوں..... یہ میرے لیے شاعری کر رہا تھا اور میں نے اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوادی.....

جج: قانون میں جذبات کی کوئی جگہ نہیں ہوتی.....اس قسم کی جذباتی باتیں کر کے قانون کو گمراہ کرنے کی کوشش میں تم پر بھی کارروائی کی جا سکتی ہے.....اس لیے احتیاط رکھو...کارروائی جاری رہے.....

وکیل: تو.....اس گٹھری میں بم نہیں تھا.....

ماہر: جی نہیں.....

وکیل: لیکن ہو بھی سکتا تھا.....

ماہر: ہاں.....ہو بھی سکتا تھا.....

جج: (وکیل سے) کیا پولیس کو اطلاع ملزم نے دی تھی؟

وکیل: نہیں یور آنر.....

جج: تو پھر کس نے اطلاع دی؟

وکیل: کوئی اور تھا یور آنر....

جج: وہ جو بھی تھا.....یقیناً ایک ذمہ دار شہری تھا.....وہ کہاں ہے.....اس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے.....

وکیل: میرا خیال ہے وہ ذمہ دار نہیں تھا یور آنر..... ہاں باشعور ضرور تھا.....اسی لیے......بم نہ ملنے کی صورت میں روپوش ہو گیا.....کیونکہ اس پر پولیس کا قیمتی وقت.......ضائع کرنے کا مقدمہ بن سکتا تھا.....اگر وہ واقعی ذمہ دار ہوتا.....تو آخیر تک وہیں کھڑا رہ کر.....خود پر کیس بنوانے میں پولیس کے ساتھ تعاون کرتا.....

جج: چلو.....یہ بھی اچھی بات ہے کہ ہمارے ملک میں باشعور شہریوں کی

تعداد بڑھ رہی ہے.....

وکیل: یس یور آنر.....اس کے بعد پولیس نے ملزم کو حراست میں لے کر اس سے پوچھ گچھ کی.....اور بڑے حیرت انگیز انکشافات ہوئے.....ملزم نے کہا کہ وہ کیوں کسی گٹھری کے مالک کو تلاش کرتا پھرے.....ملزم نے کہا کہ آس پاس بیٹھے مسافروں کی نگرانی کرنا اس کا نہیں.....بلکہ پولیس کا کام ہے.....

جج: (ملزم سے) کیوں؟.....تم نے یہ کہا تھا؟

ملزم: بالکل.....یہ پولیس کا کام ہے.....میں اپنی بے روزگاری.....مہنگائی .....گھر.....شادی جیسے.....زندگی کے مسائل کا حل تلاش کروں یا سرکاری مصیبتوں کا حل ڈھونڈتا پھروں.....

جج: سرکاری مصیبتیں؟.....تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

ملزم: سیلاب.....طوفان.....سوکھا.....زلزلہ.....یہ قدرتی مصیبتیں ہیں..... یور آنر... Natural Disasters.....اوران آفتوں کا مقابلہ ہم سب مل جل کر کرتے ہیں.....لیکن.....یہ مہنگائی.....بے روزگاری.....رشوت خوری..... چور بازاری.....قتل و غارت.....دہشت گردی.....یہ ساری مصیبتیں.....حکومت کی پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں.....ان کا علاج حکومت کے پاس ہوتا ہے.....میں کیا کرسکتا ہوں؟

جج: لیکن.....ہر شہری پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ اپنے آس پاس رکھے گئے سامان کے بارے میں پڑتال کر لیا کرے کہ یہ کس کا ہے تا کہ اگر اس میں بم ہو تو بروقت کارروائی سے.....اس کی.....اور بہت سے دوسرے لوگوں کی جان بچ جائے.....یہ ہر شہری کا قانونی فرض ہے.....

ملزم: نہیں.....عام شہری کا فرض یہ نہیں ہے.....عام شہری کا فرض ہے کہ وہ جو کماتا ہے.....سرکار کو اس کا ٹیکس دے.....اور.....میں اِنکم ٹیکس نہیں دے سکتا کیونکہ.....یور آنر میں بے روزگار ہوں.....لیکن بے روزگار ہو کر بھی کہیں نہ

کہیں سے ادھار لے کر باقی کے تمام ٹیکس دے رہا ہوں ..... سیلز ٹیکس..... ایکسائز ٹیکس..... روڈ ٹیکس ..... یہ ٹیکس..... وہ ٹیکس..... اور ادھر اُدھر سے ادھار لے کر یہ ٹیکس میں اس لیے دیتا ہوں کہ حکومت میری حفاظت کرے..... لیکن ٹیکس دے کر بھی اگر بم..... یا غیر قانونی ہتھیار..... مجھے ہی ڈھونڈنا ہیں تو حکومت کیا کر رہی ہے؟

جج: لیکن عام شہری اگر ہوشیار نہ ہو تو وہ..... اور تم..... اور کئی دوسرے بھی کسی دھماکے میں مر بھی سکتے ہیں.....

ملزم: تو کیا کروں؟..... راستے پر چلتے ہوئے بم تلاش کرتا رہوں؟..... جہاں دیکھو لکھا ہے کہ آس پاس رکھے ہوئے سامان کے مالک کو ڈھونڈو..... راستے میں پڑی ہوئی کسی چیز کو نہ اٹھاؤ..... یہ بم ہو سکتا ہے..... سڑک کے کنارے چائے بھی پینی ہو تو آس پاس دیکھتے رہو کہ کوئی اے کے-47 لے کر تو نہیں کھڑا ہے..... کیا یہ میرا کام ہے؟ (چیخ کر) اس..... اس..... بیروزگاری..... اور بھوک میں بھی کیا مجھے سکون حاصل کرنے کا حق نہیں ہے؟..... یہ مفت کے سرکاری کام کیا مجھے فاقہ کشی میں بھی کرنا پڑیں گے؟

(عدالت میں طویل خاموشی کا وقفہ)

جج: اور اس لاپرواہی کی وجہ سے..... اگر تم خود بھی مر جاؤ تو.....

ملزم: تو جناب والا..... ویسے بھی میرے بچنے کی گارنٹی ہی کیا ہے..... میرا مرنا تو یوں بھی طے ہے..... یُوریا..... اور..... صابن ملا کر بنائے ہوئے دودھ کی چائے پی رہا ہوں..... مویشیوں کو دیئے جانے والی دوائیوں کے اِنجکشن لگا کر موٹی کی گئی زہریلی سبزیاں کھا رہا ہوں..... مہنگی اور نقلی دوائیاں کھا کر گھُل رہا ہوں..... سیمنٹ کے بغیر بنی سرکاری عمارتوں کے گر جانے پر ان کے ملبے میں اپنی قبر بنا رہا ہوں..... سڑک حادثوں میں کتے کی طرح گاڑی کے نیچے کچلا جا رہا ہوں..... یا تو گلی کے غنڈوں سے گولیاں کھا کے مروں گا..... یا لاک اپ میں پولیس کے ٹارچر سے

.....کراس فائرنگ میں ہر روز مارا جا رہا ہوں..... نقلی انکاؤنٹر میں مر رہا ہوں.... فسادوں میں کاٹا جا رہا ہوں.....اس لیے یور آنر..... کسی بس اسٹینڈ پر..... کسی ریلوے اسٹیشن پر..... کسی شاپنگ مال میں.... کسی ٹوائلٹ میں..... کبھی بھی..... کہیں بھی.....اگر کوئی دھماکہ ہو جائے .....میں اچانک لاش بن جاؤں اور میرے فوٹو پر پلاسٹک کے پھولوں کا ہار لگ بھی جائے.....تو اس میں برا کیا ہے؟.....اچھا ہی ہوگا.....سسک سسک کر فاقوں سے مرنے سے تو بچ جاؤں گا.....

جج: کیا تم اینگری ینگ مین ہو؟

ملزم: نہیں .....میرے اینگری ینگ مین بننے سے .....اس مردہ سماج کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا.....صرف میرا بلڈ پریشر بڑھ سکتا ہے.....میرے دماغ کی نسیں پھٹ سکتی ہیں.....میری موت ہوسکتی ہے.....

وکیل: لیکن بے روزگار ہونے کے باوجود.....نہ صرف شاعری کرنے کی عیاشی کر سکتے ہو..... بلکہ آزادی کے بدلے نبھائے جانے والے چند بنیادی فرائض کی ادائیگی سے انکار کر کے.....اور شہریوں کی سلامتی خطرے میں ڈال کر.....ملک وقوم سے غداری بھی کرتے ہو.....تو..... یور آنر.....آپ نے دیکھا کہ ملزم نہ صرف ایک عادی قانون شکن ہے..... بلکہ اس کا social behaviour بھی سماج کے لیے کتنا خطرناک ہے.....اس لیے عدالت سے میری گزارش ہے کہ سماج میں لا اینڈ آرڈر کے استحکام کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ ایسے عناصر کو سخت سے سخت سزا دی جائے تا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو.....دیٹ از آل.....یور آنر....

(جج فائلوں کو اُلٹتا پلٹتا ہے۔لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگتے ہیں۔تھوڑی دیر بعد)

جج: آرڈر.....آرڈر.....اس مقدمے کے تمام گواہوں کے بیانات سننے کے بعد یہ عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزم نہ صرف ایک عادی قانون شکن ہے بلکہ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ بھی خودکُش ہے....اسے نہ اپنی زندگی

کی پرواہ ہے نہ ہی عام شہریوں کی زندگی کی فکر.....اس کا یہ suicidal نظریہ سماج کے لیے انتہائی خطرناک ہے.....اس لیے یہ عدالت بے شک اسے مجرم قرار دیتی ہے.....جہاں تک سزا کا سوال ہے.....تو.....مجرم کو سزا دینے کے دو مقصد ہوتے ہیں.....ایک یہ.....کہ دوسروں کو عبرت ہو.....اور دوسرا یہ کہ خود مجرم کو احساسِ ندامت ہو.....پچھتاوا ہو.....کہ اس نے سماج میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے خلاف کتنا بڑا جرم کیا ہے.....اپنے عمل سے.....یا اپنی غیر عملی سے.....باقی شہریوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالا ہے.....لیکن.....جہاں تک اس مجرم کا تعلق ہے.....اس مجرم کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اسے اپنے کیے.....یا.....ان کیے پر.....کوئی افسوس نہیں ہے.....اور نہ ہی اسے بھلے برے کی تمیز ہے.....جس سے پتہ چلتا ہے کہ مجرم اپنے ہوش وحواس میں نہیں.....بلکہ ذہنی طور پر بیمار ہے.....پھر بھی.....مجرم کو سزا ملے گی.....مگر سب سے پہلے تو سزا ان لوگوں کو ملنی چاہئیے جو مجرم کی اس نفسیاتی حالت ... .. اس..... اس.... psychological بیماری کے ذمہ دار ہیں.. ... یقیناً پولیس نے مجرم کے والدین کو تو گرفتار کیا ہوگا..... کیونکہ ان کی غلط تربیت کی وجہ سے ہی یہ مجرم اس حال کو پہنچا ہے.....اگر انہوں نے غفلت نہ برتی ہوتی.....اور حکومت کو بروقت اطلاع دی ہوتی.....تو اس مجرم کا علاج ہوسکتا تھا.....اسے ایک کارآمد اور اطاعت گزار شہری بنایا جاسکتا تھا.....

وکیل: یور آنر.....میں عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ پولیس نے انہیں گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی.....لیکن.....

جج: لیکن کیا؟

وکیل: لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ میں عدالت کو بتا رہا ہوں کہ.....وہ قانون کے لمبے ہاتھوں کی پہنچ سے باہر نکل گئے ہیں.....

جج: (غصیلے لہجے میں) کیا وہ روپوش ہوگئے ہیں؟.....اگر ایسا ہوا ہے تو یہ

عدالت اس مجرمانہ غفلت کے ذمہ داروں کے خلاف سخت کاروائی کرے گی.... یا کہیں یہ تو نہیں ہوا کہ وہ کسی ایسے ملک میں چلے گئے ہیں جس کا ہمارے ساتھ..... فرار مجرموں کی واپسی کا معاہدہ نہیں ہے.....

وکیل: نہیں یور آنر..... اس سے بھی آگے..... وہ..... قانون کو دھوکا دے کر..... اپنے جرم کی سزا بھگتنے سے پہلے ہی..... مر چکے ہیں.....

جج: مر چکے ہیں؟... کیسے؟

وکیل: وہ ندی پار کر رہے تھے..... اچانک سیلاب آیا..... اور وہ بہہ گئے.....

جج: دونوں؟

وکیل: یس یور آنر.....

جج: ندی میں بہہ گئے؟ چ چ چ..... (تعجب و حیرت سے)

(بہت دیر تک افسوس میں سر ہلاتا رہتا ہے)

جج: کمال ہے..... لوگ بھی قانون سے بچنے کے لیے کیسے کیسے طریقے ڈھونڈ لیتے ہیں..... خیر..... کسی بھی آدمی کی شخصیت کی تعمیر میں نہ صرف اس کے والدین ..... بلکہ اس کے دوست ..... اس کے محلے والے... اس کے اسکول کے ٹیچر... سب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے..... ان سبھی لوگوں کے خلاف..... کسی نہ کسی حد تک..... ذمہ داری میں کوتاہی کا جرم بنتا ہے.... اور یہ آدمی اگر آج مجرم بن کر سامنے کھڑا ہے تو اس میں ان سب لوگوں کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک بنتی ہے.... کیا ان میں سے کسی کو گرفتار کیا گیا ہے؟

وکیل: یور آنر..... اس ملزم کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ اپنی ہر قانون شکنی کے بعد میڈیا کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا رہا ہے..... یہ میڈیا کو اپنے ساتھ ہی لیے چلتا ہے..... بس کی واردات تھی..... پارک میں پھول توڑنے کی بات تھی.. ... چائے کی دکان کا مسئلہ تھا..... یا پھر ریل کے ڈبے میں بم کی تلاش..... ملزم نے جب بھی قانون شکنی کی کسی واردات کو سرانجام دیا.....

میڈیا کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا....اور اس طرح اس کا کیس.... اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ..... آپ کمرۂ عدالت میں یہ بھیڑ ہی دیکھ لیجیے.....کافی عرصے کے بعد عدالت کے باہر میڈیا کا مجمع لگا ہے یور آنر.....

جج: لیکن کیس کی اتنی پبلسٹی کیوں ہونے دی گئی؟..... پولیس نے احتیاط کیوں نہیں برتی؟

وکیل: پولیس کا کوئی قصور نہیں یور آنر.....اخباروں میں کورپشن.....اسکینڈل اور فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں دیکھ دیکھ کر.....لوگ بور ہو گئے ہیں....خبروں کی تلاش میں الکٹرانک میڈیا کا یہ حال ہے کہ کسی حادثے میں زخمی ہونے والے کو اسٹریچر پر اسپتال لے جاتے وقت .... اینکر پوچھتا ہے.....اب آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے.... یا..... پولیس اسٹیشن میں ریپ کی رپورٹ لکھوانے کے لیے آنے والی روتی ہوئی عورت کے آگے مائک رکھ کر اینکر پوچھتا ہے.....کہ ریپ ہوتے وقت آپ کو کیسا لگ رہا تھا.....کیا آپ نے ریپ کو انجوائے کیا؟ .....ملک بھر میں کوئی خبر ہی نہیں رہی یور آنر..... پہلے جو خبریں ہوتی تھیں..... اب وہ عام باتیں ہو گئی ہیں....اسی لیے یہ کیس اتنا مشہور ہو گیا.....میں عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ..... پولیس نے مجرم کے والدین کی موت کی اطلاع ملتے ہی .....فوراً.....سب کے گھروں پر چھاپے مارے....مگر سزا کے ڈر سے وہ سب لوگ.....اپنے اپنے گھروں کو.....اونے پونے میں بیچ کر..... یا چھوڑ چھاڑ کر فرار ہو گئے ہیں.....

جج: (طنزیہ لہجے میں) یا پولیس نے پیسے لے کر خود انہیں فرار کروا دیا؟.....یہ عدالت پولیس کی غیر ذمہ داری کا سخت نوٹس لیتے ہوئے ان تمام لوگوں کو فرار قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف بلا ضمانتی وارنٹ جاری کرنے کے ساتھ پولیس کو وارننگ دیتی ہے کہ ملزموں کو جلد سے جلد گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ مجرم کو اس حالت میں پہنچانے میں........ان لوگوں کی

ذمہ داری کی حد.....فرداً فرداً طے کی جائے.....اوراس کے مطابق انہیں سزا دی جائے.....اسی سے باقی سماج کو عبرت حاصل ہوگی کہ قانون کو نظر انداز کرنا ایک سنگین جرم ہے.....دراصل سماج کے تیئں فرائض سے ہماری غیر ذمہ داری.....اور لاپرواہی.....اس قسم کے مجرموں کی پیدائش.....اور.....افزائش کا باعث بنتی ہے جو بعد میں سماج کے لیے ایک خطرہ بن جاتے ہیں.....عدالت حکم دیتی ہے کہ اس مجرم کو سخت حفاظتی نگہداشت میں رکھا جائے.....عدالت برخاست کی جاتی ہے.....

لڑکی: (چیخ کر) یہ ظُلم ہے.....اس معصوم انسان کو چھوڑ دو.....چھوڑ دو..... یہ ظُلم ہے.....ظُلم ہے.....

جج: نہیں..... یہ قانون ہے.....اور قانون شکنی برداشت نہیں کی جائے گی.....کسی بھی قیمت پر.....

(ملزم کو ہتھکڑی لگا کر باہر لے جایا جاتا ہے۔لڑکی سسکنے لگتی ہے اور ملزم کے پیچھے پیچھے جاتی ہے)

............☆☆☆............

میڈیا کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا....اور اس طرح اس کا کیس....اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ..... آپ کمرۂ عدالت میں یہ بھیڑ ہی دیکھ لیجیے.....کافی عرصے کے بعد عدالت کے باہر میڈیا کا مجمع لگا ہے یور آنر.....

جج: لیکن کیس کی اتنی پبلسٹی کیوں ہونے دی گئی؟..... پولیس نے احتیاط کیوں نہیں برتی؟

وکیل: پولیس کا کوئی قصور نہیں یور آنر.....اخباروں میں کورپشن.....اسکینڈل اور فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں دیکھ دیکھ کر.....لوگ بور ہو گئے ہیں....خبروں کی تلاش میں الکٹرانک میڈیا کا یہ حال ہے کہ کسی حادثے میں زخمی ہونے والے کو اسٹریچر پر اسپتال لے جاتے وقت .... اینکر پوچھتا ہے.....اب آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے .... یا..... پولیس اسٹیشن میں ریپ کی رپورٹ لکھوانے کے لیے آنے والی روتی ہوئی عورت کے آگے مائک رکھ کر اینکر پوچھتا ہے....کہ ریپ ہوتے وقت آپ کو کیسا لگ رہا تھا.....کیا آپ نے ریپ کو انجوائے کیا؟ .....ملک بھر میں کوئی خبر ہی نہیں رہی یور آنر..... پہلے جو خبریں ہوتی تھیں ..... اب وہ عام باتیں ہو گئی ہیں....اسی لیے یہ کیس اتنا مشہور ہو گیا.....میں عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ..... پولیس نے مجرم کے والدین کی موت کی اطلاع ملتے ہی .....فوراً.....سب کے گھروں پر چھاپے مارے....مگر سزا کے ڈر سے وہ سب لوگ.....اپنے اپنے گھروں کو.....اونے پونے میں بیچ کر..... یا چھوڑ چھاڑ کر فرار ہو گئے ہیں.....

جج: (طنزیہ لہجے میں) یا پولیس نے پیسے لے کر خود انہیں فرار کروا دیا؟.....یہ عدالت پولیس کی غیر ذمہ داری کا سخت نوٹس لیتے ہوئے ان تمام لوگوں کو فرار قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف بلا ضمانتی وارنٹ جاری کرنے کے ساتھ پولیس کو وارننگ دیتی ہے کہ ملزموں کو جلد سے جلد گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے تا کہ مجرم کو اس کے صحیح مقام تک پہنچانے میں.......ان لوگوں کی

ذمہ داری کی حد.....فرداً فرداً طے کی جائے.....اوراس کے مطابق انہیں سزا دی جائے.....اسی سے باقی سماج کو عبرت حاصل ہوگی کہ قانون کو نظر انداز کرنا ایک سنگین جرم ہے.....دراصل سماج کے تیئں فرائض سے ہماری غیر ذمہ داری.....اور لاپرواہی.....اس قسم کے مجرموں کی پیدائش.....اور......افزائش کا باعث بنتی ہے جو بعد میں سماج کے لیے ایک خطرہ بن جاتے ہیں.....عدالت حکم دیتی ہے کہ اس مجرم کو سخت حفاظتی نگہداشت میں رکھا جائے.....عدالت برخاست کی جاتی ہے.....

لڑکی: (چیخ کر) یہ ظلم ہے.....اس معصوم انسان کو چھوڑ دو.....چھوڑ دو.....یہ ظلم ہے.....ظلم ہے.....

جج: نہیں..... یہ قانون ہے.....اور قانون شکنی برداشت نہیں کی جائے گی.....کسی بھی قیمت پر.....

(ملزم کو ہتھکڑی لگا کر باہر لے جایا جاتا ہے۔لڑکی سسکنے لگتی ہے اور ملزم کے پیچھے پیچھے جاتی ہے)

...........☆☆☆...........

☆......ریاض معصوم قریشی

دو بوند جگر سوز

کردار

☆ پیرومرشد ☆ برزخ

☆ میوہ فروش ☆ چھاپڑی فروش

☆ سلطان چھاپڑ ☆ رحیمن بوا

☆ چاند ☆ شبنم

☆ ملکۂ عالیہ ☆ شاہ زیب

☆ سلطان فیروز شاہ ☆ وزیر اعظم

☆ شاہی قصاب ☆ بکرا

سین......ا

(ابتدائی موسیقی کے بعد پیش منظر میں سرگوشیاں اک شور سا بن کر ابھرتی ہیں پھر اُس شور پر ایک پُر جلال و پُر شوق آواز غالب آ جاتی ہے)۔

مرشد: (پُر جوش انداز میں وظیفے کا وِرد کرتے ہوئے) اللہ ہو، حق اللہ......ہُو ہو......حق اللہ ہو......ہُو ہو، اللہ ہو......حق اللہ ہو......فقیر کو تنگ نہیں کرتے......جاؤ بچہ جاؤ

برزخ: (عاجزی سے بھرپور آواز) پیرو مرشد...... بس اک نظرِ عنایت...... دستِ عنایت میری طرف بڑھایئے، پیرو مرشد......

مرشد: اللہ ہو...... میں حقیر کیا...... میری ذات کیا بچہ...... ہُو ہُو...... اللہ ہو...... مجبور ہوں، بے بس ہوں...... اک بندہ عاجز ہوں...... بس ذاتِ پاک ربِ عظیم کو ہر وقت یاد کرو...... اللہ ہو...... حق اللہ ہو...... ہواللہ......

برزخ: پیرومرشد...... آپ تو محبوب خدا ہیں...... میں بس ایک دعا کامحتاج ہوں...... پیرو مرشد اپنا دستِ شفقت میرے سرپر رکھئے......

مرشد: (بدستور پُر جوش انداز میں...... نعرۂ مستانہ مارتے ہوئے) حق اللہ...... ہو...... حق اللہ...... اللہ ہو اللہ ہو...... ہم عاجز بندے ہیں...... نیلی چھتری والا مہربان...... رحیم ہے بچہ...... حق اللہ ہو...... وہی ہے جس سے مانگا جائے...... وہ عنایت کرتا ہے...... حق اللہ ہو...... جاؤ بچہ جاؤ......

برزخ: پیرومرشد...... ناامیدی تو آپ کے حجرے کی شان کے خلاف ہے...... بس ایک نظر میرے حال پر......

مرشد: حق اللہ...... ہُو ہُو...... حقیر تہی دست ہے...... تہی دامان ہے...... اس فقیر کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے...... مانگو...... عاجزی سے مانگو...... اس بے نیاز نیلی چھتری والے سے...... حق اللہ ہو...... اللہ ہو......

برزخ: یاپیرِ روشن ضمیر...... اس نالائق ونامراد میں مانگنے کا ڈھنگ ہے نہ ہنر...... اسی لئے آپ کے مبارک حجرے کی قدم بوسی کے لئے آگیا...... تاکہ نامراد...... شاد ہو جائے......

مرشد: حق اللہ ہو...... دیکھ بچہ...... بیکاری، بے روزگاری...... حق اللہ ہو...... رزاق وہ خود ہے...... اللہ ہو...... جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے...... حق اللہ ہو...... ہُو ہُو......

برزخ: (بھرائی ہوئی آواز میں) مرشد...... اپنی طرف سے ہر کوشش کر ڈالی...... مگر بس نامرادی حصے میں آئی...... پیرومرشد...... ہر محکمے میں رشوت کا چلن ہے...... قابلیت اور ڈگری کی کوئی قدر نہیں...... کنبہ پروری کی سیاست ہے...... پیرو مرشد، سفارش کا سکہ رائج الوقت ہے۔ غریبوں، ناداروں، محتاجوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں...... بس آپ کا در ہے اعلیٰ حضرت۔ اگر یہاں سے بھی نامراد نکل جائیں......

مرشد: حق اللہ ہو...... ہُو ہُو...... بچہ تو کفر کی طرف قدم بڑھا رہا ہے...... کہ مایوسی کفر ہے۔ حق اللہ ہو...... اللہ ہو...... اللہ ہو...... بچہ یہ نیلی چھتری والے کے بھید بھاؤ ہیں...... حق بے نیاز ہے...... بھید بھاؤ میں نہ الجھو...... بس تو وہی کر...... جو اپنے بس میں ہے...... حق اللہ ہو، حق اللہ...... ہُو ہُو اللہ ہو......

برزخ: یا پیرومرشد...... چاروں طرف اک طوفانِ بدتمیزی بپا ہے...... یہاں ناداروں، غریبوں اور محتاجوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے...... اعلیٰ حضرت جو رہبر بنے پھرتے ہیں، وہ راہ زن ہیں...... جو راہنما نظر آتے ہیں راہ سے بھٹکاتے ہیں بالآخر قبرستانوں میں پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں...... پیرومرشد یہ سب کچھ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا...... یہاں تک کہ میں اپنی ذات بھول گیا...... غریبوں اور مصیبت کے ماروں کے غم واندوہ کو میں نے اپنی ذات بنالیا...... میں نے فیصلہ کیا اعلیٰ حضرت کہ ان غم والم کے ماروں کا رہبر بنوں گا...... راستے سے بھٹکائے ہوؤں کا راہنما بنوں گا...... بس آپ کے دستِ شفقت بڑھانے کی دیر ہے پیرومرشد......

مرشد: حق اللہ ہو، حق اللہ...... بچہ جو چاہو کرو...... مرضی کے مالک...... حق اللہ ہو...... احقر کو تنگ نہ کرو جاؤ...... بچہ...... سیاست کا شوق چرایا...... کرو...... کسی نے روکا ہے...... حق اللہ ہو......

برزخ: پیرِ روشن ضمیر...... ہمارے رہنما سیارت دان عوام کو ان کا من چاہا سُر سناتے ہیں اور بادشاہ کے سامنے اس کا من پسند راگ الاپتے ہیں۔ آپ روشن ضمیر ہیں اعلیٰ حضرت...... آپ سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے...... یہ سیاسی بازی...... اصل میں منہ کھولے ہوئے مگر مچھ ہیں...... عوام کو نگل جاتے ہیں...... وقت پڑنے پر آنسو بھی بہاتے ہیں...... اعلیٰ حضرت...... عوام کو ان مگرمچھوں سے نجات دلانا وقت کی اہم ضرورت ہے...... میں نجات دہندہ بنوں گا اعلیٰ حضرت...... عوام کی خدمت بھی تو عبادت ہے......

مرشد: حق اللہ ہو...... ہو اللہ ہو...... بچہ...... عوام تو پہلے ہی سے لیڈروں کے بوجھ تلے دب گیا ہے...... حق اللہ ہو...... اللہ ہو...... اب اگر بچہ تو عوام کی فلاح چاہتا ہے...... تو جاؤ...... کوئی چوراہا پکڑ بیٹھو...... حق اللہ...... تقریریں جھاڑو...... لوگ آجائیں گے۔ پھر چاہے جتنی ان کی خدمت کرو...... بچہ مجھے تنگ نہ کرو...... اس فقیر کے پاس تجھے دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ حق اللہ۔

برزخ: پیرومرشد، اپنا دستِ شفقت میرے سر پر رکھئے...... کہ لوگوں کو مجھ پر اعتبار آجائے۔

مرشد: (پُر جلال آواز میں تنبیہ کرتے ہوئے) بچہ جاؤ...... تنگ نہ کرو فقیر پُر تقصیر کو...... حق اللہ ہو...... اگر یہ فقیر جلال میں آگیا...... تو...... اللہ رحم...... مولا رحم...... اے نیلی چھتری والے، اپنے عتاب سے بچا......

برزخ: (مجنونانہ انداز میں) پیرومرشد...... میں اپنی جان دوں گا مگر تب تک آپ کا یہ در نہ چھوڑوں گا جب تک آپ کا دستِ عنایت میری طرف نہ بڑھے۔

مرشد: حق اللہ ہو...... سر پر کفن باندھ کر نکلا ہے بچہ...... بچے ہو ضد نہ کرو...... جاؤ۔

برزخ: پیرومرشد...... یا آپ کے حجرے میں جان دوں گا یا آپ کا دست دعا لے کر سرخرو ہو جاؤں گا......

مرشد: حق اللہ ہو......ٹھیک......اب اگر تو سر پر کفن باندھے فقیر کو تنگ کرنے پر ہی تلا ہے تو ٹھیک ہے......میں تعویذ بنا دیتا ہوں تمہارے لئے......

برزخ: (بے حد خوش ہو کر چیختے ہوئے) یا پیر روشن ضمیر......میرا بیڑا پار لگ گیا......

مرشد: مگر بچہ......تعویذ لکھنے کی روشنائی تو ختم ہو گئی ہے......حق اللہ ہو......اللہ ہو......
بچہ تجھے میرے لئے بازار سے روشنائی لانی پڑے گی......

برزخ: (خوشی سے) پیرِ روشن ضمیر......جو حکم ہو بجالاؤں گا......

مرشد: حق اللہ ہو......بچہ تو بازار جا......"جگر سوز" لے کر آ......

برزخ: جگر سوز، پیر و مرشد۔

مرشد: یہ روشنائی کا نام ہے۔ "جگر سوز" اللہ ہو......بس دو بوند لانا......

برزخ: دو بوند جگر سوز......اعلیٰ حضرت، ابھی حاضر کرتا ہوں۔

مرشد: دو بوند جگر سوز سے میں تعویذ پر تمہاری کامیابی کے لئے دعا لکھوں گا۔ پھر دیکھنا لوگ تجھ پر اعتبار کریں گے۔

برزخ: اعلیٰ حضرت......میرا بیڑا پار لگ گیا۔

(موسیقی میں برزخ کی خوشی سے بھرپور آواز جذب ہو کر ڈوب جاتی ہے۔)

سین......۲

(بازار کی چہل پہل......چھاپڑی فروشوں کی آوازیں......تاثر......یہ ابھرتا ہے)۔

(خرید و فروخت بازار میں اپنے عروج پر ہے)۔

(میوہ فرش کی آواز پیش منظر میں ابھرتی ہے)

چھاپڑی فروش: (پکارنے والی، دعوت دینے والی آواز......) میوہ لے لو......تازہ پھل لے لو......

تازہ تازہ......آؤ بھئی آؤ......تازہ میوہ سستا لے لو......

(اپنے ساتھ بڑ بڑاتے ہوئے) ار...... ارے پتہ نہیں اُسے کیا ہو گیا...... بہت دیر سے ساکت کھڑا ہے...... میرے میوے کو گھورے جا رہا ہے...... ہائے کہیں میوے کو اُس کی نظر نہ کھا جائے...... (اُس آدمی کو پکارتے ہوئے) ارے سنیئے......

ارے تم سے...... ہاں ہاں تم سے کہہ رہا ہوں بھائی...... آجاؤ...... آجاؤ...... قریب آجاؤ...... ساکت کیوں کھڑے ہو بھئی...... آجاؤ...... پھل دیکھو...... تازہ ہے تازہ......

برزخ: (نزدیک آئی ہوئی آواز) آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں......

چھاپڑی فروش: ہاں ہاں شہزادے...... آپ ہی سے کہہ رہا ہوں...... میوہ دیکھو...... تازہ ہے بالکل تازہ...... بازار میں اور کہیں ایسا تازہ میوہ دستیاب نہیں...... ارے بھئی...... سوچنا کیا ہے۔ شہزادے...... فرماؤ جی...... کون سا میوہ پسند ہے...... اور کتنا تولوں...... ایک کلو...... دو کلو...... فرماؤ شہزادے صاحب...... ارے بھئی...... اگر کم بھی چاہئیے...... تو شرماؤ نہیں شہزادے صاحب...... کچھ تو منہ سے بولو......

برزخ: مجھے جگر سوز چاہئیے...... دو بوند...... اگر دستیاب ہو تو دے دیجئے......

میوہ فروش: کیا چاہیئے؟

برزخ: جگر سوز...... دو بوند...... کہیں نہیں مل رہا......

میوہ فروش: (حیرت سے بھری آواز میں) جگر سوز...... جگر سوز...... یہی کہا نا شہزادے......

برزخ: ہاں بھائی میوہ فروش...... بہت ڈھونڈا...... کوئی جگہ نہیں چھوڑی...... کہیں نہیں ملا...... اب اس بازار میں آیا ہوں شاید ملے...... بھائی کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دو بوند جگر سوز کہاں ملے گا......

میوہ فروش: (اپنے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے) دماغ سے پاگل لگتا ہے...... یا سر پھر گیا ہے بیچارے کا...... (پھر قہقہہ لگاتا ہے) ارے شہزادے صاحب...... پہلے بتادیتے...... بڑی دیر سے سوچ میں تھے......شہزادے نہ ہی میرا وقت کھوٹا ہو گیا ہوتا اور تمہیں بھی اپنی چیز ملی ہوتی......

برزخ: (خوشی سے) کیا یہ سچ ہے؟

میوہ فروش: (قہقہہ لگاتے ہوئے) سچ نہیں تو اور کیا......

برزخ: سچ پوچھو تو بھائی ہمت نہیں پڑ رہی تھی...... ہمت اس لئے نہیں پڑ رہی تھی کہ جس جس سے دو بوند جگر سوز طلب کیا...... وہ یا تو میرا انداق اڑانے لگا یا مارنے کو دوڑا...... بہت بار میری پٹائی بھی کی گئی......اور باورا اور پاگل بھی کہا گیا......

میوہ فروش: (بڑبڑاتے ہوئے) تم تو ایک نمبر کے پاگل ہو...... تمہیں پاگل خانے میں ہونا چاہئیے تھا...... (برزخ سے) وہ خود پاگل جو تمہیں پاگل سمجھے شہزادے......

برزخ: کیا بتاؤں بھائی...... پیرو مرشد کا حکم ہے...... حکم بجا لانا...... مجھ پر چاہے جو بن پڑے......دو بوند جگر سوز دستیاب کرنے ہیں......

میوہ فروش: واہ رے پیرو مرشد کے مرید...... (پھر دوسرے دکانداروں اور چھاپڑی والوں کو ہنستے ہنستے آوازیں لگا لگا کر) ارے سن رہے صدیق......ارے او علی کمہار......ارے سنو غلام غلہ فروش......ارے سب ادھر آؤ فوراً...... جلدی آجاؤ بھئی......جلدی......

غلام غلہ فروش: (نزدیک آتے ہوئے) ارے بھئی کیا ہے مسئلہ......خیر تو ہے۔

علی کمہار: بھئی مسئلہ کیا ہے؟ کیا تماشہ لگا رکھا ہے......؟

میوہ فروش: (قہقہہ لگاتے ہوئے...... طنزیہ، مذاق اڑاتے ہوئے برزخ کا) ہاہاہا...... ہاہاہا۔ اس شہزادے صاحب کو دیکھو...... یہ گاہک ہے؟ انوکھا گاہک۔ شہزادے صاحب کو اچھی طرح دیکھ لو......

ایک دوسری آواز: (نزدیک آتی ہوئی) بازار کا شور آوازوں میں سے بھری ہوئی آواز ارے یہ پاگل ہے سُلہ...... پکا پاگل ہے ہاہاہا...... میرا وقت کھوٹا کیا...... ارے کیسے کیسے پاگل آتے ہیں بازار میں...... میں نے بھی ایک دولاتیں مارلی...... تب کہیں جاکر پیچھا چھوڑا...... ہاہاہا...... ہاہاہا...... ڈھونڈتا کیا ہے باورا...... دو بوند جگر سوز......

(مجمع سے حیرت ناک آوازیں ابھرتی ہیں) کیا؟ کیا؟ دو بوند......

میوہ فروش: جگر سوز...... ہاہاہا...... پھر میں بھی کیوں نہ اس کا دماغ درست کردوں...... ہاہاہا......

برزخ: (درد سے بھرپور آوازیں ابھرتی ہیں) ہے ہے...... مجھے مت مارو...... ارے خدا کے لئے...... مت مارو غریب کو...... ارے اماں...... مجھے بچاؤ...... خدا کے لئے...... مجھے مت مارو...... مجھے معاف کردو...... مجھے معاف کردو...... خدارا مجھے معاف کرو......

دوسری آواز: (زہر میں بجھی ہوئی آواز) زور زور سے مارو، اس باورے کو...... ارے صبح صبح میرا دماغ کھا گیا...... اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردو...... تاکہ کسی اور کو تنگ نہ کرے۔

برزخ: (مسلسل درد سے بھرپور آواز) ارے مر گیا میں...... خدارا معاف کرو......

ایک آواز: ارے بھاگ جا...... پاگل...... بھاگ جا...... ارے چھوڑو...... اس کو...... پاگل ہے...... جانے دو......

(قہقہوں سے بھرپور آواز میں بررخ کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز)

مجمع سے: ارے بھاگ گیا پاگل...... ہاہاہا......

ایک آواز:

(موسیقی کی لہر میں برزخ کے ہانپنے کی آواز ڈوب جاتی ہے)

سین......۳

(پیش منظر میں برزخ کے ہانپتے اور اپنا دم سنبھالنے کی آواز آتی ہے)

برزخ: (ہانپتے ہوئے) بھاگ گئے...... ہاں...... شکر خدا کا...... مشکل سے جان بچی...... اے پیرومرشد یہ مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا......

سلطان چھاپڑی: (آواز دیتے ہوئے) ارے رک جاؤ بھئی...... رک جاؤ...... کب سے آوازیں دے رہا ہوں......

برزخ: (گھبراتے ہوئے ایک بار پھر بھاگنے کے لئے پرتولتے ہوئے) نن نن...... ارے مر گیا تو برزخ...... ابھی پیچھا نہیں چھوڑا...... بھاگ......

سلطان چھاپڑی: ارے ارے رک جاؤ...... بھاگو مت...... تمہیں جس چیز کی تلاش ہے وہ میرے پاس ہے۔

برزخ: نن نہیں...... میں نہیں رکتا...... تم بھی مجھے پیٹو گے......

سلطان چھاپڑی: نہیں...... نہیں رک جاؤ...... مجھ سے جو چاہے قسم لے لو...... میں تمہیں تمہاری مطلوبہ چیز دے دوں گا۔

برزخ: کیا تم سچ کہہ رہے ہو......؟

سلطان چھاپڑی: ہاں...... کہا نا مجھ سے جو چاہے قسم لے لو......

برزخ: (ہانپتے ہوئے) کیا تم جگر سوز دو بوند مجھے دو گے......

سلطان چھاپڑی: (نزدیک پہنچتے ہوئے) ضرور مہیا کروں گا...... پہلے ذرا اپنا دم درست کر لو...... آؤ...... آؤ...... ادھر بیٹھ کر...... اطمینان سے بات کرتے ہیں......

برزخ: بچ چلو......اب چاہے جو مقدر میں ہو......ہاں تو چاچا......اگر مجھے مارنا چاہتے ہو تو پہلے ہی شروع کرو......

سلطان چھاپڑی: دیکھ بچے......پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں......ادھر بازار میں نا...... میں نے لوگوں کو تمہیں مارتے پیٹتے ہوئے دیکھا......تمہاری بے اختیار نکلنے والی چیخیں میرے اس دل پر جیسے ہتھوڑا بن کر برس پڑیں......

برزخ: کیا بولوں چاچا......ادھ موا کر کے رکھ دیا ظالموں نے......ایک ایک عضو دکھ رہا ہے میرا...... پتہ نہیں کن گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں چاچا......

سلطان چھاپڑی: بچے اپنی غلطی نہیں دیکھتے ہم۔

برزخ: غلط غلطی......کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی۔

سلطان چھاپڑی: ہاں......بہت بڑی غلطی ہوگئی تم سے بچے۔

برزخ: اچھا آ......

سلطان چھاپڑی: یہ غلطی نہیں تو اور کیا......تم اندھوں سے آئینہ مانگتے ہو۔

برزخ: ہاں......تو چاچا تم نے ٹھیک کہا......

سلطان چھاپڑی: کہانا......اب رہی تمہاری چیز......میں بتاؤں گا تجھے کہاں ملے گی۔

برزخ: کیا سچ......

سلطان چھاپڑی: سلطان چھاپڑی کبھی جھوٹ نہیں بولتا......تمہاری حالت پر رحم آیا......

برزخ: (سوچتے ہوئے) مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر......تو نے مجھ پر رحم کھایا......یا الرحمٰن الراحمین......اے میرے مولا تو نے سلطان چھاپڑی کی صورت میں جیسے میرے لئے فرشتہ بھیجا......اے ربِ عظیم تو نے اس عاجز بندے کی بالآخر سن ہی لی......

سلطان چھاپڑی: کس سوچ میں غلطان و پیچان ہو......

برزخ: (چونک کر) چاچا......یقین نہیں آرہا تھا اپنے کانوں پر......اللہ تمہیں عزت سے نوازے چاچا......اتنی عزت دے کہ بادشاہ تمہیں اپنا وزیر چُن لے......اچھا......چاچا......جاؤ پھر نکالو......دو بوند

سلطان چھاپڑی: جگر سوز......

برزخ: ہاں ہاں نکالو......

سلطان چھاپڑی: بوا رحیمن......جگر سوز تمہیں، بوا رحیمن سے ملے گا۔

برزخ: بوا رحیمن......یہ بوا رحیمن کون ہے۔

سلطان چھاپڑی: بوا رحیمن بڑی پہنچی ہوئی خاتون ہیں......ایسی ایسی نادر و نایاب بوندیں اپنے پاس رکھتی ہیں......کہ ایک بوند سے ہی آدمی کی روح سرشار ہوتی ہے......

برزخ: اچھا آ......

سلطان چھاپڑی: ہاں......ایک بار بوا رحیمن کے پاس پہنچ گئے نا اپنے سب دُکھ درد بھول جاؤ گے......

برزخ: چاچا......بوا رحیمن......کہاں ملے گی......

سلطان چھاپڑی: یہاں سے زیادہ دور نہیں جانا ہے......تم ایسا کرو...... یہاں سے سیدھا وہ راستہ لو......آگے چل کر بائیں جانب ایک گلی ملے گی......اُسی گلی میں آگے ایک گھاس پھوس والا کچا مکان ملے گا۔ بس سیدھے اندر جانا......مگر میرا ذکر کرنا نہ بھولنا......

برزخ: اچھا چاچا..........تو پھر میں چلتا ہوں۔

سلطان چھاپڑی: جاؤ جاؤ......ہاں سلطان چھاپڑی کا نام لینا نہ بھولنا......

(موسیقی)

سین......۴

(پیش منظر میں رحیمن بوا کی غصیلی آواز ابھرتی ہے)

رحیمن بوا: اے ہے کون ہو تم...... ارے یہ کیا سانڈ کی طرح منہ اٹھائے سیدھے چلے آرہے ہو...... اُدھر ہی ٹھہر جا، کلموہے...... یہاں آنے کی تمہاری جرأت کیسے ہوئی کلموہے......

برزخ: (گھبرائی ہوئی آواز میں) ارے اماں...... میں تو دو بوند جگر سوز لینے آیا ہوں۔

رحیمن بوا: ارے منہ جلے...... کیا تمہاری ماں بہن نہیں ہے......

برزخ: ہے نا اماں......

رحیمن بوا: ارے مرگئی تیری اماں منہ جلے...... دو بوند جگر سوز اپنی بہن نے لیا، ادھر آیا مرنے...... حرا......

برزخ: اماں...... ادھر آ کر کوئی گناہ کیا کیا......

رحیمن بوا: ارے بھاگ جا کلموہے نہیں تو جو تم پیزار کی مار مرلے گا...... ارے رحیمن بوا سب جانتی ہے، عیار کہیں کے...... جا کر داروغہ سے کہہ دو رحیمن بوا کمزور نہیں ہے...... اور کہہ دے ہاں...... جب رحیمن زندہ ہے، جو بھی پہلی نظر میری بیٹیوں کی طرف اٹھے گی رحیمن وہ آنکھ پھوڑے گی......

برزخ: اماں میں کچھ سمجھا نہیں......

رحیمن بوا: آ...... آگے آ...... پہلے تیری ہی آنکھیں پھوڑ ڈالوں......

برزخ: اماں...... آپ ذرا آرام سے میری بات سن لیں...... میں میں ہوں...... یعنی برزخ...... مجھ سے شاید غلطی ہوگئی۔ اگر سچ پوچھو تو میری کوئی خطا نہیں...... مجھے یہاں آپ کے پاس سلطان چھاپری نے بھیجا ہے......

رحیمن بوا: (آوازیں اچانک خوشگوار تبدیلی) ارے پہلے کیوں نہیں بتایا......اس بھاڑ سے منہ میں زبان نہیں ہے کیا......خوامخواہ شک کر بیٹھی، اس منہ جلے داروغہ پر...... (ہنستی ہوئی) ارے میں بتاتی ہوں......میں سمجھی تم داروغہ کے عیار ہو......

برزخ: داروغہ کا عیار......

رحیمن بوا: جاسوس......جاسوس......خیر چھوڑو......مارو توپ کا گولہ سب کو......آ کر بیٹھ جاؤ......

برزخ: شکریہ اماں......

رحیمن بوا: ہاں تو بیٹا جی......بعد کا جھگڑا پہلے ہی نپٹا لیں تو بہتر ہے......دیکھو جگر سوز کے لئے رقم تھوڑی زیادہ ہی خرچ کرنا پڑے گی......رقم جیب میں ہے بھی کہ......

برزخ: رقم جو بولوگی اماں حاضر کر دوں گا......دو بوند جگر سوز تو لاؤ......

رحیمن بوا: (ہنستی ہوئی) جگر سوز کی ایک ہی بوند بیٹا جی تمہیں سیراب کرے گی......دو بوندوں کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی......ہاہاہا......

برزخ: اماں مجھے تو دو بوند ہی چاہئیے......

رحیمن بوا: مل جائیں گی......یکمشت ہی چاہئیے......

برزخ: ہاں اماں......

رحیمن بوا: تو پھر دیر کس بات کی بیٹا جی......لو ابھی حاضر کرتی ہوں......(پکارنے والی آوازیں) اری چاند بیٹا......اری شبنم......

چاند: (اندر سے آتی ہوئی آواز) کیا ہے ماں......؟

رحیمن بوا: ادھر آنا ذرا شبنم کو بھی ساتھ لا......

چاند: آئی ماں......

رضمین بوا: بیٹا جی، یہ میری چاند ہے نا بڑی نٹ کھٹ ہے، مگر ہے سچ مچ چاند......اور شبنم......کومل کومل ہی، مانو چھوؤ تو مرجھا جائے گی......

(چاند اور شبنم کی نزدیک آتی ہوئی نقرئی ہنسی)

چاند: (جیسے دو کمروں کے درمیان کی چق ہٹا کر) کیا ہے ماں......؟

شبنم: (ہنستی ہوئی) ماں یہ کون ہے......؟

رحیمن بوا: نگوڑا دل کی دوا ڈھونڈنے ادھر آ گیا ہے۔

چاند و شبنم: نقرئی ہنسی

رحیمن بوا: ارے ہنستی ہی جا رہی ہو...... جاؤ...... واپس چلی جاؤ......

چاند شبنم: (بیک زبان ہو کر) ٹھیک ہے ماں...... دونوں کی بتدریج دور ہوتی ہوئی ہنسی۔ (برزخ سے) رانیاں ہیں رانیاں، میری یہ بیٹیاں...... کہو پسند آ گئیں......؟

برزخ: مگر میرا ان سے واسطہ کیا اماں...... میں تو دو بوند لینے ادھر آ گیا...... اماں میں ایسا ویسا نہیں ہوں......

رحیمن بوا: (گاہک کے ہاتھ کے جانے تصور سے تلملائی ہوئی) تو تو پھر ادھر مرنے چلا آیا کہ مجھ غریب لاچار کا مذاق اڑانے...... کلموہے میرا اٹھٹھ کرنے چلا آیا ادھر...... ارے جس کے شوہر کو بادشاہ کے سانڈوں نے بے گار پر لیا...... پھر لاکھ ڈھونڈا اُسے کچھ پتہ نہیں چلا...... بیٹے کو آگے پیچھے دیکھ دیکھ کر جینے والی یہ بدنصیب اُس دن مانو مر ہی گئی جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے بھی نہ پایا تھا میرا گبرو بیٹا کہ بادشاہ کے سانڈ ایسے کارندوں کے ہتھے چڑھ گیا...... میں باولی پیچھے پیچھے آوازیں دیتی رہ گئی...... (پھر رو پڑتی ہے) مگر وہ شیطاں ظالم میرے گبرو بیٹے کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے...... (روئے چلی جاتی ہے)۔

برزخ: اماں مجھے سن کر افسوس ہوا...... سچ پوچھو تو میرا بھی دل بھر آیا تمہاری حالت زار سن کر...... اماں مجھے تم سے ہمدردی ہے......

رحیمن بوا: ہمدردی پیٹ کی آگ سرد نہیں کرتی...... پیٹ کی آگ جب بھڑک اٹھی اپنی نوخیز بچیوں کو اُس میں جھونک دیا...... (روئے چلی جاتی ہے)

برزخ: اماں خدا کے لئے روؤمت......لو یہ کچھ پیسے ہیں رکھ لو......خدا بھلا کرے گا......

(اندوہ ناک موسیقی کی لہروں میں رحیمن بوا کی روتی ہوئی آواز جذب ہو جاتی ہے)

سین......۵

برزخ: (اپنے آپ سے) خدایا۔ یہ کس مصیبت میں پیر و مرشد نے پھنسا دیا۔ بستی بستی گھوما......شہر شہر پھرا......مگر دو بوند جگر سوز ملنا نہیں تھا۔ نہیں ملا......خدایا......میرے حال پر رحم فرما......ایسا کون سا ستم ہے خدایا جو مجھ غریب پر نہ ڈھایا گیا......خدایا......ان گناہ گار آنکھوں نے جو دیکھا، اس سے بدتر کچھ اور نہ دیکھوں، خدایا، اُسے پہلے ہی مجھے اپنے پاس بلالے......اف......ایک ایک عضو درد کر رہا ہے......اب تو ٹانگوں نے بھی جواب دیا ہے......بہتر ہے اُدھر تھوڑا سستالوں......ہاں......واہ......کیا خوبصورت باغ ہے (ایک دفعہ کے بیٹھ جانے کی آواز)

برزخ: (بڑبڑاتے ہوئے) چل بیٹا برزخ......پیڑ کا گھنا سایہ ہے......فرش مخمل سبزے کا ہے۔ سو جاؤ بیٹا......سو جاؤ......(وقفہ......خراٹوں کی آواز)

(موسیقی میں برزخ کے خراٹوں کی آواز ڈوب جاتی ہے)

سین......٦

(پیشِ منظر میں محبت میں شرابور مردانہ آواز ابھرتی ہے)۔

شاہ زیب: (محبت پاش آواز) ملکۂ عالیہ......آپ کا حسن......آپ کی یہ موہنی صورت مجھے دیوانہ بنائے جاتی ہے......ایسا دیوانہ بنا دیتی ہے کہ خود پر اختیار نہیں رہتا......کاش آپ کے حسنِ جہاں تاب کو اپنے دل میں قید کر لینے پر قادر ہوتا تو شاید دل کی بے قراری کو قرار سا آجاتا......

ملکۂ عالیہ: (ہنستی ہے...... جیسے دور کسی مندر میں گھنٹیاں بج اٹھی ہوں) اچھا آ......

شاہ زیب: ہاں ملکۂ عالیہ...... دلِ بے اختیار کو آپ کے قدموں میں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ملکۂ عالیہ: (بدستور نقرئی سی ہنسی ہنستی ہوئی) اجازت ہے...... (مدہوش سی آواز میں) شاہ زیب...... پتہ ہے...... ہمارا یہ حسن...... ہماری یہ بے تاب جوانی...... آہ...... آپ کے پہاڑ ایسے سینے میں پناہ لے کر موم کی طرح پگھل جاتی...... پھر کچھ خبر نہیں ہوتی...... شاہ زیب آپ کے پیار نے ایسا دیوانہ بنا دیا ہے کہ سورج ابھی ڈوبنے والا ہی ہوتا ہے کہ نظروں میں آپ کا یہ کشادہ سینہ آ کر للچاتا ہے...... ایسا للچاتا ہے کہ پل پل ایک ایک صدی لگتا ہے......

شاہ زیب: ...... (فریفتہ آواز میں) آہ ملکۂ عالیہ...... آپ کا یہ غلام بھی تڑپ تڑپ کر انتظار کی گھڑیاں کاٹتا ہے...... اور آپ کا حسن جیسے پا بہ زنجیر کئے رہتا ہے۔ وصال کے ان لمحوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا ہے......

ملکۂ عالیہ: (بدستور ہنستی ہوئی) ہاہاہا...... شاہ...... اگر آپ کی تڑپ کبھی آواز بن کر عالم پناہ کے کانوں تک پہنچ جائے تو......

شاہ زیب: اپنی گردن خوشی خوشی کٹواؤں گا...... ملکۂ عالیہ...... اور آپ کے حسین قدموں میں اپنے عشق کی سوغات بنا کر پیش کروں گا...... مگر ملکۂ عالیہ مجھے عالم پناہ پر افسوس ہوتا ہے...... عالم پناہ آپ کے حسن کے قدرداں نہیں......

ملکۂ عالیہ: ہمیں تو کوئی افسوس نہیں...... بلکہ الٹا ہم خوش ہیں...... ہاہاہا...... عالم پناہ کی عمر...... ہم سے چھپتی پھرتی ہے...... ہاہاہا...... عالم پناہ...... ہاہاہا...... ساری دنیا عالم پناہ کو انصاف کا علمبردار سمجھتی ہے...... باقی ملکوں کی رانیاں، مہارانیاں ہم پر رشک کرتی ہیں کہ عالم پناہ کو ہم سے بے پناہ الفت ہے...... ہاہاہا...... ایسی الفت کہ انہیں ہماری ہی آغوش میں آسودگی حاصل ہوتی ہے...... اور ہم ہیں، ہمیں آپ کی آغوش میں راحت ملتی ہے...... آہ......

محبت آمیز موسیقی میں ملکۂ عالیہ کی مست و مدھر آواز جذب ہو جاتی ہے۔

سین......۷

(چڑیوں اور دوسرے پرندوں کے چہچہاہٹ......شور بن کر پیش منظر میں ابھرتی ہے اور سحر نمودار ہونے کا اعلان جیسے کرتی ہے)۔

برزخ: (نیند جیسے ٹوٹنے کی آواز) آ...... آ...... آہ جاگ جا برزخ...... گھوڑے گدھے سب بیچ کر سو گئے تھے......آہ......وہ دیکھ......سحر......چل رختِ سفر باندھ......دو بوند جگر سوز کہیں نہ کہیں سے دستیاب کرنا ہی ہے......ورنہ کیا منہ لے کر پیرو مرشد کے پاس جاؤں گا...... ار......ارے یہ کیسی آوازیں۔

شاہ زیب اور ملکۂ عالیہ کی مستی سے بھرپور مدہم آوازیں پسِ منظر میں ابھرتی ہیں)

برزخ: (اپنے آپ سے بدستور) یہ سرگوشیاں...... ہاں ہاں...... کیوں نہ دیکھا جائے معاملہ کیا ہے۔

(شاہ زیب اور ملکۂ عالیہ کی آوازیں اب پیشِ منظر میں ابھرتی ہیں)۔

ملکۂ عالیہ: (ہنستی ہوئی) بس بس شاہ زیب......پھر ضد نہیں کرتے......

شاہ زیب: شاہ زیب کو اپنی جان دنیا پسند ہے مگر آپ سے جدائی...... برداشت سے باہر ہے......

ملکۂ عالیہ: ہم بھی آپ سے جدا ہونا نہیں چاہتے......مگر آپ کو معلوم ہے کہ شاہی خواب گاہ میں ہماری موجودگی کا وقت ہو رہا ہے......عالم پناہ مدہوش مدہوش خواب گاہ میں قدم رنجہ فرمائیں گے......انہیں سنبھالنے کے لئے ہمیں وہاں موجود ہونا چاہیئے......

شاہ زیب: مگر ملکۂ عالیہ......

ملکۂ عالیہ: مگر یہ ملکۂ عالیہ کا حکم ہے......

شاہ زیب: (مؤدب آواز) جو حکم ملکۂ عالیہ......(قدموں کی چاپ)

(پیش منظر میں برزخ کی آواز غالب آجاتی ہے)

برزخ: (اپنے ساتھ) وائے افسوس......میری گناہ گار نظروں کو دیکھنے کے لئے کیا یہی فحاشی......

(بڑبڑاہٹ اور سرسراہٹ کی آواز پر ملکہ کے جیسے کان کھڑے ہو جاتے ہیں)۔

ملکۂ عالیہ: (گھبرائی ہوئی آواز) کون ہے...... چھپنے کی کوشش بیکار ہے......جو کوئی بھی ہو سامنے آجاؤ......فوراً......یہ ملکہ کا حکم ہے......

برزخ: (پریشان کن آواز) حاضر خدمت ہوں......

ملکۂ عالیہ: خاموش، گستاخ...... ہمارے سوالوں کا جواب دو......کون ہو تم......اس شاہی باغ میں داخل ہونے کی جسارت کیسے کی......؟

برزخ: میں ایک مسافر ہوں...... سفر نے میرے بدن کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے......باغ میں ستانے کے لئے آبیٹھا تھا کہ نیند کی دیوی نے......

ملکۂ عالیہ: (غضب ناک لہجے میں) خاموش، گستاخ......تم ملکۂ عالیہ سے ہم کلام ہو......آداب ملحوظ رکھو......

برزخ: (انتہائی گھبراتے ہوئے) ہم ملکۂ عالیہ...... غلام دست بدست معافی کا خواستگار ہے......غلام کو معلوم نہ تھا......

ملکۂ عالیہ: گستاخ......اپنی یہ غلیظ نظریں نیچی کرو......اس سے پہلے کہ ہم یہ آنکھیں پھوڑنے کا حکم دیں......

برزخ: غلام عفو درگزر کا طلب گار ہے......غلام انتہائی بے ادب ہے (اپنے آپ سے) ہاں افسوس......پیرومرشد یہ ایک اور مصیبت میں پھنسا کیوں دیا......

ملکۂ عالیہ: گستاخ......اس سے پہلے کہ ہم تمہارے بدن سے تمہارا سر قلم کرنے کا حکم دیں، اپنی یہ گستاخ بڑبڑاہٹ بند کرو......

برزخ: ہم ملکہٗ عالیہ......عفو......درگزر......غلام بے حد ادب سے معافی کا طلب گار ہے......

ملکہٗ عالیہ: معافی کی بس ایک صورت ہے...... یہ بتاؤ...... ہمارے خلاف جاسوسی کے لیے تمہیں کس نے معمور کیا ہے......؟

برزخ: (نہ سمجھنے والے انداز میں) اپنے پیرومرشد نے ملکہٗ عالیہ......

ملکہٗ عالیہ: (حیرانگی سے) پیرومرشد...... یہ کیا بک رہے ہو گستاخ...... سچ سچ بولو...... نہیں تو ہم اس تلوار سے تمہارا سر اڑا دیں گے۔

برزخ: رحم ملکہٗ عالیہ......غلام سچ سچ عرض کر دے گا......ہوسکتا ہے ملکہٗ عالیہ میری خواہش پوری کریں......

ملکہٗ عالیہ: (پُرغضب آواز میں) کیا؟ گستاخ......

برزخ: دو بوند جگر سوز......اگر غلام کو مل جائیں......

ملکہٗ عالیہ: (غیض وغضب سے) گستاخ......

برزخ: رحم ملکہٗ عالیہ...... دو بوند جگر سوز کے لئے غلام قیمت دینے کی جسارت کرے گا......

ملکہٗ عالیہ: گستاخ......لے......یہ رہے دو بوند......

جیسے تلوار سے سر قلم کرتی ہے۔ برزخ کی زخمی چیخ موسیقی میں لہراتی ہے۔

سین ۸

پیش منظر میں غمناک موسیقی کے تھمتے ہی۔

پیرومرشد: (پُرتاسف آواز میں) انا للہ و انا الیہ راجعون......سر پھر اُٹھا......سر دینا پڑا......عجب جوان تھا...... نیلی چھتری والا رحم کرے......

(موسیقی)

سین......۹

(موسیقی تھمتے ہی)

ملکۂ عالیہ: شاہی قصاب......

قصاب: حکم ملکۂ عالیہ......غلام ہمہ تن گوش ہے۔

ملکہ عالیہ: شاہی قصاب......میرے قدموں میں پڑا یہ بے جان جسم اس گستاخ جوان کا تھا جو سرکش تھا......سرکشی کی سزا اس گستاخ کو بھگتنی پڑی......

قصاب: ملکہ عالیہ اپنی رعایا، اپنے غلاموں پر پورا پورا اختیار رکھتی ہیں......

ملکہ عالیہ: قصاب......اس گستاخ کو لے جاؤ......اور تکا بوٹی کر کے جو چاہے کرو......

قصاب: غلام حکم بجالائے گا......

(موسیقی)

سین......۱۰

(موسیقی کے تھمتے ہی گوشت کاٹے جانے کی آواز)

شاہی قصاب: (خریدار سے) آج عیش کر لو......مزے اڑاؤ......سالم ران ہے......اچھا سا مصالحہ ہو......پھر دیکھنا مزہ......

بکرا: (بکرے کی آواز) اے......بد بخت قصاب......شرم بھی نہیں آتی......

قصاب: (خریدار سے) تم مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو......

خریدار: نہیں......قصاب جی البتہ میں نے بھی آواز سنی......جیسے اس گوشت سے آ رہی تھی......

بکرا: برابر......اس بد بخت قصاب نے مجھے زبان کھولنے پر مجبور کیا......میں بکرا ہوں......ذبح کیا ہوا بکرا......

قصاب: (گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا ہے) کک کیا......

خریدار: یہ یہ...... یہ کک...... کیا......

بکرا: تھر تھر کیوں کانپنے لگے بدبخت قصاب...... بے شرم...... بدبخت کیا تم نہیں جانتے...... میں انسان کی طرح ارزاں نہیں ہوں...... میری بازار میں انسان سے کہیں زیادہ قیمت ہے......

قصاب: (کپکپاہٹ سے بھرپور آواز) تم بھی......

بکرا: ارے او بدبخت قصاب...... انسانی گوشت کو میرے گوشت کی قیمت پر بیچتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آئی......

خریدار: ان...... انس انسان کا گوشت (حیرت ناک آواز میں چیخ پڑتا ہے)

بکرا: حیران کیوں ہو گئے...... تم لوگ کیا انسانی گوشت نہیں کھاتے ہو......؟ ارے بڑی رغبت سے کھاتے ہو...... سستا بھی ہے اور مزے دار بھی......

خریدار: (خریدار کی چیخیں نکلتی ہیں) اے...... لوگو...... ادھر آجاؤ...... دیکھو...... یہ قصاب...... انسانی گوشت کا کاروبار کرتا ہے......

پھر لوگوں کا شور...... موسیقی میں ڈوب جاتا ہے۔

سین......11

(پیشِ منظر میں...... بادشاہ کے دربار کا تاثر ابھرتا ہے)

چوبدار کی آواز: (بلند آواز...... خبردار کرنے والی) باادب، باملاحظہ ہوشیار...... باکمال باجمال، بلند اقبال...... انصاف کے علمبردار، سلطانوں کے سلطان...... سلطان فیروز شاہ دربار میں جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔

(تعظیم اور ادب بجالانے کی آوازیں......)

سلطان فیروز شاہ: (پُررعب آواز میں) وزیرِ اعظم......

وزیرِ اعظم: عالم پناہ......

سلطان فیروز شاہ: دربار کی کاروائی شروع کی جائے۔

وزیر اعظم: عالی جاہ......اس دربار خاص میں ایک ذبح شدہ بکرے کی طرف سے ایک دلچسپ فریاد دائر کی گئی ہے......عالم پناہ سے انصاف کا طالب ہے......

سلطان فیروز شاہ: بکرے کی فریاد دربار میں پیش کی جائے......

وزیر اعظم: عالم پناہ......بکرے کی فریاد پر شاہی قصاب کو گرفتار کر کے شاہی دربار میں طلب کیا گیا ہے عالیجاہ......بکرے کی فریاد اس لئے دلچسپ ہے کہ بکرے نے شاہی قصاب پر الزام عائد کیا ہے کہ اُس نے ذبح شدہ بکرے پر انتہائی ظلم کیا ہے کیونکہ شاہی قصاب نے انسانی گوشت کے آویزاں ہوتے ہوئے بھی بکرے کے گوشت کی قیمت کے برابر بازار میں دستیاب کیا ہے۔ عالی جاہ......بکرے کے نزدیک قصاب نے ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کے لئے وہ عالی جاہ سے انصاف کا طلب گار ہے......

سلطان فیروز شاہ: وزیر اعظم......بکرے کو دربار میں پیش کیا جائے......

وزیر اعظم: عالی جاہ......بکرا زندہ صورت میں نہیں ہے...... بلکہ اُس کی بوٹیاں اس تھال میں حاضر دربار ہیں......عالی جاہ......ان بوٹیوں کی ایک نمائندہ بوٹی اپنے لگائے ہوئے الزام کی وضاحت کی اجازت طلب کرتی ہے۔

سلطان فیروز شاہ: اجازت ہے......

بکرا: (آواز) عالی جاہ...... شاہی قصاب نے مجھ پر انتہائی ظلم ڈھایا ہے......انسانی گوشت کو میری قیمت پر مہیا کر کے اس بدبخت قصاب نے میری قیمت رعایا کی نظروں میں کم کر دی۔

سلطان فیروز شاہ: نمائندہ بکرے کے عضو......انسان اشرف المخلوقات ہے......ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انسانی گوشت تمہاری قیمت سے کہیں زیادہ بیچا جاتا...... الٹا تم الزام دیتے ہو......

بکرا: اے عادل، انصاف پرور بادشاہ...... انسان تو مختلف بیماریوں کا شکار ہے جبکہ ہماری ذات بیماریوں سے پاک ہے...... عالی جاہ...... انسان زندہ صورت میں اشرف المخلوقات ہو سکتا ہے مگر مر جانے کے بعد اُس کی کوئی قیمت نہیں ہے...... اے عادل بادشاہ...... عدل کے علمبردار...... میرے عالم پناہ...... طمع، لالچ، کینہ، بغض، خود غرضی، حسد، یہ اور ایسی کچھ اور بھی بیماریاں ہیں جس میں انسان عام طور سے مبتلا نظر آتا ہے...... عالم پناہ...... بغاوت، سرکشی، دغا انسان کی سرشت میں ہیں...... عالم پناہ اس دوسرے تھال میں جس جوان کا گوشت رکھا گیا ہے وہ ان عام بیماریوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور خاص بیماریوں میں بھی مبتلا تھا...... اسی لئے مجھ سے رہا نہ گیا...... میرے تھر تھرائے ہوئے گوشت سے بے اختیار فریاد کی درخواست نکل گئی...... عالم پناہ بہتر انصاف کرنے والے ہیں۔

سلطان فیروز شاہ: مابدولت نمائندہ عضو کا بیان سن کر بے حد متاثر ہوئے...... اس لئے وقت ضایع کئے بغیر مابدولت قصاب کی گردن زنی کا حکم دیتے ہیں...... یہی انصاف کا تقاضہ ہے......

قصاب: (التجا کرتے ہوئے)...... رحم عالم پناہ رحم...... غلام بے قصور ہے...... غلام نے وہی بجالایا جس کا غلام کو حکم دیا گیا تھا......

سلطان فیروز شاہ: شاہی قصاب...... مابدولت وضاحت طلب کرتے ہیں......

قصاب: عالم پناہ...... اس غلام نے ملکہ عالیہ کا حکم بجالایا......

سلطان فیروز شاہ: (غضب ناک آواز میں) گستاخ غلام...... تیری یہ جرأت......

ملکۂ عالیہ: (بات کاٹتی ہوئی) (محبت پاش آواز) عالم پناہ...... قصاب نے جو بیان کیا وہ سچ ہے......

سلطان فیروز شاہ: (نرم آواز) جان سلطان......

ملکۂ عالیہ: عالم پناہ...... یہ ایک سرکش جوان تھا...... اتنا سرکش کہ ہم نے غضب ناک ہو کر اپنی تلوار سے اس کا سر خاک میں ڈال دیا......

سلطان فیروز شاہ: جانِ سلطان...... انصاف کا تقاضہ ہے کہ ملکۂ عالیہ اپنے فعل کا جواز اگر ہو تو دربار میں پیش کرے۔

ملکۂ عالیہ: عالم پناہ...... یہ سرکش جوان...... ہمارے پاس...... اپنے دل کی دوا چاہتا تھا جس کے بس سلطان حق دار ہیں اور جس میں بس عالم پناہ بستے ہیں...... عالم پناہ...... یہ گستاخ ہمارے پاس دو بوند جگر سوز کے لئے آیا تھا......

سلطان فیروز شاہ: (غضب ناک آواز) ملکۂ عالیہ...... اس گستاخ کو زندہ چھوڑنا چاہیے تھا تا کہ یہ ہمارے غضب کا شکار ہو جاتا...... مابدولت کا خون جوش مار رہا ہے...... کاش کاش......

ملکۂ عالیہ: سلطان...... کنیز معافی کی طلب گار ہیں...... اس بدبخت کی میلی آنکھیں ہی ہمیں غضب ناک کرنے کے لئے کافی تھیں...... ہم نے بے اختیار ہو کر تلوار گردن پر ماری...... (آہستگی سے سلطان سے) سلطان...... عالم پناہ...... آپ دربار میں جلوہ افروز ہیں...... دربار انصاف پر مبنی فیصلے کا منتظر ہے۔

سلطان: (دبی آواز میں ملکہ سے) چونک کر اوہ...... ہاں...... (بلند آواز میں جیسے ملکہ کا اقدام سراہتے ہوئے) ملکہ عالیہ آپ کا اقدام قابلِ ستائش ہے۔

ملکۂ عالیہ: مگر عالم پناہ......

سلطان فیروز شاہ: مگر جانِ سلطان...... اس گستاخ جوان کی نعش کو آپ نے شاہی قصاب کے حوالے کیوں کیا...... اس میں ملکۂ عالیہ کی کیا دانش ہے......

ملکہ عالیہ: عالم پناہ...... تا کہ شاہی خزانے کی آمدن بڑھے......

سلطان فیروز شاہ: جانِ سلطان......وضاحت......

ملکہ عالیہ: عالم پناہ...... شاہی خزانہ سزائے موت پانے والے سلطنت کے باغیوں کے کفن دفن کا بوجھ آخر کب تک اٹھاتا رہے گا......اتنا ہی نہیں عالم پناہ...... بلکہ عالم پناہ سزا یافتہ باغیوں کا گوشت بیچنے سے نہ صرف سلطنت کو اخراجات کی بچت ہوگی بلکہ شاہی خزانے کی آمدن میں بھی اضافہ ہو جائے گا......

سلطان فیروز شاہ: مرحبا......مرحبا......آفریں...... ملکۂ عالیہ کی دانائی پر مابدولت کو فخر ہے۔(درباری بھی ''مرحبا''، ''آفریں'' کی آوازیں)۔

سلطان فیروز شاہ: (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہیں) مابدولت سرِ دربار یہ حکم جاری کرتے ہیں کہ آج کے بعد سزائے موت پانے والے سرکشوں، باغیوں اور سلطنت کے مجرموں کی نعیش شاہی قصاب کے حوالے کی جائیں...... ان سے حاصل شدہ آمدن میں سے ہی مقتولین کے وارثوں کو کچھ رقم بطور مالی معاونت دے دی جائے گی...... رہی بکرے کی فریاد...... مابدولت قصاب کی رہائی کا حکم دیتے ہیں کیونکہ شاہی قصاب انسانی گوشت کی قیمت سے لاعلم تھے......اور مابدولت، اراکین دربار کی ایک جماعت قائم کریں گے جو انسانی گوشت کی قیمت طے کر کے اپنی رپورٹ مابدولت کو پیش کرے گی......

...........☆☆☆...........

☆......زاہد مختار

خوشبو

منظر......۱

(دور سے آتا ہو آٹو رکشا ایک خوبصورت مکان کے آہنی گیٹ کے سامنے قدرے دوری پہ رُک جاتا ہے۔ آٹو رکشے سے دونو جوان اسلم اور عادل اُترتے ہیں۔ اپنا سامان اور بریف کیس نکالتے ہیں۔ اسلم آٹو والے کا کرایہ ادا کرتا ہے اور دونوں سامان نیچے رکھنے کے بعد مکان کی جانب دیکھتے ہیں)

عادل: کالج سے کچھ دور ہے یہ مکان، مگر کیا کِیا جا سکتا ہے بھائی

اسلم: اب تم مکان دور ہونے کا رونا روتے رہو، شکر کرو بھائی کہ تمہارے ڈیڈی کی وجہ سے ان چار پانچ دنوں کے لئے یہ ٹھکانہ مل گیا ورنہ روز ایکزام سنٹر آنے جانے کا جھنجھٹ بھلا کون اُٹھاتا پھرتا۔

عادل: اچھا اب چل۔ اُٹھا یہ بریف کیس۔ کیا معلوم اب اس وقت اس گھر میں کوئی ہوگا بھی یا نہیں۔

اسلم: بھول گئے کیا کہ کل رات ڈیڈی نے کیا کہا تھا کہ اگر گھر میں شفیع صاحب یا اُن کی مسز نہیں ہوگی تب بھی اُن کا نوکر ہمیشہ اس گھر میں موجود رہتا ہے

عادل: اچھا اچھا وہ......وہ تکیہ کلام والا (کسی کی نقل اُتارتے ہوئے) خدا آپ کو تندرستی عطا کرے قسم سے......

اسلم: ارے اُٹھاؤ نا بھائی اپنا یہ سامان۔ اب تُم اُس بیچارے کے تکیہ کلام میں عیب نکالنے لگے

عادل: لے بھائی اٹھاتا ہوں (عادل یہ کہتے ہوئے اپنا سامان اُٹھاتا ہے اور ساتھ میں ایک گانا بھی گنگناتا ہے)

ساری دنیا کا بوجھ ہم اُٹھاتے ہیں۔لوگ آتے ہیں لوگ جاتے ہیں لیکن......

(اس کے ساتھ ہی جب وہ مکان کے دروازے کے پاس پہنچ جاتے ہیں تو اندر سے اُس گھر کا نوکر سلام چاچا باہر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

سلام: ارے آپ۔خدا آپ کو تندرستی عطا کرے۔آپ دونوں آ گئے؟

اسلم: ہاں چاچا آ گئے ہم۔کوئی ہے گھر میں کیا......

سلام: ارے برخوردار میں ہوں نا۔ بھائی آج سوموار کو گھر میں میرے سوا کون ہوگا بھلا۔اب تو آنے والے سنیچر تک یوں سمجھو میں ہی اس گھر کا نوکر ہوں اور میں ہی مالک۔خدا تمہیں تندرستی عطا کرے۔

عادل: اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بھی چاچا اتوار کو چھٹی منا لیتے ہیں۔خدا آپ کو بھی تندرستی عطا کرے قسم سے (تقریباً چاچا کی نقل اُتارے ہوئے)

سلام: ہنہ ہنہ (ہنستے ہوئے) ارے کہاں بیٹا۔کون سی چھُٹی اور کہاں کی چھُٹی۔اتوار کو تو گھر میں آنے جانے والوں کا زیادہ ہی رش لگا رہتا ہے

عادل: اوہ (افسوس ظاہر کرتے ہوئے) تو گویا پورے ہفتے کے مالکانہ حقوق کا ستیہ ناس......

اسلم: (عادل کو قدرے ڈانٹ کر اُس کی بات کاٹتے ہوئے)

عادل اب خدارا خاموش ہو جاؤ۔ہمیں اندر بھی جانا ہے کہ یہیں اس سڑک پہ بیٹھے رہیں۔

(دونوں سامان اُٹھا کر سلام چاچا کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں اور منظر بدلتا ہے)

منظر......۲

(ایک آفس کا منظر: فون پہ مالکِ مکان شفیع صاحب بات کرتے ہوئے)

شفیع: آپ فکر نا کریں جناب.... میں کس لئے بیٹھا ہوں یہاں..وہ دونوں کل میرے پاس آئے تھے..وہ سامان لے کر پہنچ بھی گئے ہوں گے..

ارے بھائی اُن کا اپنا گھر ہے وہاں اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی... بالکل..

ارے نہیں نہیں..کیا بات کرر ہے ہیں آپ....سارا مکان اُن کے لئے وقف ہے...ہم دونوں میاں بیوی تو پورے ہفتے گھر سے باہر رہتے ہیں..کیا بات کر رہے ہیں آپ..میرا بیٹا اگر آپ کے پاس آتا تو کیا اُس کا خیال نہیں رکھتے... کوئی بات نہیں..اُس کا دوست بھی تو اپنا ہی بچہ ہے... بالکل..او۔کے...

اسلام علیکم

(محمد شفیع فون رکھتا ہے اور دوسری میز پہ بیٹھا ایک اور کلرک اُس سے مخاطب ہوتا ہے)

رشید: کیوں شفیع صاحب......کیا فرمارہے تھے مختار صاحب..کیسے کٹ رہی ہے اُن کی نئے دفتر میں۔

شفیع: خدا جانے رشید میاں۔ میں نے اُس بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی۔ یہ اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔اس کے ایکزام پرسوں سے شروع ہونے والے ہیں۔ایس۔پی کالج میں اُس کا سینٹر رکھا گیا ہے۔اب وہ روز اسلام آباد سے امتحان دینے کے لئے سفر تو نہیں کرسکتا۔ میں نے ہی مشورہ دیا کہ اُسے یہ دو چار دن ہمارے ہی گھر میں رہنے دو۔ایک اور دوست بھی ہے اُس کے ساتھ۔

رشید: اچھا اچھا، تو یہ بات ہے۔ ویسے ایک بات کہوں شفیع صاحب، جب تک مختار صاحب ہمارے اس دفتر میں آفیسر تھے اُنہوں نے دفتر کے ہر ایک ملازم کا بھر پور خیال رکھا، کیوں (معنی خیز مسکراہٹ)

شفیع: ہاں رشید بھائی۔ان کی دریادلی کا تو کوئی جواب نہیں۔ میں نے اُن کے نیچر کو مد نظر رکھ کر ہی یہ آفر کی۔اب کوئی مکان لے کر تو اپنے ساتھ نہیں جاتا......

رشید: ہاں بھائی ہاں۔ اچھا کیا آپ نے ..اور پھر یہ تو اُن کے امتحان کا معاملہ ہے...... ویسے سرینگر میں آپ کے مکان میں ان دنوں کون رہتا ہے جب آپ دونوں میاں بیوی یہاں سوپور میں ڈیوٹی پر ہوتے ہیں......

شفیع: وہی سلام چاچا اور کون۔ وہ تو ہمارے گھر کا پشتینی ملازم ہے اُس کے کیا کہنے۔ دیانتدار اور محنتی۔ اگر وہ ہمارے گھر میں نہ ہوتا تو ہم میں کسی نہ کسی کو اپنی نوکری چھوڑنی ہی پڑتی یا مکان کسی کرایہ دار کے رحم وکرم پہ چھوڑ دینا پڑتا......

رشید: خدا مالک ہے سب کا۔ اب کس کو کیا خبر کہ کس کا آب و دانہ کہاں کہاں بکھرا پڑا ہے۔ اب دیکھئے نا اسلام آباد والے سرینگر میں اور سرینگر والے ادھر سوپور میں۔ مکان سب کے اپنی اپنی جگہ لیکن کوئی ادھر تو کوئی اُدھر (اسی اثنا میں چپراسی فائل لے کر آتا ہے)......

چپراسی: صاحب جی، بڑے صاحب کہہ رہے ہیں کہ اس فائل کو مکمل کر کے اُن کے ڈاک پیڈ میں شام کو اُن کے گھر بجھوا دینا......

شفیع: اچھا (فائل لے کر کن انکھیوں سے رشید کی طرف دیکھتا ہے۔ چپراسی چلا جاتا ہے)۔

رشید: کیوں شفیع صاحب کیا لگ رہا ہے۔

شفیع: کیوں کیا، آپ نے نہیں سنا۔ صاحب کے کیا آرڈرز ہیں......

رشید: ہاں جی سُنا۔ اس فائل کی اہمیت زیادہ ہوگی! اسی لئے اسے گھر کی طرف روانہ کرنے کا حکم ملا ہے۔

شفیع: رشید میاں، میں نے فائل بنا کھولے ہی پہچان لی ہے۔ یہ اُسی کنٹریکٹر کی ہے جو اکثر صاحب کے گھر کچھ نہ کچھ لے کر جاتا ہے۔

رشید: اچھا، اچھا، وہ شمس الدین۔ مگر آج تو وہ آفس میں نظر نہیں آیا۔

شفیع: آج یہاں کہاں نظر آئے گا وہ۔ صاحب نے اُسے اس فائل کے لئے گھر میں ہی بُلایا ہوگا نا!

رشید: ہاں، وہی تو۔ چلو جائے گا کہاں۔ ہمارے پاس بھی تو آئے گا، آج نہیں تو کل۔ کم یا زیادہ، ہمارے حصے کی چائے بھی تو ہمیں پلانی ہوگی۔۔ کیوں؟

(محمد شفیع مُسکرا کر فائل کھول کے اُس میں کچھ لکھنے لگتا ہے:)

(زوم ان اینڈ کٹ)

منظر......۳

(ایک کتاب سے زوم آوٹ ہوتا ہوا منظر۔ اسلم کتاب پڑھنے میں مست۔ اچانک ایک سریلی آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ وہ نظریں اُٹھا کر حیرت سے اُس جانب دیکھتا ہے جہاں سے آواز آتی ہے۔ گیت بڑا رسیلا اور پُر درد ہے)

گیت کے بول: بے درد دادِ چانہ سور ہو سپد ان۔ سُے لے مٹھیا میانہ یار و ہو (اسی اثنا میں جب کمرے میں عادل اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے داخل ہوتا ہے تو وہ گیت اچانک بند ہو جاتا ہے)

اسلم: عا......د......ل

عادل: اسلم کیا بات۔ کیا نیند آنے لگی ہے۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا اسی لئے میں نے دوڑ کے سرد پانی سے اپنا چہرہ دھولیا۔ ورنہ نند یا رانی میری آنکھوں میں بھی داخل ہونے لگی تھی۔

اسلم: نہیں عادل نہیں۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے......تم......تم نے یہ آواز سُنی

عادل: آواز...کون سی آواز....؟

اسلم: وہی آواز جو ابھی ایک پُر درد گانا گا رہی تھی۔

عادل: پُر درد گانا......اسلم تم امتحان کی تیاری کر رہے ہو یا ریڈیو سے گانے سُن رہے ہو......

اسلم: اوہو۔ میں ریڈیو نہیں سُن رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ پار کسی کمرے میں کوئی لڑکی گا رہی ہے......

عادل: کیا...... کوئی لڑکی گا رہی ہے۔ محترم محمد اسلم صاحب۔ مائی فرینڈ...... اب بہت ہو گیا۔ اب آپ اپنی یہ کتابیں بند کر دیجئے اور سو جائیے۔ لگتا ہے نند یارانی آپ کے ذہن میں ڈیرا جمانے لگی ہے۔

اسلم: عادل پلیز، تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔ تم نے باتھ روم میں پانی کے شور کی وجہ سے وہ آواز نہیں سُنی ہوگی، میں نے خود اپنے کانوں سے وہ پُر درد گیت سُنا ہے...... بے درد دادِ چانہ سور ہو سپدان...... میری بات کا یقین کرو عادل۔

عادل: او، تو یہ بات ہے۔ پھر تو ہمیں ابھی اور اسی وقت چپکے چپکے مکان کے لان میں دیکھنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی خوبصورت لڑکی ہاتھ میں جلتی شمع، سفید کپڑوں میں ملبوس یہ پُر درد گانا گاتی ہوئی جا رہی ہوگی۔

اسلم: عادل تم میری بات کا مذاق کیوں اُڑا رہے ہو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں

عادل: ارے کون کم بخت مذاق اُڑا رہا ہے۔ یہ تو کسی فلم کی سچویشن لگ رہی ہے۔

(عادل کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے گانا گاتا ہے)

گمنام ہے کوئی...... بدنام ہے کوئی...... کس کو خبر کون ہے وہ...... انجان ہے کوئی......

اسلم: (قدرے غصے میں) عادل......

عادل: عالم پناہ، آپ کی ہر بات پہ میرا سرِ تسلیم خم لیکن جہاں پناہ میں ایکزام میں فیل ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اجازت ہو تو میں اپنی کتابوں کی ورق گردانی کروں۔ کل پہلا پیپر ہے، عالم پناہ۔

اسلم: ٹھیک ہے۔ تم میری بات کا یقین نہیں کرتے، مت کرو۔ بیٹھ جاؤ لیکن یاد رکھنا اگر اب تمہیں وہ درد بھری آواز سنائی دے تو مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ ہاں......

(اسلم اپنی کتاب میں منہمک ہو جاتا ہے۔ عادل بھی بیٹھ کر اپنی کتاب کھول کر پڑھنے میں محو ہو جاتا ہے اور دور چاندنی آہستہ آہستہ بادلوں کے درمیان سرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پسِ منظر میں اُسی گانے کی صرف دُھن بجتی ہے اور منظر بدل جاتا ہے)

منظر......۴

شفیع صاحب کے مکان کا باہری منظر: مکان کے لان میں پھولوں کی آبیاری کرتا ہوا سلام چاچا۔ اسی اثنا میں اندر سے عادل اور اسلم ہاتھ میں کچھ نوٹ بکس لئے باہر نکلتے ہیں۔ سلام اپنا ہاتھ روک لیتا ہے)

سلام: خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔ لگتا ہے آپ امتحان دینے کے لئے جا رہے ہیں......

اسلم: ہاں سلام چاچا۔ دعا کرنا کہ امتحان ٹھیک ٹھاک ہو......

سلام: خدا آپ کو کامیابی عطا کرے۔ خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔

عادل: سلام چاچا، مجھے آپ سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے......

سلام: پوچھو بیٹا، پوچھو......

عادل: سلام چاچا۔ آپ کے صاحب نے یہ مکان کسی سے خرید لیا ہے یا خود بنوایا ہے (اسلم کی حیرت بھری ری ایکشن)۔

سلام: نہیں بیٹا، خریدا ہے۔ میں تو پچھلے بیس برسوں سے اس گھر کا ملازم ہوں۔ صاحب جی پہلے ڈاون ٹاون میں رہتے تھے......

عادل: اوہ تو یہ بات ہے، تب تو اسلم سچ ہی کہہ رہا تھا کہ......

اسلم: (ڈانٹ کر) عادل......

سلام: خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔ کیا کہہ رہے تھے اسلم میاں......

اسلم: ارے سلام چاچا، کچھ نہیں، میں کل رات عادل سے یہی کہہ رہا تھا کہ شفیع صاحب پہلے یہاں نہیں رہتے تھے۔

سلام: ہاں ہاں، بالکل، وہی تو میں بھی کہہ رہا تھا......

اسلم: اچھا سلام چاچا، اب اجازت دیجیے۔ چلو عادل پھر لیٹ ہو جائیں گے۔ آٹو مین روڈ پہ ہی ملے گا......

(عادل کا بازو پکڑ کر اُسے تقریباً کھینچتے ہوئے لے جاتا ہے)

عادل: چلو بھائی چلو (قدرے دور جا کر آہستہ سے) کل تم ہی سسپنس کریٹ کر رہے تھے اور اب جبکہ میں انویسٹ گیشن کرنے نکلا تھا اب تُم مجھے ہی ڈانٹ رہے ہو......

اسلم: پاگل کہیں کے۔ اب چلنا بھی ہے یا نہیں۔ یہ وقت ان باتوں پہ نہیں بلکہ امتحان کے بارے میں سوچنے کا ہے......

(عادل کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے جاتا ہے۔ اُن کے لان سے باہر جانے کے بعد سلام اپنے آپ سے جیسے مخاطب ہو جاتا ہے)

سلام: (سر ہلاتے ہوئے) جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں کیا گھسر پھسر ہو رہی ہے۔ اس مکان میں جو بھی آتا ہے اُس کو بس اسی بات کی فکر لگ جاتی ہے... ہاں

(سلام کی جانب کیمرہ ادھیرے دھیرے زوم اِن کرتا ہے اور منظر بدل جاتا ہے)

منظر......۵

(وقت: درمیانی رات

وہی کمرہ جس میں لڑکے امتحان کی تیاریاں کرتے ہیں......

ایک بجھے ہوئے بجلی بلب سے زوم آؤٹ ہوتا ہوا منظر۔ کمرے میں ہلکی نیلی روشنی۔ دونوں دوست محوِ خواب ہیں کہ اچانک پسِ منظر میں دھیرے دھیرے وہی کشمیری گیت اُبھرنے لگتا ہے۔ اب کی بار چند لمحوں کے بعد اسلم تو کروٹ بدلتا ہے لیکن عادل کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ پہلے لیٹے لیٹے ہی حیرت بھری نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے اور جب پورے ہوش وحواس میں وہ گانا سُنتا ہے تو ہڑبڑا کے نہ صرف اُٹھ بیٹھتا ہے بلکہ پاس میں سوئے اسلم کو کو بھی جگا لیتا ہے)

عادل: اسلم...اسلم

(پسِ منظر میں اب بھی وہی گیت سنائی دیتا ہے۔ اسلم ہڑبڑا کے جاگ جاتا ہے اور بلب جلا دیتا ہے)

اسلم: کیا بات ہے عادل......(اسلم اتنا ہی کہہ پاتا ہے کیونکہ وہ گیت کے بول سُن کر خاموش ہو جاتا ہے

عادل: اس...وقت......یہ...آو...از

اسلم: یہی تو وہ آواز ہے جس کے بارے میں کل رات......سُن، سُن رہے ہونا ایک درد بھری آواز......

عادل: مگر یہ آواز......

اسلم: یہ آواز.......یہ گیت جیسے میرے دل کو چیر کے جارہا ہے......

عادل: خاموش....اسلم....خاموش.....یہ کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ کوئی حور گا رہی ہے...یہ....یہ......

(اچانک گانے کے بول بند ہو جاتے ہیں)......

اسلم: ہونہہ...بس ایسے ہی کل رات کو بھی ہوا تھا...یہ...یہ گیت ایسے ہی ادھورا سنائی دیا تھا، یوں ہی اچانک کل رات کو بھی یہ آواز ایسے ہی خاموش ہو گئی تھی۔

عادل: اسلم! یہ کون ہے جو اس طرح آدھی رات کو یوں درد بھری آواز میں گا رہی ہے.....

سلام: خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔ کیا کہہ رہے تھے اسلم میاں......

اسلم: ارے سلام چاچا، کچھ نہیں، میں کل رات عادل سے یہی کہہ رہا تھا کہ شفیع صاحب پہلے یہاں نہیں رہتے تھے۔

سلام: ہاں ہاں، بالکل، وہی تو میں بھی کہہ رہا تھا......

اسلم: اچھا سلام چاچا، اب اجازت دیجئے۔ چلو عادل پھر لیٹ ہو جائیں گے۔ آٹو مین روڈ پہ ہی ملے گا......

(عادل کا بازو پکڑ کر اُسے تقریباً کھینچتے ہوئے لے جاتا ہے)

عادل: چلو بھائی چلو (قدرے دور جا کر آہستہ سے) کل تم ہی سسپنس کریٹ کر رہے تھے اور اب جبکہ میں انویسٹ گیشن کرنے نکلا تھا اب تُم مجھے ہی ڈانٹ رہے ہو......

اسلم: پاگل کہیں کے۔ اب چلنا بھی ہے یا نہیں۔ یہ وقت ان باتوں پہ نہیں بلکہ امتحان کے بارے میں سوچنے کا ہے......

(عادل کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے جاتا ہے۔ اُن کے لان سے باہر جانے کے بعد سلام اپنے آپ سے جیسے مخاطب ہو جاتا ہے)

سلام: (سر ہلاتے ہوئے) جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں کیا گھسر پھُسر ہو رہی ہے۔ اس مکان میں جو بھی آتا ہے اُس کو بس اسی بات کی فکر لگ جاتی ہے... ہاں

(سلام کی جانب کیمرہ ادھیرے دھیرے زوم اِن کرتا ہے اور منظر بدل جاتا ہے)

منظر......۵

(وقت: درمیانی رات

وہی کمرہ جس میں لڑکے امتحان کی تیاریاں کرتے ہیں......

ایک بجھے ہوئے بجلی بلب سے زوم آؤٹ ہوتا ہوا منظر۔ کمرے میں ہلکی نیلی روشنی۔ دونوں دوست محوِ خواب ہیں کہ اچانک پسِ منظر میں دھیرے دھیرے وہی کشمیری گیت اُبھرنے لگتا ہے۔ اب کی بار چند لمحوں کے بعد اسلم تو کروٹ بدلتا ہے لیکن عادل کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ پہلے لیٹے لیٹے ہی حیرت بھری نظروں سے گردو پیش کا جائزہ لیتا ہے اور جب پورے ہوش وحواس میں وہ گانا سُنتا ہے تو ہڑبڑا کے نہ صرف اُٹھ بیٹھتا ہے بلکہ پاس میں سوئے اسلم کو بھی جگا لیتا ہے)

عادل: اسلم...اسلم

(پسِ منظر میں اب بھی وہی گیت سنائی دیتا ہے۔ اسلم ہڑبڑا کے جاگ جاتا ہے اور بلب جلا دیتا ہے)

اسلم: کیا بات ہے عادل.....(اسلم اتنا ہی کہہ پاتا ہے کیونکہ وہ گیت کے بول سُن کر خاموش ہو جاتا ہے

عادل: اس...وقت......یہ...آو...از

اسلم: یہی تو وہ آواز ہے جس کے بارے میں کل رات......سُن، سُن رہے ہو نا ایک دردبھری آواز......

عادل: مگر یہ آواز......

اسلم: یہ آواز.......یہ گیت جیسے میرے دل کو چیر کے جا رہا ہے......

عادل: خاموش....اسلم ....خاموش.....یہ کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ کوئی حور گا رہی ہے... یہ......یہ......

(اچانک گانے کے بول بند ہو جاتے ہیں)......

اسلم: ہونہہ...بس ایسے ہی کل رات کو بھی ہوا تھا...یہ...یہ گیت ایسے ہی ادھورا سنائی دیا تھا، یوں ہی اچانک کل رات کو بھی یہ آواز ایسے ہی خاموش ہو گئی تھی۔

عادل: اسلم! یہ کون ہے جو اس طرح آدھی رات کو یوں دردبھری آواز میں گا رہی ہے......

اسلم: خدا جانے... میں نے بھی تو کل تُم سے ایسا ہی سوال پوچھا تھا اور تُم وہ سفید کپڑے، وہ جلتی شمع اور وہ لالن....

عادل: ارے یار، اگر ایسا ویسا بھی ہوگا تب بھی اس حور کو ایک بار دیکھنا چاہوں گا......

اسلم: اب تمہیں اُس کے لئے ایک رات اور انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ کل رات بھی جب یہ آواز خاموش ہوگئی تو دوبارہ سنائی نہیں دی تھی......

(اسی اثنا میں کمرے کے دروازے پہ دستک ہوتی ہے۔ دونوں چونک پڑتے ہیں لیکن جب باہر سے سلام چاچا کی آواز سنائی دیتی ہے......
تو دونوں اطمینان کا سانس لیتے ہیں)......

سلام: خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔ آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں کیا......

اسلم: نہیں چاچا ہم تو کب کے سو گئے تھے۔ یہ تو ہم بس یوں ہی پانی پینے کے لئے اُٹھے تھے......

سلام: اچھا اچھا، تبھی تو۔ میں نے سوچا دیکھ آؤں کہ آپ لوگوں کے کمرے کی بتی کیوں جل رہی ہے۔ کیا کروں بیٹا... مجھے بھی نیند نہیں آرہی تھی حالانکہ آج میں گرمی کی وجہ سے برآمدے میں ہی سویا تھا... اچھا اچھا خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے

(اسکے ساتھ ہی سلام کے جاتے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

عادل: اسلم......

اسلم: ہونہہ!

عادل: اس حور کا یہ گانا کیا صرف ہم لوگ ہی سُن پاتے ہیں۔ کیا سلام چاچا اس گانے کو نہیں سُن پاتا......

اسلم: اب کوئی وظیفہ پڑھ کے سو جاؤ۔ اس گھر کو الوداع کرنے سے پہلے یہ راز بھی معلوم کر کے جائیں گے......

عادل: Oh my God, what a melodious voice

(عادل گُنگنانے لگتا ہے)

بیدردوادِ چانہ سور ہوسپدان......

منظر......۶

(وقت: صبح کا سماں)

(سلام سے زوم آوٹ ہوتا منظر جو ورنڈے پہ ایک چارپائی پہ لیٹا تھر تھر کانپ رہا ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد اندر سے اسلم کاندھے پہ تولیہ ڈالے برآمد ہوتا ہے)

اسلم: سلام چاچا آج آپ دیر تک....

(اس دوران جب اسلم چاچا کی جانب دیکھ کر اُس کی حالت بھانپ لیتا ہے تو وہ اپنی بات روک کر عجلت میں اُس کے قریب جاتا ہے اور اُس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھتا ہے)

......سلام چاچا...... مائی گاڈ...... یہ تو بخار سے تپ رہا ہے......سلام چاچا......

سلام: (تھر تھر کانپتی آواز میں) بیٹے......نا جانے...... مجھے...... پوچھنے سے پہلے ہی اسی طرح...کانپنے لگا ہوں

اسلم: او مائی گاڈ.......چاچا.. یہاں، یہاں کوئی ڈاکٹر پاس میں رہتا ہے کیا۔

سلام: ہاں ہاں بیٹا، یہ ساتھ والے مکان میں...وہاں جا کر ڈاکٹر صاحب کو...میرا کہنا.. خدا... تمہیں تندرستی..عطا کرے، قسم سے

اسلم: اچھا اچھا۔۔میں ابھی جاتا ہوں......

(اسی اثنا میں عادل بھی اندر سے برآمد ہوتا ہے)......

عادل: (چاچا کی حالت دیکھ کر) اوہ.......کیا، کیا بات ہے اسلم......

اسلم: عادل سلام چاچا بُخار میں تپ رہا ہے۔ میں اُس گھر سے ڈاکٹر صاحب کو لے کر آتا ہوں۔تم ذرا چاچا کا خیال رکھنا......

عادل: ہاں ہاں

(اسلم نکل جاتا ہے اور عادل، چاچا کے سرہانے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دلاسہ دیتے ہوئے)

عادل: چاچا، خدا آپ کو بھی تندرستی عطا کرے۔ہم ہیں نا آپ کے پاس۔کوئی غم نہیں ہے...

سلام: بیٹے میری وجہ سے آپ لوگوں کو بھی تکلیف..اُٹھانی پڑی......

عادل: ارے نہیں، سلام چاچا...آپ ہماری جو اتنی خدمت کرتے ہیں..اور پھر آپ تو ہمارے اپنے ہیں، اپنے چاچا......

سلام: خدا..آپ کو تندرستی عطا کرے بیٹا، قسم سے......

سلام کی جانب زوم ان......

منظر......۷

(ڈاکٹر کے مکان کا باہری منظر: اسلم باہری دروازے کے پاس آ کر کال بیل پر ہاتھ رکھتا ہے اور کچھ لمحوں کے بعد ایک لڑکی جس نے اپنے چہرے کو پوری طرح ڈوپٹے میں چھپا کے رکھا ہوتا ہے، صرف اُس کی دو خوبصورت آنکھیں دکھائی دیتی ہیں دروازے پہ آتی ہے۔اسلم لڑکی دیکھ کر قدرے ہڑبڑا جاتا ہے)۔

اسلم: وہ......میں......ڈاکٹر صاحب کو بُلانے آیا تھا۔

لڑکی: آپ......

اسلم: ہم ساتھ والے مکان میں..میرا مطلب ہے شفیع صاحب کے مکان میں رہتے ہیں۔وہاں اُس گھر کا ملازم سلام چاچا بیمار ہو گئے ہیں......

میں اُن کے ہی کہنے پر ڈاکٹر صاحب کو بُلانے آیا ہوں......

لڑکی: کیا، سلام چاچا بیمار ہو گئے ہیں۔ او میرے خدا...... اچھا اچھا، آپ چلئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہوں......

اسلم: جی تھینک یو......

(اسلم نکل جاتا ہے اور جوں ہی لڑکی گھر کے اندر مڑ کے واپس جانے لگتی ہے، ڈاکٹر گاؤن پہنے ہوئے باہر آتا ہے)۔

ڈاکٹر: کون تھا خوشبو......

لڑکی: ڈاکٹر صاحب آپ میرے ساتھ آیئے۔ سلام چاچا بیمار ہو گئے ہیں......

ڈاکٹر: او، کب......

لڑکی: کوئی لڑکا آیا تھا۔ وہ وہیں رہ رہا ہے شفیع صاحب کے گھر میں۔ اُس نے کہا۔

ڈاکٹر: او۔ آئی۔ سی...... جاو، اندر سے میرا بیگ اُٹھا کے لے آؤ... بیچارہ

(لڑکی اندر جاتی ہے۔ ڈاکٹر اپنی ریسٹ واچ پر ایک نظر ڈالتا ہے اور منظر بدلتا ہے)

منظر......۸

(رات کا وقت)

(بجلی کے چمچماتے بلب سے منظر شروع ہوتا ہے۔ دونوں دوست پڑھنے میں مست دکھائی دیتے ہیں۔ اسلم کچھ لمحوں کے بعد کتاب سے نظریں ہٹا کر عادل سے مخاطب ہوتا ہے)

اسلم: عادل، خدا نے یوں تو سب ٹھیک کر دیا اور کل انشاء اللہ ہمارے ایکزامز بھی ختم ہونے والے ہیں لیکن وہ راز...

عادل: جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو.. یہی نا کہ اب نہ وہ درد بھری آواز سنائی دیتی ہے اور نہ ہی وہ درد بھرا گیت

اسلم: ہاں... کیا کریں۔ میں نے تو سلام چاچا سے وہ راز معلوم کیا ہوتا کہ کیا اُس کو بھی کسی گانے کی آواز سنائی دیتی ہے لیکن کیا کروں کل سے ڈاکٹر صاحب کی وہ نوکرانی اُس کے سرہانے ہی بیٹھی رہتی ہے۔ جیسے سچ مچ اُس کی اپنی بیٹی ہو... بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملا......

عادل: ارے ہاں یار، اگر وہ لڑکی چاچا کی اتنی خدمت نہ کرتی تو ہم بھی نہ جانے کیسے امتحان کی تیاری کر پاتے۔ چلو خدا جو کرتا ہے، اچھا ہی کرتا ہے۔ یہاں کے ہمسائے بڑے نیک ہے۔ایک دوسرے کے کام آتے ہیں......

اسلم: ہاں یار، دراصل ابھی ان بھاگ دوڑ والے شہروں میں بھی کہیں نہ کہیں انسانیت موجود ہے۔اب اسی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ لو۔ سویرے شام، کل سے کئی دفعہ خود چاچا کی خبر لینے آیا ہے، ساتھ ہی یہ لڑکی بھی اس کی خدمت...

(اچانک اسلم کو اپنی بات کاٹ دینی پڑتی ہے کیونکہ پھر اُسی درد بھرے گیت کے بول اُبھرنے لگتے ہیں)

عادل: اس..وق..ت......

اسلم: عادل..وہ..ی..آواز......

اسلم: اللہ قسم۔ آج میں اس آواز کا راز جان کے ہی دم لوں گا۔ چاہے یہ کوئی روح ہو یا کوئی حور.....

(یہ کہتے ہوئے عادل جوں ہی اُٹھ کے دروازہ کھولنے لگتا ہے..آواز پھر معدوم ہو جاتی ہے)

اسلم: بس....اب پھر یہ آواز آج کی رات سنائی نہ دے گی...یہ آواز ہمیں پاگل بنا کے رکھ چھوڑے گی......

عادل: لیکن....یہ آواز..آخر آتی کہاں سے ہے اور یوں ہر بار اس درد بھرے گیت کا گلا گھونٹ کر خاموش کیوں ہو جاتی ہے۔

(عادل واپس آ کر اسلم کے پاس بیٹھ کر سر پکڑ کے رہ جاتا ہے اور دور آسمان پر چاند سرکتا دکھائی دیتا ہے)

......منظر بدلتا ہے......

منظر......9

(صبح کا وقت)

(مکان کا باہری منظر: ورنڈے پہ رکھی ہوئی چار پائی پہ بیٹھے ہوئے قدرے صحت یاب سلام چاچا سے منظر شروع ہوتا ہے، پردہ نشین لڑکی اُسے چائے کا کپ تھماتی ہے۔اسی اثنا میں اندر سے عادل اور اسلم برآمد ہوتے ہیں)۔

اسلم: اوہو سلام چاچا....تم پھر ورنڈے پہ نکل آئے ہو......ابھی تو پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوئے ہو......

سلام: خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔میں نے ہی ضد کی اور اس بیٹی سے کہا کہ میں چائے ذرا کھلی فضا میں پینا چاہتا ہوں۔اندر میرا دل جیسے گھبرا جاتا ہے......

عادل: چاچا، اب کیسی لگ رہی ہے تندرستی......

سلام: خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔تمہاری ان چُلبلی باتوں نے ہی تو مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے...کہاں جا رہے ہو، امتحان دینے......

اسلم: ہاں چاچا۔آج ہمارے امتحان بھی ختم ہونے والے ہیں۔اگر آپ اجازت دیں تو آج ہم شام کو اپنے گھر...

سلام: ارے نہیں، نہیں بیٹا...ایسا مت کہو..اب تو کل صاحب جی اور میم صاحب بھی گھر لوٹنے والے ہیں۔کل سنیچر ہے نا۔خدا آپ کو تندرستی عطا کرے، قسم سے۔ اُن سے مل کے نہیں جاؤ گے۔بُرا لگے گا اُنہیں۔اور ہاں میں نے بھی تو ابھی تک آپ لوگوں سے کھل کے بات بھی نہیں کی..یہ نگوڑی میری بیماری

عادل: مگر چاچا......

سلام: خدا تمہیں تندرستی عطا کرے، قسم سے۔چاچا کا بھی کبھی کبھی سنا کرتے ہیں۔کل چلے جانا، صاحب سے ملنے کے بعد۔آج شام میرے ساتھ بیٹھو۔آج تو آپ لوگوں کے امتحانات بھی ختم اور پھر ان دو تین دنوں میں آپ کو میری بیماری کی وجہ سے بہت کچھ...

اسلم: ارے نہیں نہیں چاچا... ہمیں تو یہاں اپنے گھر سے بھی زیادہ سکون .....

(اسلم کی بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ آنگن کے دروازے سے ڈاکٹر ہاتھ میں ایک لفافہ اور اپنا بریف کیس لئے داخل ہوتا ہے)......

ڈاکٹر: اوہو... لگتا ہے آج ہمارے چاچا جی بالکل فٹ ہیں... چلو ڈیٹ از گڈ.... ورنہ کل شفیع صاحب کی شکایت سننی پڑتی کہ اُن کی غیر حاضری میں ہم نے آپ کا خیال نہیں رکھا، کیوں چاچا......

سلام: ڈاکٹر صاحب میں کیا بولوں.. میں تو ہمیشہ سے آپ کے احسان تلے دبا رہا ہوں ۔اب کون میری اتنی خدمت کرتا جتنی اس بیٹی نے کی......

ڈاکٹر: اب ذرا اسی بیٹی کو آج یہ سمجھاؤ نا چاچا کہ یہ میری بات مان لے......

لڑکی: کیا.....کیا حکم ہے ڈاکٹر صاحب......

ڈاکٹر: حکم نہیں بیٹی .. ایک مشورہ ہے.. یہ دیکھو.. یہ لفافہ آیا ہے تمہارے نام .....میری مانو بیٹی.. اپنے آپ کو یوں چھپا کے مت رکھو... چاچا ذرا سمجھا دو نا اسے......

سلام: ہاں بیٹی.....ڈاکٹر صاحب سچ کہہ رہے ہیں... خدا کی دی ہوئی عنایت کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے......

(اسلم اور عادل سب کچھ حیرانگی کے عالم میں ڈوبے ہوئے سن رہے ہیں)

لڑکی: (عادل اور اسلم کو کن انکھیوں سے دیکھنے کے بعد).........مگر سلام چاچا... میں.. میں......

ڈاکٹر: کیا میں... تم خدا کا شکر ادا کیوں نہیں کرتی کہ اُس نے تمہیں ایک اچھے فن کی دولت سے مالا مال کیا ہے... دیکھ بیٹی میں نے تمہارے لئے ہی ان ریڈیو والوں سے بات کی ہے اور اب جبکہ وہ بار بار تمہیں بُلا رہے ہیں. تم. تم خود ہی منہ موڑ رہی ہو......

عادل: مائی گاڈ. تو کیا وہ درد بھری آواز.. وہ درد بھرا گیت..

اسلم: سلام چاچا کیا وہ......

سلام: خدا آپ کو تندرستی عطا کرے بیٹا، قسم سے ۔ وہ گیت یہ لڑکی ہی چوری چھپے گاتی ہے۔ وہ آدھا ادھورا گیت......

ڈاکٹر: (لڑکی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) دیکھو خوشبو.. میں نے تمہیں کبھی بھی اپنے گھر کی ملازمہ نہیں بلکہ بیٹی جیسی سمجھا ہے۔ اگر میری بیٹی میں تمہارا جیسا کوئی گُن ہوتا تو میں اُسے بھی یہی مشورہ دیتا کہ فن بانٹنے سے نکھرتا ہے(خوشبو یہ سننے کے بعد دوڑتی ہوئی، روتی ہوئی مکان کی دیوار کی ساتھ چپک کر منہ چھپا کے سسکیاں لے لے کر رونے لگتی ہے۔)

(اسلم اور عادل ایک طرف حیران۔ ڈاکٹر قدرے پشیمان اور سلام چاچا چارپائی سے دھیرے دھیرے اُٹھ کر خوشبو کے قریب جاتا ہے اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے)۔

سلام: بیٹی.. تم دل چھوٹا نہ کرو.. مان لو جو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں.. لوگ جب تمہاری خوبصورت آواز سنیں گے وہ سب تمہیں دعائیں دیں گے۔ تم سارے کشمیر میں چودھویں کے چاند کی مانند چمک اُٹھوگی (اب خوشبو دھیرے دھیرے سلام چاچا کی جانب مُڑتی ہے)۔

خوشبو: اور چاچا.. جب میرا یہ گرہن زدہ چہرہ اُن کے سامنے آئے گا تب......

(خوشبو یہ کہتے ہوئے اپنے چہرے پہ لپٹا ہوا ڈوپٹہ کھول دیتی ہے۔ خوشبو کا چیچک کے داغوں سے بھرا بدصورت چہرا
جس میں صرف دو آنکھیں خوبصورت ہیں... عادل اور اسلم کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں)۔

...........☆☆☆...........

☆......محمد امین بٹ

روح کی آہٹ

کردار

غلام محمد	۲۸ سال کا ایک شادی شدہ نوجوان
کنیز فاطمہ	غلام محمد کی بیگم
ماں	غلام محمد کی ماں
بچہ	غلام محمد کا مقتول بچہ
شگفتہ	غلام محمد کی بہن
پہلا نوجوان	ایک عرب نوجوان
لڑکی	عرب نوجوان کی بیگم
دوسرا نوجوان	عرب نوجوان کا ساتھی
ڈاکٹر	ڈاکٹر
بچی	عرب نوجوان کی بیٹی

سین......۱

نصف شب ڈھلے ایک گھر میں خواب گاہ کا منظر۔ اچانک ایک معصوم بچے کی آواز سرگوشی کے انداز میں ابھرتی ہے۔

بچہ: مما...... مما...... جاگو ذرا مما...... میری بات سنو...... کنیز دبی ہوئی چیخ کے ساتھ بیدار ہوتی ہے......

کنیز فاطمہ: کون...... کون ہے...... سامنے آجاؤ......!!!

غلام محمد: (جاگتے ہوئے) کیا بات ہے......!! تم کسے بلا رہی ہو...... (لائٹ آن کرنے کا صوتی تأثر) کیا بات ہے...... تم تو پسینے سے تر ہو گئی ہو......

کنیز فاطمہ: تم نے اس کی آواز سنی......؟

غلام محمد: کس کی......؟

کنیز فاطمہ: وہ مجھے مما مما کہہ کر پکار رہا تھا...... مجھے جگا کر مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا......

غلام محمد: یہ سب تمہارا واہمہ ہے...... اور کچھ نہیں...... آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو...... زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر اس طرح اپنے آپ کو ٹارچر کرنا......

کنیز فاطمہ: چھوٹی چھوٹی باتیں......؟

غلام محمد: دیکھو جو کچھ ہوا اسے ایک بدصورت یاد سمجھ کر بھول جاؤ...... تم نے اسے اپنی اوڑھنی بنالیا ہے جو ہر وقت تمہارے سر پر سوار رہتی ہے......

کنیز فاطمہ: کاش......! یادیں اوڑھنی کی طرح ہوتیں جنہیں انسان اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے سر سے اتارے...... خاص کر یہ کربناک یادیں......

غلام محمد: ہماری اکثر یادیں بڑی خوبصورت ہیں جن کے سہارے ہم بہت سارے غم بھلا سکتے ہیں...... تم کبھی ان خوبصورت یادوں کو ٹٹول کر تو دیکھو۔۔ ہر چیز بہت خوبصورت دکھے گی اور یہ نفسانی کشمکش جس کی وجہ سے تم دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہو...... اس سے چھٹکارا مل جائے گا تمہیں......

کنیز فاطمہ: اگر یہ نفسیاتی کشمکش بڑھ گئی تو کیا لگتا ہے تمہیں...... پاگل ہو جاؤں گی میں؟

غلام محمد: کیسی باتیں......

کنیز فاطمہ: کاش ایسا ہو جائے...... پاگل ہو کر انسان یادوں کے کرب سے تو آزاد ہوتا ہو گا......

غلام محمد: دیکھو میری طرف دیکھو۔۔ان ہی نظروں سے میری طرف دیکھو جنہوں نے مجھ سے کہلوایا تھا جو کہنے کے لئے مجھے یونیورسٹی میں تمہارے ساتھ تین سال گزار کر بھی کسی کے شعروں کا سہارا لینا پڑا تھا......

Flash back کا صوتی اثر......

سین ۲

یونیورسٹی کا احاطہ.....طلباً کی چہل پہل کا صوتی تأثر غلام کی آواز اُبھرتی ہے.....وہ اپنی ڈائری سے ایک نظم اس انداز سے پڑھ رہا ہے کہ جیسے یہ اس کی اپنے جذبات کا اظہار ہو اور پاس بیٹھی اپنی ہم جماعت کنیز فاطمہ کو متاثر کرنا چاہتا ہو......

ساحل کی ریت، سمندر کی لہریں
بستی، جنگل، صحرا، دریا
خشبو، موسم، پھول، دریچے
بادل، سورج، چاند، ستارے
آج ہیں یہ سب نام تمہارے
خواب کی باتیں
یاد کے قصے
سوچ کے پہلو
نیند کے لمحے
درد کے آنسو
چین کے نغمے

اڑتے وقت کے بہتے دھارے
آج ہیں یہ سب نام تمہارے
روح کی آہٹ
جسم کی جنبش
خون کی گردش
سانس کی لرزش
آنکھ کا پانی
اپنی کہانی
چاہت کے عنوان یہ سارے
آج ہیں یہ سب نام تمہارے

کنیز فاطمہ: (چھیڑ خانی کے انداز میں کھانستے ہوئے) اچھی ہے نظم...... پڑھنے کا انداز بھی اچھا ہی ہے لیکن impress کسے کرنا چاہتے ہو......

غلام محمد: یہاں اس بزرگ چنار کی شفیق چھاؤں میں ہم دونوں کے سوا اور کون ہے......

کنیز فاطمہ: تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تم یہ سب مجھے سنا رہے تھے......؟

غلام محمد: اور کون ہے اس قابل؟ اس کا حقدار؟

کنیز فاطمہ: بڑا سنجیدہ مذاق ہے......

غلام محمد: (چلّاتے ہوئے) مذاق نہیں ہے یہ...... (پھر ایک دم آواز کو دھیما کرتے ہوئے) مذاق نہیں ہے یہ......!!!
تین سال سے ہم تقریباً ہر روز ملتے ہیں۔ کلاس میں، کینٹین میں...... بس میں...... تمہارے ساتھ گزارے ہوئے ہر لمحے کی یاد کو...... آج کے اس دن کے لئے محفوظ کر کے رکھا ہے میں نے...... یہ سوچ کر پڑھائی ختم کر کے تمہارے سامنے دامن پھیلا کر کہہ دوں گا کہ......

کنیز فاطمہ: ارے کہہ بھی دو......

غلام محمد: نہیں کہہ سکتا......ایک خدشہ......ایک اندیشہ ہے......اگر تم نے دھتکار دیا تو میں مر جاؤں گا......

(مختصر وقفہ اور اداس موسیقی)

کنیز فاطمہ: ارے تمہارے آنسو......کیا کر رہے ہو......کوئی دیکھ لے گا......اچھے بچے روتے نہیں ہیں......

غلام محمد: I am sorry آج ضبط کا باندھ ٹوٹ ہی گیا......

کنیز فاطمہ: (خود کلامی) اور تمہارے اور میرے درمیان حائل ہر رُکاوٹ کو بہا کر لے گیا......

غلام محمد: کچھ کہا تم نے......

کنیز فاطمہ: کہا تو نہیں......کہنا ہے......تم ذرا سنبھل تو جاؤ......تم نے کبھی میرے اور اپنے نام پر غور کیا ہے......؟ معنوی اعتبار سے ہم دونوں یکساں ہیں......میرے نام کے ساتھ کنیز اور تمہارے نام کے ساتھ غلام جڑا ہوا ہے (چھیڑتے ہوئے) کنیز بنا کے رکھو گے......

غلام محمد: نہیں غلام بن کر رہوں گا......

کنیز فاطمہ: پاپا کو منالو......میں جارہی ہوں......

غلام محمد: ارے سنو تو......

کنیز فاطمہ: (دور سے) پاپا کو......!!!!!!

غلام محمد: (چلاّ کر) یاہو......!!!!!!!! شاید میں بہت زور سے چلایا......سبھی میری طرف دیکھ رہے ہیں......(سرگوشی لیکن بھرپور خوشی کے احساس کے ساتھ) یاہو......

کنیز کی ہنسی کے ساتھ fade out

سین......۳

غلام محمد: یاد آیا تمہیں کچھ......

کنیز فاطمہ: نہیں میں کچھ بھول گئی......یاد نہیں آ رہا کہاں رکھی......

غلام محمد: کیا......؟

کنیز فاطمہ: ایک پُرانی کتاب کباڑ میں پڑی ہوئی تھی...... بہت پُرانی...... پندرہ سو سال پُرانے قصوں پر مبنی کتاب......اس دور کا ذکر جب جہالت کی اندھیری چادر نے رات تو رات دن کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا......

غلام محمد: پڑھ لی تم نے......؟؟

کنیز فاطمہ: ہاں ایک ہی قصہ پڑھ پائی......اب اپنے آپ کو اسی قصّے کے کرداروں میں تلاش کر رہی ہوں......

غلام محمد: پسِ منظر کہاں کا تھا......؟

کنیز فاطمہ: عرب کا......!! اس دور کے جہالت کی راجدھانی کا۔۔عربی موسیقی کا تأثر ابھرتا ہے......ریگستان میں تاجروں کے ایک قافلے نے ڈیرا ڈالا ہے......دو عرب نوجوان آپس میں محوِ گفتگو ہیں......

ایک نوجوان اتنے لمبے سفر کی تکان کے بعد یہ خوشگوار موسم...... چاندنی رات......شراب، شباب اور موسیقی کا سنگم......تم کہاں کھوئے ہوئے ہو دوست......

دوسرا: اسی کی یاد میں جس سے حاصل کرنا میری زندگی کا مقصد ہے......

پہلا نوجوان: بہت پیار کرتے ہو اس سے......

دوسرا: اپنی جان سے بھی زیادہ...... یہ جو رقاصہ ابھی نغمہ گا رہی تھی اس کی نغمگی میرے محبوب کی ایک نگاہ کی محتاج ہے۔ اس نغمے کو اس تصور میں رکھ کر سن لو تو یہ نغمہ لافانی ہو جائے......

پہلا: رقاصہ کو غور سے دیکھو، حسن کا پیکر، تمہارے محبوب سے کیا کم ہے......!!!

دوسرا: بدتمیز، تم نے میرے محبوب کو اس رقاصہ کے ساتھ تشبیہ دی...... شکر کرو میری تلوار میرے ساتھ نہیں ورنہ تمہارا سر ریگستان کی ریت پر تڑپ رہا ہوتا......

پہلا: ارے میں تو مذاق کر رہا تھا...... تم تو بے حد غصیلے ہو......

دوسرا: غصیلہ نہیں...... غیرت مند عربی...... اپنے قبیلے کی روایت کو قائم رکھنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں...... کسی ہم سفر کا قتل بھی......!!!!!

پہلا: دیکھو، ہم لوگ اتنے دنوں سے ساتھ ساتھ ہیں۔ میں نے تمہیں اپنا دوست سمجھ کر اپنے مالک سے ملوایا...... تنخواہ کے ساتھ ساتھ منافع میں حصہ دار بنایا...... بیسیوں قافلوں کے ساتھ رہ کر تم نے جو کمایا تھا اس ایک سفر کی کمائی سے کم ہوگا...... پھر بھی ایک معمولی بات کو لے کر اپنی تلوار مجھ پر...... اٹھو وہاں چل کر بات کرتے ہیں (چلتے چلتے...... موسیقی اور مدھم ہو جاتی ہے)

دوسرا: میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا...... حالانکہ مجھے احساس ہے کہ میں نے ایک ہمدرد دوست کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن تم یہ بات ہمیشہ کے لئے گرہ باندھ لو کہ میں کسی کو حاصل کرنے کے لئے جی رہا ہوں...... یہ ساری دولت جو آج تک میں نے کمائی ہے اس کے قدموں میں ڈال کر دامن پھیلا کر اسے صرف یہ کہوں گا کہ میں تو تمہارا تھا ہی...... اب جو کچھ میرا ہے یا ہوگا وہ سب تمہارا ہی ہے......

پہلا: اتنی محبت کرتے ہو اس سے......؟

دوسرا: نہیں وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے اور اپنا سب کچھ مجھ پر لٹانا چاہتی ہے......

پہلا: پھر یہ دولت کمانے کی چاہت کیوں......

دوسرا: تا کہ زندگی کی تمام آسائشیں اس کے سامنے غلاموں کی طرح کھڑی رہیں اور اس سے ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑے......

پہلا: لات و منات کی قسم...... ملک ملک گھوما ہوں...... بہت دیکھے لیکن تم جیسا نہیں دیکھا ہے......تم چلو تمہارا خیمہ آ گیا ہے......آرام کرلو......سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی تمہیں گھر کی طرف نکلنا ہوگا سفر کے لئے......کھانے اور پینے کا انتظام میں خود کرلوں گا......شب بخیر......

دوسرا: شب بخیر۔

پہلا: یہ سفر مکمل ہوتے ہی تمہارے پاس پہنچوں گا......تمہاری شادی پر۔ لیکن ایک شرط ہے تمہاری بیگم کو نہیں دیکھوں گا کیوں کہ زندگی مجھے بڑی عزیز ہے......

(ریگستان میں اونٹوں کے چلنے کے صوتی تأثر کے ساتھ سین Fade Out)

سین......۴

کنیز فاطمہ اور غلام محمد کے گھر کا منظر......رات کا وقت

غلام محمد: یہ لو پانی پی لو......

کنیز فاطمہ: نہیں، پیاس نہیں ہے۔

غلام محمد: پانی پی لو......بات کرتی ہو تو لگتا ہے کہ گلا سوکھ گیا ہے۔

کنیز فاطمہ: تم وہ کتاب ڈھونڈنے میں میری مدد نہیں کر سکتے......

غلام: مل جائے گی کتاب۔۔ یہیں کہیں رکھ دی ہوگی تم نے...... صبح ہوتے ہی ڈھونڈ لیں گے...... یہ البم دیکھ لو تمہارے سامنے پڑا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر کچھ اچھی یادیں تازہ کرلو...... تمہاری طبیعت سنبھل جائے گی......

کنیز فاطمہ: اچھی یادیں......

غلام: دیکھو، یہ تصویر جب منگنی سے پہلے ہم اور تم ریسٹورنٹ میں ملے تھے...... یاد ہے تمہیں، میں نے تم سے میری اور ممی کی گفتگو کے بارے میں سب کچھ صاف صاف کہہ دیا تھا...... Cut to Flash Back

سین......۵

ماں: سات بیٹیوں کے بعد ہوا ہے تمہارا جنم۔۔ داستانی کردار 'اکہ نندن' سے کم نہیں ہو ہمارے لئے...... اور آج جب تم اپنی ہی نہیں ہم سب کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ لینے جا رہے ہو تو تمہیں ہمارے جذبات اور احساسات کا کوئی لحاظ نہیں......

غلام محمد: کیا خرابی ہے اس میں۔ پڑھی لکھی ہے، خوبصورت ہے، اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور کیا چاہیئے آپ کو......؟

ماں: مجھے اس خاندان کا وارث چاہیے...... تمہارا بیٹا......

غلام محمد: وہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے ماں......

ماں: لیکن انسانی عقل بھی کوئی چیز ہے۔ تین بہنیں ہیں کوئی بھائی نہیں...... یہی وراثت لے کر اس گھر میں آ گئی تو ہمارے خاندان کا سلسلہ رُک جائے گا......

غلام محمد: تم ایک پڑھی لکھی عورت ہو...... عورت ذات ہو کر اس طرح کی سوچ اور وہ بھی میرے ساتھ ہمدردی کے نام پر...... فرض کرلو کہ میری بہنوں کے رشتے اس وجہ سے نہ ہو جائیں کہ میں تمہارا اکلوتا بیٹا ہوں...... سات بہنوں میں ایک ہی بھائی ہے...... کیسا محسوس ہوتا ہے تمہیں......

ماں: جذباتی مت بنو بیٹا...... میں نے بھوگا ہے یہ سب...... دنیا دیکھی ہے میں نے...... تمہارے لئے ایسی لڑکی لے آؤں گی کہ سب رشک کریں گے......

غلام محمد: ماں تمہارا اور اس خاندان کا وارث تب ہی ہوگا جب میں زندہ رہوں گا۔۔ مجھے زندہ رہنے دو ماں...... یہ رشتہ قبول کرلو...... میں اس کے بنا مر جاؤں گا...... میں جا رہا ہوں ماں...... واپس تب ہی آؤں گا جب تم ہاں کرلوگی......

ماں: بیٹا...... بیٹا...... (روتی ہے) مجھے چھوڑ کر مت جاؤ...... مجھے منظور ہے...... مجھے منظور ہے......

Cut to next

کنیز فاطمہ: (روتے ہوئے)

غلام محمد: ارے تم رو رہی ہو...... مجھے لگتا ہے میری بے باکی دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ گی...... اس بات پر فخر محسوس کروگی...... میں نے تمہارے ساتھ جو وعدے کئے ہیں وہ وفا کرنے کے لئے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں...... لیکن تم تو رو رہی ہو......

کنیز فاطمہ: ایسا کیا دیکھا تم نے مجھ میں...... اور پھر ماں کا اندیشہ غلط بھی تو نہیں...... اگر وہ ہوا......

غلام محمد: دیکھو خدا پر بھروسہ رکھو اور اس ناچیز پر اعتماد...... ہم زندگی کی ہر آزمائش کا مقابلہ کریں گے کیوں کہ ہم بڑے مالدار ہیں......

کنیز فاطمہ: مالدار......؟

غلام محمد: ہاں ہاں، محبتوں والے جو ہیں...... اس سے بڑھ کر مالداری کیا ہو سکتی ہے...... خوشگوار موسیقی کے ساتھ منظر بدلتا ہے......

خواب گاہ کا منظر......گھڑی کی ٹک ٹک......

غلام محمد: یہ دیکھو، اس سے آگے کی ساری تصویریں......شادی کی ہیں......

کنیز فاطمہ: شادی کا منظر......اس قصے میں بھی تھا......

غلام محمد: کس قصے کی بات کر رہی ہو......

کنیز فاطمہ: وہی اندھیروں کے دور کا قصہ جو اس پرانی کتاب میں درج ہے۔

Cut to Flash Back

(شادیوں کے موقع پر عرب میں بجائے جانے والے پُرانے طرز کے گانے کے ساتھ منظر شروع ہوتا ہے......موسیقی مدھم ہوتی ہے......)

پہلا نوجوان: دوست تمہاری شادی میں شرکت کر کے بے انتہا خوشی محسوس کر رہا ہوں......تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم نے زندگی سے جو کچھ مانگا آج تمہیں مل گیا......

دوسرا: بالکل سچ کہہ رہے ہو تم دوست......تم نہیں جانتے کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے......بس اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ بہت ساری دولت کما کر اسے زندگی کی ساری خوشیاں دے دوں...... جانتے ہو جب وہ میرے سامنے ہوتی ہے تو مجھے بھوک ہی نہیں لگتی......

پہلا نوجوان: دولت کمانے کی اتنی ہی فکر ہے تو بہت بڑا قافلہ جا رہا ہے اگلے ہفتے...... میرے آقا تمہارے کام کرنے کے انداز سے بڑے خوش ہیں...... کہتے ہیں تاجرانہ سلیقہ اس لڑکے کی فطرت میں ہے......ان کی طبیعت ناساز ہے......کہہ رہے تھے کہ تم قافلے کے ساتھ جاؤ گے تو وہ منافع میں اچھا خاصہ حصّہ تمہیں دے دیں گے......لیکن میں نے کہہ دیا اس کی شادی ہونے والی ہے......شاید وہ نہ آ سکے......

دوسرا: نہیں......نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔ ایسا موقع بار بار تو نہیں ملے گا......میں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا...... یہ شادی میری ترقی کے لئے اچھا شگون ثابت ہوئی ہے......شادی ہوتے ہی دولت کمانے کا یہ نادر موقعہ میری شریک حیات کے ستارے کتنے اچھے ثابت ہوئے ہیں میرے لئے۔۔ وہ سنے گی تو خوشی محسوس ہوگی اسے......میں اسے بتا دیتا ہوں...... تم جا کر کہہ دو اپنے آقا سے میں تیار ہوں......

Fade Out

سین......٦

خواب گاہ کا منظر......رات کا وقت

ٹیپ بج رہا ہے......منی بیگم کی گائی ہوئی غزل

ہمیں بھی نیند آ جائے گی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

غلام محمد: (نیند سے بیدار ہوتے ہوئے) یہ ٹیپ کس نے چلایا......؟

کنیز فاطمہ: شاید میں نے غیر ارادی طور بٹن دبا دیا......

غلام محمد: تم سے بات کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی تھی شاید...... یہ دیکھو البم میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا......

کنیز فاطمہ: لیکن میری کھوئی ہوئی کتاب میرے ہاتھ نہیں لگ رہی ہے......

غلام محمد: کتاب...... کتاب...... کتاب...... آدھی رات گزر گئی تم ایک ہی رٹ لگائے بیٹھی ہو میری کھوئی ہوئی کتاب...... (لہجہ نرم کرتے ہوئے) میں نے کہہ دیا نا...... صبح ہوتے ہی کتاب ڈھونڈ لوں گا...... اطمینان رکھو...... بھول جاؤ اس کتاب کو، اس کتابی قصے کو...... جو کچھ تمہارے سامنے ہے، وہ دیکھنے کی کوشش کرو...... یہ دیکھو (پردے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے) تمہاری تصویر...... جب شادی کے بعد مجھے اچانک دو مہینے کے لئے ملک سے باہر جانا پڑا تھا...... کتنی مغموم تھی تم اس دن...... میں نے اپنے موبائل سے چپکے سے یہ تصویر لی تھی تمہاری......

کنیز فاطمہ: ہاں اس کے بعد ہی تو......

Flash Back

سین...... ۷

(غلام محمد اور کنیز فاطمہ کے گھر کا منظر)

ماں اپنی چھوٹی بیٹی شگفتہ سے محوِ گفتگو ہے۔

شگفتہ: حیرانگی کی بات ہے کہ آپ کو معلوم نہیں...... میرے دیور کی رشتہ دار ہے وہ ڈاکٹر جس سے بھابی نے صلاح لی ہے......

ماں: لیکن بہو نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔

شگفتہ: کہیں اسے وہی اندیشہ تو نہیں ہے۔

ماں: تم بیٹھ جاؤ...... میں ابھی بہو سے پوچھ لیتی ہوں۔

شگفتہ: نہیں ماں...... اگر اس نے یا بھیا نے یہ بات تم سے چھپائی ہے تو ضرور کوئی وجہ ہوگی...... بھابی سے اس طرح پوچھنا مناسب نہیں رہے گا...... بھیا ناراض ہو جائیں گے...... ان کا فون پر دن رات رابطہ رہتا ہے...... میری مانو تو کسی اور طریقے سے پتہ کر لو

ماں: مجھے لگتا ہے کہ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ بیٹی ہی ہونے والی ہے۔ اسی لئے چھپا کے رکھی ہے بات......

شگفتہ: میری مانو تو کسی بہانے بھابی کو اپنے فیملی ڈاکٹر سے چیک اپ کرالو......ان کے ہاں تو سارے انتظامات ہیں...... بھیا کے آنے سے پہلے ہی یہ سب ہو جائے تو......!!

ماں: ٹھیک ہے کل ہی تم جا کر ان سے بات کر لینا...... میں کسی بھی بہانے بہو کو لے کر وہاں پہنچ جاؤں گی......

سین......۸

ماں: بیٹی ذرا یہاں تو آؤ...... یہ لو دودھ پی لو۔

کنیز فاطمہ: اماں جی آپ تو جانتی ہیں میں دودھ نہیں پی پاتی ہوں...... متلی ہونے لگتی ہے......

ماں: اسی لئے تو یہ حال ہو گیا ہے تمہارا......کوئی تمہیں دیکھ لے تو ہمیں کوسے گا کہ بیٹا گھر سے باہر ہے اور بہو کو بھوکوں مار رہے ہیں......

کنیز فاطمہ: کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ...... میرے لئے تو آپ کی شفقت اور ان کی محبت سے بڑھ کر کوئی اور طاقت کیا ہو سکتی ہے......

ماں: اسی لئے اپنے فیملی ڈاکٹر کے ساتھ تمہارا Appointment fix کیا ہے...... آج جلدی سے تیار ہو جاؤ......

کنیز فاطمہ: نہیں اماں جی اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ماں: ایک طرف تو میری شفقت کی تعریف کرتی ہو اور دوسری طرف مجھے اپنا فرض ادا کرنے سے روک رہی ہو...... چلو جلدی جلدی تیار ہو جاؤ...... ڈرائیور انتظار کر رہا ہے......

کنیز فاطمہ: (خود کلامی) یا اللہ رحم کر......اگر ڈاکٹر نے ان سے کہہ دیا کہ میں امید سے ہوں تو......!!!!!!

سین......۹

(ڈاکٹر کا کلینک)

ڈاکٹر: آپ کا اندیشہ صحیح تھا۔ لڑکی ہی ہے...... شاید ان لوگوں کو بھی علم تھا، اسی لئے......

اماں: میں نے شادی سے پہلے ہی اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ ان کے گھر میں تو بیٹا ہونے کی روایت ہی نہیں ہے لیکن اس نے ضد پکڑ لی......

ڈاکٹر: اب کیا سوچا آپ نے......

امّاں: سوچنا کیا ہے......گرا لیجئے (Horror Bank Music)

ڈاکٹر: لیکن اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں......اس سے پوچھنا پڑے گا......قانوناً جرم ہے یہ......

امّاں: میرے خیال سے ہمیں میس کے بارے میں بات کرنی چاہیئے......

ڈاکٹر: لیکن اگر اس نے راز افشا کیا تو......؟؟

امّاں: اس کی ذمے داری مجھ پر......

ڈاکٹر: کب......؟

امّاں: آج ہی......

ڈاکٹر: آپ میرے اسسٹنٹ سے بات کیجئے...... وہ ساری تفصیل آپ کو بتا دے گا......

Cut

سین......۱۰

کنیز فاطمہ کی خوابگاہ......رات کا وقت

کنیز فاطمہ ایک چیخ کے ساتھ چلّا اٹھتی ہے......

کنیز فاطمہ: نہیں......نہیں......

غلام محمد: کیا ہوا......؟ کیوں چلا رہی ہو......

کنیز فاطمہ: یاد......ایک بھیانک یاد......

غلام محمد: وہی کتابی قصّے کی یاد......

کنیز فاطمہ: نہیں اس سے بھی بدتر......اس سے بھی بھیانک کتابی قصّے کا مجرم بہت چھوٹا مجرم تھا......

Cut to Scene

ریگستان میں طوفانی ریت کے اُڑنے کا صوتی اثر......

پہلا نوجوان: بہت بُری خبر ہے آپ کے لئے......آپ کے شوہر تین برس تک نہیں لوٹ پائیں گے......

عربی لڑکی: ایسا نہیں ہوسکتا......دنیا کی کوئی طاقت انہیں اتنی دیر تک مجھ سے دور نہیں رکھ سکتی......

پہلا جوان: لیکن وہ اپنے وعدے کے پابند ہیں......چاہ کر بھی واپس نہیں آسکتے......

لڑکی: ایسا کون سا وعدہ کیا انہوں نے جو انہیں تین برس تک مجھ سے اور اپنی بچی سے دور رکھ سکے......

پہلا جوان: کسی کا خون ہوا ہے ان کے ہاتھ سے......قبیلے والوں نے فیصلہ کرلیا کہ تین سال تک وہ مقتول کے بچوں کی پرورش اور والدین کی خدمت کریں گے اور انہوں نے فیصلہ تسلیم کرلیا ہے......

بچی: بابا، میں جانتی ہوں کہ آپ یہ گڑھا کیوں کھود رہے ہو...... میں آپ سے بہت چھوٹی ہوں نا...... آپ یہ گڑھا کھود کر اس میں کھڑے ہو جاؤ گے۔ میں گڑھے کے کنارے کھڑی رہ کر آپ کے برابر ہو جاؤں گی اور پھر آپ بڑے پیار سے مجھے گلے لگاؤ گے...... ارے...... ارے...... آپ تو مجھے گڑھے میں اتار رہے ہو...... پھر تو یہ کھیل میری سمجھ سے باہر ہے...... آپ کچھ بولو گے، میں سمجھ پاؤں گی...... ارے یہاں گڑھے کے اندر کی ریت تو بہت ٹھنڈی ہے...... اچھا تو آپ مجھے ریت کی ٹھنڈک کا احساس دلانا چاہتے تھے...... (نوجوان کے ہانپنے کا صوتی تأثر)...... بابا یہ ریت تو اب ٹانگوں تک آ گئی ہے...... آپ تو بس آنکھ بند کر کے ریت ڈالتے جا رہے ہو...... کوئی بات بھی نہیں کر رہے اور کتنی ریت دالو گے......؟

(جلدی جلدی ریت ڈالنے کا صوتی تأثر)

بابا میرے بازو ریت میں پھنس گئے ہیں...... بہت ریت بھر گئی ہے گڑھے کے اندر۔ میں اب ٹانگیں ہلا نہیں پا رہی...... میرے پاؤں سن ہو رہے ہیں بابا...... آنکھیں کھول کے دیکھو گڑھا بھر رہا ہے...... ریت میرے گلے تک آ گئی ہے بابا...... سانس لینا مشکل ہو رہا ہے بابا...... ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا...... بابا اور ریت مت ڈالو...... میری سانس رک رہی ہے بابا...... ریت میری آنکھوں میں کراہتے ہوئے) بابا...... بابا......

(اداس موسیقی ابھرتی ہے......)

غلام محمد اور کنیز فاطمہ کی خواب گاہ کا منظر......

کنیز فاطمہ: مجھے نہیں معلوم میرے ساتھ کیا ہوا تھا...... ملاحظہ کرنے کے بہانے مجھے بے ہوش کیا گیا تھا...... پھر بھی میں نے ڈاکٹر کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا......

Cut to Flash Back

ڈاکٹر: نرس Scissors please دیکھو یہ بڑا sensitive کیس ہے...... آنکھیں بند کر کے کام کرنے سے نہیں ہوگا...... پورے ہوش وحواس کے ساتھ......

سین......۱۳

خوابگاہ کا منظر......

کنیز فاطمہ: (کربناک احساس کے ساتھ) آنکھ کھلی تو میں اپنے بیڈروم میں تھی...... تمہاری ماں نے اس گھر میں ایک اور لڑکی کے جنم کے اندیشے کو دفن کر لیا تھا...... میری کوکھ ایک قبر بن چکی تھی جس میں میری بچی کے ساتھ میری ممتا...... میری انسانیت دفن ہو چکی تھی اور تمہیں لگتا ہے کہ میں زندہ ہوں......

غلام محمد: اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جاؤ......زندگی باقی پڑی ہے...... مجھے معاف کر دو...... ہم اپنی ایک الگ آزاد دنیا آباد کر لیں گے...... مجھے ایک موقعہ دو......

کنیز فاطمہ: (طنزیہ) سو جاؤ...... صبح ہونے والی ہے...... تھوڑی دیر آرام کر لو......

Fade Out

ایک بچے کی آواز

بچہ: مما......مما......

کنیز فاطمہ: کون......؟

بچہ: میں تمہارا بیٹا......

کنیز فاطمہ: میرا بیٹا......؟

بچہ: ہاں مما...... تمہارا بیٹا جسے ڈاکٹر نے اپنے کلنک کے قبرستان میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی دفن کرلیا......

کنیز فاطمہ: لیکن وہ تو کہتے تھے کہ میری کوکھ میں ایک بیٹی پل رہی ہے......

بچہ: (زہریلی ہنسی کے ساتھ) کیا تمہارا درد اس لئے قدرے کم ہُوا تھا کہ تمہاری کوکھ میں پلنے والا بچہ بیٹا نہیں بیٹی تھی اور کیا اس درد کی شدّت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ وہ مقتول بچہ میں ہوں، تمہارا بیٹا؟

کنیز فاطمہ: (ہکلاتے ہوئے) میں...... میرا مطلب ہے......

بچہ: فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو کہ کیا جواب دوں۔ اس سماج کی دکھی عورت کی بجائے صرف ایک ماں۔ ایک ماں کی طرح سوچو...... دونوں صورتوں میں تمہارا غم یکساں ہوگا......

بچہ: غلط فہمی تھی ان کی...... مشینوں پر ایمان لائے ہیں...... یہ فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں مما...... انسان کی بنائی ہوئی مشینوں میں نہیں......

کنیز فاطمہ: تم میرے سامنے نہیں آسکتے، بیٹا۔

بچہ: پھر بیٹا کہہ کر پکارا مجھے۔

کنیز فاطمہ: میرے بچے...... میرے لختِ جگر۔ ایک بار اپنی صورت تو دکھا دو۔ میرے کلیجے کو ٹھنڈک محسوس ہوگی۔ ایک بار، بس ایک بار...... تم جو بھی ہو جیسے بھی ہو میرے وجود کا حصّہ ہو۔

بچہ: کاش میں ایسا کر سکتا۔ تم ان اندھیرے دور کے جاہلوں کو کوس رہی تھی...... وہ تو بڑے رحم دل تھے کم از کم بچی کو آنکھ تو کھولنے دی......اسے دفن کرتے وقت اپنی آنکھیں تو بند رکھیں......تمہارے ڈاکٹر صاحب تو دیدے پھاڑ پھاڑ کر جانچ رہے تھے کہ کچھ بھی باقی نہ رہے......تم وہ کتاب ڈھونڈ رہی تھی نا، وہیں پڑی ہے تمہارے سرہانے تکیئے کے نیچے بھول گئی تھی تم......ڈاکٹر کو دے دینا شاید اسے احساس ہو جائے کہ اندھیروں کے دور میں رہنے والے تمہارے مقابلے میں کتنے رحم دل تھے......

مسجد سے اذان بلند ہوتی ہے......

بچہ: مما، پاپا کو جگا لو......اذان ہو رہی ہے......مسجد کے میناروں سے بلند ہونے والی اس صدا کے پیچھے ایک پیغام بھی ہے......اس پر بھی غور کر لو......

اذان ختم ہوتی ہے......

............☆☆☆............

☆......ولی محمد خوشباش

رشتہ

کردار

۱۔عادل	صبا کا بھائی (۳۰ سال)
۲۔صبا	عادل کی بہن (۲۲ سال)
۳۔گلہ	گھر کا نوکر (۲۵ سال)
۴۔سلیم	کلرک (۳۰ سال)
۵۔وسیم	سلیم کا دوست (۲۸ سال)
۶۔گلزار	ہیڈ کلرک (۵۰ سال)
۷۔جمیل	کلرک (۳۵ سال)
۸۔شاداب	کلرک (۴۰ سال)
۹۔بشیر	کلرک (۳۰ سال)
۱۰۔رزاق	دفتر کا چپراسی (۴۵ سال)
۱۱۔وہاب	ایک بزرگ شخص (۵۵ سال)

سین......۱

(گھر کا نوکر گلا اور صبا کچن میں داخل ہوتے ہیں)

صبا: (گُلہ سے) گُلہ......گُلہ

گُلہ: جی دیدی

صبا: کیا کِیا تم نے......؟ کام ختم کیا؟

گُلہ: جی......جی ہاں!

صبا: (کچن میں نلکے کو کھلا دیکھ کر) گُلہ میں تمہیں روز کہتی ہوں کہ نلکے کو یوں کُھلا نہ رکھا کرو۔ (نلکہ بند کرتے ہوئے) دیکھو پانی اس طرح ضائع کرنا کوئی نیک کام تو نہیں۔ پانی تو قدرت کی ایک انمول نعمت ہے اس کی قدر کرنی چاہیئے۔

گُلہ: دیدی میں تو ابھی برتن صاف کرر ہا تھا کہ اسے بند کرنا ہی بھول گیا۔

صبا: خیر کوئی بات نہیں......آئندہ ذرا احتیاط برتنا۔

اچھا......ناشتہ تیار ہے نا......!

گُلہ: جی دیدی......!

صبا: تو پھر میں بھائی جان کو بُلاتی ہوں۔

(صبا کے جانے کے ساتھ ہی سین اختتام کو پہنچتا ہے)

سین......۲

(کمرے میں صبا کا بھائی، عادل بیٹھا ہے اور صبا کمرے میں داخل ہوتی ہے)

صبا: بھائی جان۔ بھائی جان ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اُٹھیئے پہلے ناشتہ کریں۔

عادل: صبا تم ناشتہ کرو۔ میں ابھی ذرا Busy ہوں۔

صبا: او بھائی جان! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ نہیں آئیں گے تو میں بھی ناشتہ نہیں کروں گی۔

عادل: دیکھو صبا......ضد نا کرو۔

(سامنے پڑے کاغذوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ Papers بہت ہی اہم ہیں

(صبا عادل کے سامنے پڑے کاغذات اٹھاتی ہوئی اور انہیں لے کر دروازے کی طرف چلی جاتی ہے)

صبا: او بھائی جان۔ Papers, Papers پیپرس۔ اٹھو پہلے ناشتہ کریں گے اور اس کے بعد۔

عادل: (بات کاٹتے ہوئے) اور صبا کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے)
صبا۔ صبا، ایسا نہیں کرتے۔ یہ Papers اور فائل مجھے دے دو۔

صبا: (دروازے سے باہر Corridor سے جاتی ہوئی۔)
نہیں دوں گی......!

(عادل، صبا کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے اور اُسے پکڑ کر واپس اپنے کمرے میں لاتا ہے۔ Papers زبردستی واپس لینے پر صبا، عادل سے روٹھ کر چلی جاتی ہے اور واپس کچن میں پہنچ جاتی ہے۔

عادل: (اپنے آپ سے) او مائی گاڈ یہ صبا بھی اب چنچل بنتی جا رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھ جاتی ہے......!
(صبا کو منانے کچن میں چلا آتا ہے)

سین......۳

(واپس کچن میں)

عادل: صبا۔ صبا، ارے پگلی تو واقعی روٹھ گئی۔ کس بات کے لئے......؟

صبا: (روٹھی ہوئی) جاؤ......میں تم سے بات نہیں کروں گی۔

عادل: اچھا بابا......لو میں ہار گیا۔ مجھے معاف کرو۔ چلو تمہارا کہنا ہی مانتے ہیں......! اب ہوئی نا خوش......چلو لے آؤ ناشتہ کرتے ہیں......! ہاں۔ پہلے میری طرف دیکھو۔
(صبا ہنستی ہوئی عادل کی طرف دیکھتی ہے)

ہاں، یہ ہوئی نا بات......!

(اس کے ساتھ ہی عادل خود بھی زور زور سے ہنستا ہے۔ صبا ناشتہ لاتی ہے اور سامنے پلیٹ رکھ دیتی ہے)۔

عادل: صبا تم سے ایک بات پوچھوں۔

صبا: میرے پیارے بھائی جان ایک نہیں دس پوچھیئے۔

(اس کے ساتھ ہی نوکر صبا کے لئے بھی ناشتہ لاتا ہے۔)

عادل: لو جی۔ تمہارا ناشتہ بھی آ گیا تو پہلے ناشتہ کرتے ہیں اور پھر میں تم کو ایک اہم بات بتاؤں گا۔

صبا: نہیں...... پہلے اپنے پیارے پیارے بھائی جان کی بات سنوں گی۔

عادل: ارے صبا...... مت کر مجھ سے اتنا پیار۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کل جب تو چلی جائے گی تو میرا کیا ہوگا۔

صبا: کیا مطلب...... چلی جائے گی، مجھے کہاں جانا ہے۔

عادل: (ناشتہ کرتے ہوئے) اچھا۔ تجھے کہیں نہیں جانا تو کیا کل ڈولی میں بیٹھ کر سسرال مجھے جانا پڑے گا۔ (یہ سن کر صبا پھر روٹھ جاتی ہے اور ناشتہ وہیں چھوڑ کر باہر چلی جاتی ہے۔ عادل اس پر ہنستا ہے اور نوکر سے کہتا ہے)

گُلو۔ دیکھو یہ پگلی پھر روٹھ گئی...... ذرا دیکھو تو کہاں گئی۔

(گُلہ کمرے سے باہر کی طرف دیکھتا ہے اور واپس آ کر کہتا ہے)

گُلہ: مالک...... باہر کھڑی ہے۔

(عادل دروازہ کھولتا ہے اور باہر سے صبا کو پکڑ کر اندر لے آتا ہے)۔

عادل: ارے پگلی...... تم روٹھ کیوں گئی......! دیکھو ہر باپ کا یہی ارمان ہوتا ہے کہ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرے۔ ابا جان کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری بھی میرے ہی سر تو ہے۔

صبا: بھیا......میں آپ سے دور ہونا نہیں چاہتی۔

عادل: تو ٹھیک ہے، فی الحال کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔لیکن۔لیکن مجھے دفتر جانے کی بہت جلدی ہے۔

(گھڑی کو دیکھتے ہوئے) او......It is too late۔اچھا صبا تم ناشتہ کرو، میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔

(عادل کپڑے بدلنے کے لئے کچن سے باہر چلا جاتا ہے۔)

صبا: (گُلہ سے مخاطب) گلہ دیکھو میں آج دفتر نہیں جا رہی ہوں۔ مجھے تو آج اپنی ہونے والی بھابی سے ملنا ہے۔تم ایک کام کرو، بازار سے پہلے سبزی لے آؤ تب تک میں بھی تیار ہو جاتی ہوں اور کام بھی ہو جائے گا۔

گُلہ: (اچھا دیدی۔ٹھیک ہے)

صبا: (گلہ کو پیسے دیتی ہوئی) ہاں۔لو پیسے......لیکن دیکھو، جلدی واپس آنا۔

(اتنے میں عادل کپڑے بدل کر کمرے سے آتا ہے)

عادل: صبا۔اچھا میں چلوں......!

صبا: بھائی جان! کوئی چیز بھول تو نہیں گئے؟

عادل: نہیں......تو میں چلوں۔O.K

صبا: O.K Bye

عادل: خدا حافظ (عادل نکلتا ہے لیکن چند قدم آگے جا کر واپس آتا ہے) صبا......!

صبا: جی بھائی جان۔

عادل: دیکھو صبا، میں ایک بات کہنا تو بھول ہی گیا۔

صبا: کیا......؟

عادل: رات کو دہلی سے ایاز کا فون آیا تھا۔ (اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے) پرسوں وہ جاتے وقت یہ کچھ اہم کاغذات چھوڑ کر گیا ہے۔ منتیں کر رہا تھا کہ یہ کاغذات ہر حالت میں آج ہی پہنچا دیں اور پھر کل پرسوں تو مجھے جانا ہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ اگر Possible ہوا تو پھر کیوں نا آج ہی چار بجے والی فلائیٹ سے چلاؤں۔

صبا: ٹھیک ہے بھائی جان۔ نیک کام میں دیری کیوں۔؟

عادل: یہ ہوئی نا بات۔

صبا: لیکن بھیا، یہ تو بتایئے کہ واپس کب آئیں گے آپ؟

عادل: صبا Business کا معاملہ ہے دو ایک دن تو لگ ہی جائیں گے۔

صبا: بھائی جان، میں آپ کا انتظار کروں گی۔ جتنا ہو سکے جلدی آیئے گا۔

عادل: اچھا...... تم اپنا خیال رکھنا اور ہاں اب کھانے پر میرا انتظار مت کرنا۔ میں دہلی جا رہا ہوں۔ Understand

صبا: (ہنستے ہوئے) اچھا...... بھائی جان......!

عادل: تو پھر میں چلوں۔

صبا: O.K خدا حافظ۔

(صبا دروازے پر کھڑی عادل کو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتی رہتی ہے اور سین عادل کے اوجھل ہونے کے ساتھ ہی اختتام کو پہنچتا ہے۔)

سین......۴

(صبا کمرے میں بیٹھی کوئی میگزین پڑھ رہی ہے۔ سامنے ٹیلیفون ہے۔ کمرے میں ایک چھوٹے سے میز پر عادل کا ایک بڑا فوٹو فریم میں سجا ہوا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر کئی ایک Paintings بھی آویزاں ہیں)۔

صبا: گلا...... گلا...... (گلبہ کو بلاتی ہے)۔

گلہ: آیا دیدی۔ (گلہ کمرے میں داخل ہوتا ہے)

صبا: گلا۔ وہ کتابیں الماری میں ذرا سلیقے سے رکھو اور ادھر دیوار پر لگی تصویروں کو ذرا صاف کرو۔

گلہ: اچھا دیدی......!

(گلا کتابوں اور کاغذات کو الماری میں ترتیب سے رکھتا ہے اور صبا میگزین پڑھنے میں مصروف ہے۔ گلا اب دیوار پر لگی تصویروں کو صاف کرنے لگتا ہے اور اچانک عادل کا فوٹو اُس کے ہاتھ سے گرتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے۔ ٹوٹنے کی آواز سن کر صبا چونک اٹھتی ہے۔)

صبا: گلا...... یہ کیا توڑ دیا......؟

(گلا ذرا سہما اور خاموش اپنی حماقت کا احساس دلاتا ہے۔ اتنے میں صبا کی نظر ٹوٹی ہوئی تصویر پر پڑتی ہے)۔

صبا: یا اللہ خیر۔ گلا...... یہ تم نے کیا کر دیا۔ او......!

(یہ سن کر گلا باہر چلا جاتا ہے اور اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھتی ہے۔ صبا ٹیلیفون اٹھاتی ہے۔)

ٹیلیفون کی آواز۔ ہیلو

صبا: ہیلو۔ ہاں جی، کہاں سے بول رہے ہیں۔

آواز: Is it 97974350......

صبا: جی ہاں صحیح نمبر سے بول رہی ہوں۔

آواز: میڈم! میں پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ مسٹر عادل کا Accident ہوا ہے آپ جلدی سے ایس۔ ایم۔ جی۔ ایس ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ سے رابطہ قائم کریں، اور ہاں Patient کی حالت ذرا نازک ہے اس لئے جتنا جلد ممکن ہو آپ ہسپتال پہنچ جائیں۔

صبا: (چیختی اور چلاتی ہوئی) نہیں......!

میرے اللہ یہ کیا ہو گیا (رو پڑتی ہے اور فون اس کے ہاتھ سے گر جاتا ہے اسی کے ساتھ Scene بھی اختتام کو پہنچ جاتا ہے)۔

سین ۵

(صبا اپنے دفتر میں۔ سامنے ایک بزرگ ہاتھ میں درخواست لے کر کھڑا ہے۔)

وہاب: مجھ پر خدا کے لئے رحم کیجئے۔ میں بے بس ہوں۔ بے سہارا ہوں۔ میرے تو اپنے بھی بیگانے ہوئے ہیں۔ آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔

صبا: خدا پر بھروسہ رکھو اور ہمت سے کام لو۔ سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ وقت انسان کو بہت سے تجربات دیتا ہے لیکن عمر اِن تجربات کے لئے محدود ہوتی ہے تم یوں پست ہمت نہ بنو۔

وہاب: اچھا بیٹی...... خدا آپ کا بھلا کرے۔ (اور اس کے ساتھ ہی باہر نکلتا ہے۔)

صبا: Rings the peon

رزاق: (چپراسی) جی میڈم

صبا: ہاں، ذرا ہیڈ کلرک کو بلاؤ۔

(چپراسی چلا جاتا ہے اور ہیڈ کلرک اندر چلا آتا ہے۔)

ہیڈ کلرک گلزار: (عینک پہنے ہوئے ہاتھ میں کاغذ اور قلم لیتے ہوئے اندر آتا ہے)۔ جی میڈم......

صبا: دیکھئے ایک بزرگ کو میں نے ابھی آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں نے اُن کی Application پر لکھ دیا ہے۔ اُن کا کام آج ہی ہونا چاہئیے۔

گلزار: اچھا میڈم۔(واپس نکلنے لگتا ہے)

صبا: اور ہاں وہ جو توصیف انٹر پرائیزز کی فائل ہیں میں نے آپ کو Last Monday دی تھی، ذرا بھیج دیں۔

گلزار: وہ تو میڈم اُس نئے کلرک کے پاس ہے جس نے Recently جوائن کیا ہے۔

صبا: کیا وہ ابھی نہیں آیا ہے۔؟

گلزار: نہیں میڈم، آتا ہی ہوگا۔ وہ تو Join کرنے کے فوراً بعد ہفتہ بھر کے لئے چھٹی پر گیا تھا اور آج آنے والا ہے۔ آتے ہی فائل کے ساتھ بھیج دوں گا۔

صبا: ٹھیک ہے۔لیکن جلدی بھیج دیجئے گا۔

(یہ کہہ کر ہیڈ کلرک چلا جاتا ہے۔ صبا سامنے پڑے دفتری کاغذات دیکھنے لگ جاتی ہے۔تھوڑی دیر بعد سلیم دروازہ کھولتا ہے۔ جوں ہی سلیم صبا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اُسے اپنا بھائی عادل یاد آتا ہے۔ کیونکہ سلیم کی شکل عادل سے ملتی جلتی ہے۔ صبا تھوڑی دیر کے لئے اپنے بھائی کی یاد میں کھو جاتی ہے۔)

Inter cuts of Salim and Adil and then cut of Flash Back

Flash Back Scene II

Flash Back ختم ہوتے ہی صبا سلیم سے کہتی ہے۔

سلیم: السلام علیکم۔

صبا: وعلیکم اسلام۔

After Flash Back

اوتشریف رکھیے، تو آپ ہی ہیں مسٹر سلیم

سلیم: جی میڈم

صبا: کہاں رہتے ہیں آپ......؟

سلیم: گلستاں کالونی۔

صبا: او...... بہت اچھا...... کوئی Problem تو نہیں ہے۔

سلیم: نہیں میڈم...... بس صبح کو ذرا بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ اس لئے وقت پر گاڑی نہ ملنے کے سبب آفس پہنچنے میں ذرا دیر ہوتی ہے۔

صبا: کوئی بات نہیں۔ آپ ایک کام کیجئے۔ کل سے آپ بس اسٹاپ پر ہی انتظار کیا کریں۔ ہمارا گزر بھی وہیں سے روز ہوتا ہے۔ گاڑی کو تو وہاں سے آنا ہی ہے، آپ بھی روز اُسی میں آجایا کریں۔

سلیم: نہیں میڈم۔ رہنے دیجئے کوئی بات نہیں۔ میں تو جوں توں کر کے خود ہی آفس وقت پر پہنچا کروں گا۔

صبا: نہیں۔ نہیں کوئی بات نہیں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آپ کل سے ٹھیک ساڑھے نو بجے Stop پر انتظار کیا کریں۔ ہاں فائل لے آئے ہیں۔

سلیم: جی میڈم۔ (فائل دیتے ہوئے) یہ رہی فائل۔

صبا: دیکھئے......! میں یہ فائل اچھی طرح دیکھ لیتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آنا اور اسے اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھنا۔ بہت ہی Important فائل ہے۔

سلیم: اچھا، میڈم (یہ کہہ کر باہر نکل جاتا ہے اور صبا کو سلیم کے جانے ساتھ ہی دوبارہ اپنے بھائی کی صورت سامنے آتی ہے۔)

(اس کے ساتھ ہی سین ختم ہوتا ہے۔)

سین...... ۶

سلیم اپنے دوست وسیم کے ساتھ ہوٹل میں باتیں کرتے ہوئے)۔

وسیم: (پیالے میں چائے انڈیلتے ہوئے) یار! تم تو خوش قسمت ہو کہ اپنے ہی باس (Boss) کو دل دے بیٹھے۔

سلیم: بھئی یہ تو محض اتفاق ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں صبا!۔

وسیم: ارے یار! ایسے واقعات تو اتفاقاً ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ محبت تو بے ساختہ ٹھوکر کا نام ہے۔

سلیم: وسیم زندگی میں انسان کو بعض لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جیسے کہ وہ آسمان سے اُترے ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ صبا بھی میرے لئے ایسے ہی انسانوں میں سے ایک ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں وہ......!

وسیم: میرے بھائی ان سب باتوں کا تعلق تو دل سے ہے۔ انسان کا دل بھی کیا ہے۔ بس گوشت و پوست کا ایک متحرک ٹکڑا۔ نازک اور حساس...... جسے مارنے کے لئے کسی تیغ و تفنگ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سلیم: (آہ بھرتے ہوئے) وسیم پیار، محبت، دل، دنیا سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن زندگی نے جس مقام پر مجھے پہنچایا ہے وہاں پر مجھے اپنی منزل کو تلاش کرنا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔

وسیم: میرے بھائی! تم اتنے نا امید کیوں ہو۔ تم مطمئن رہو۔ منزل تمہارے قریب ہے۔ خدا کرے کہ تم اپنے مقصد میں بہت جلد کامیاب ہو۔

سلیم: میں ہر پل، ہر گھڑی سوچتا ہوں کہ میں کب اور کس طرح وہ بات صبا سے کہہ دوں جس کے لئے میرا دل بے چین ہے۔ لمحے صدیوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ صبا کی یاد میرے ذہن کی خلش بن گئی ہے۔

وسیم: ارے بھئی اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ جب تم ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو تو آپ کو حقیقت سے پردہ اٹھانا ہی چاہیے۔ اُسے صاف صاف لفظوں میں کہہ دو کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

سلیم: یار ایسا تو مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا...... وہ اس لئے کہ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں یوں ہی راستوں کے جال میں بھٹک گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں صبا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم مخالفِ سمتوں کے مسافر ہیں اور ہماری بقا اسی میں ہوگی کہ خدا کرے راستوں کو پگڈنڈیوں کا مقدر نہ ملے۔

وسیم: ارے بھائی! کیوں اپنا دماغ چاٹ رہے ہو۔ دیکھو یہ تو زندگی کا اصول ہے کہ جوانی جس قدر تیزی سے سرکتی ہے اُس سے زیادہ تیز رفتاری سے انسان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے وقت کی قدر کرو۔ صبا کے سامنے جلدی سے شادی کی تجویز رکھو۔ وہ تو تم کو دل سے چاہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری تجویز پر عمل کرنے میں ذرا بھی تامُل نہیں کرے گی۔

(گھڑی کی طرف دیکھ کر) اوہ۔ It is too late

اچھا تو اب چلتے ہیں۔ (اس کے ساتھ ہی دونوں ہوٹل سے باہر آتے ہیں۔)

سین......۷

(دفتر میں دو چار کلرک آپس میں باتیں کرتے ہوئے۔ چپراسی دروازے پر اُونگ رہا ہے)۔

کلرک۔ا: بھئی یہ نیا چھوکرا ابھی نہیں آیا کیا......؟

شاداب: (ایک بوڑھا آدمی) شی...... دھیرے بولو بھائی۔
تمہیں نہیں پتہ...... وہ اب تمہاری طرح کلرک نہیں...... میڈم کا پی۔اے ہے۔ پی۔اے...... ہاں...... سمجھے......!

بشیر: ہاں بھائی۔ اس نے تو آتے ہی کمال کر دیا...... ہائے۔ اپنی جوانی تو Dispatch کرتے کرتے ہی بیت گئی۔ شاید اپنی قسمت میں اس Dispatchery کے سوا کچھ لکھا ہی نہیں ہے۔

شاداب: میرے بھائی...... یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔ کیوں اپنے دماغ کو چاٹ رہے ہو۔

بشیر: سوتو ٹھیک ہے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر اس چھوکرے میں ایسے کون سے گُن ہیں کہ اس کو میڈم نے آتے ہی کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

کلرک۔۲: بھئی ہم ٹھہرے بوڑھے...... اس بڑھاپے میں ہم کون سا تیر ماریں گے۔ آخر لڑکا جوان ہے، Smart ہے...... خوبصورت بھی ہے......!

کلرک۔۳: واہ...... یہ بتائی ناپتے کی بات۔

گلزار: بھئی زمانہ جوانوں کا ہے اور پھر جوانی تو دیوانی ہوتی ہے...... کہیں...... کہیں......!

(دوسرے سبھی کلرک ہنس پڑتے ہیں اور کیمرہ آہستہ آہستہ Zoom Out ہوتا ہے اور سین اختتام کو پہنچتا ہے۔)

سین......۸

(صبا اپنے دفتر میں...... سامنے کلرک سلیم کُرسی پر بیٹھا ہے اور صبا سے مخاطب ہے)

سلیم: آخر آپ یوں گم صم رہ کر کب تک جئیں گی۔ جب بھی دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ آخر آپ نے زندگی کس چیز کو نام دیا ہے۔ ہر پل...... ہر گھڑی...... نہ جانے آپ کن خوابوں اور خیالوں میں ڈوبی رہتی ہیں...... اب تو آپ مسکرانا بھی بھول گئیں ہیں۔ جینا مرنا تو زندگی کا اصول ہے۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں۔ آپ کے یوں گم صم رہنے سے کوئی واپس تو نہیں آسکتا......!

صبا: (آہ بھرتے ہوئے) کاش...... ایسا ہی ہوتا......!

سلیم: آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان رہتی ہیں۔ ایک زمانہ بیت گیا۔ لیکن آپ کو آج بھی بھائی کے غم نے دیوانہ بنا دیا ہے۔ جیسے کہ وہ ابھی ابھی اس دنیا سے چلے گئے ہوں۔

صبا: سلیم، یہ دیوانگی نہیں۔ حقیقت ہے۔ عادل آج بھی سایئے کی طرح ہر لمحہ میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ کاش...... تم نے کبھی میرے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہوتا تو تم کو پتہ چلتا کہ دل کے ریگستانوں سے لمحہ لمحہ میرے ارمانوں کی ریت اڑتی رہتی ہے اور یہی ریت میری آنکھوں میں نہ جانے کب سے کنکر بن کر چبھتی رہتی ہے۔

سلیم: آپ کا یہ فلسفہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ ٹھیک ہے اب جو آپ کے جی میں آئے...... کیجئے...... میں کون ہوتا ہوں آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے والا۔ میری بساط ہی کیا ہے......؟ آپ کا ایک Subordinate ہی تو ہوں۔ آپ کے ایک اشارے پر گرد و غبار کی طرح اِدھر سے اُدھر ہو سکتا ہوں۔

صبا: سلیم۔ خدا کے لئے چپ ہو جا۔ میرے جذبات کو یوں رُسوا نہ کرو...... تم میرے ماتحت میرے نوکر نہیں۔ میرے سب کچھ ہو۔ میں تمہارے ہی سہارے تو جی رہی ہوں۔ تم ہی تو میری خزاں رسیدہ زندگی میں بہار بن کر آئے ہو۔

سلیم: اگر یہ محض تمہارے جذبات ہیں تو میں ان کی قدر کرتا ہوں اور اگر یہ حقیقت ہے تو میں اس حقیقت کے پیچھے چھپے ہر راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

صبا: کون سا راز...... کون سی حقیقت...... یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

سلیم: یہ فلسفہ نہیں یہ میرے دل کی آواز ہے لیکن شدتِ کرب سے میں آج تک آپ کو کچھ کہہ نہ سکا...... حالانکہ یہ بات میں آپ سے بہت پہلے کہنا چاہتا تھا......!

صبا: کون سی بات......؟

سلیم: یہی کہ میں آپ سے پیار کرتا ہوں......! آپ کو چاہتا ہوں چاہنے والوں کی طرح اور اس چاہت کو شادی میں بدلنا چاہتا ہوں۔

صبا: واہ! کیا ہے مرد کی فطرت۔ میں سوچتی تھی کہ مجھے میرا کھویا ہوا بھائی مل گیا لیکن تم نے میرے ارمانوں کے شیش محل پر پتھر مار کر محبت کے تقدس کو پامال کر دیا۔ تم ابھی اور اسی وقت میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔ Oh My God میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔

(اس کے ساتھ ہی سلیم کمرے سے باہر چلا جاتا ہے اور کیمرہ صبا پر Still ہو جاتا ہے۔)

..........☆☆☆..........

......●......

☆......اشرف عادل

ریڈیائی ڈرامہ

نفرت کی لکیر

کردار:

	نام		عمر
۱	امن علی	ایک ملک (وجاہت گڑھ) کا فوجی	۳۵برس
۲	شانتی داس	دوسرے ملک (وجے گڑھ) کا فوجی	۳۵برس
۳	وجاہت خان	شانتی کا کولیگ	۳۰برس
۴	سُنیل ورما	شانتی کا کولیگ	۳۰برس
۵	تصور	امن علی کا کولیگ	۳۰برس
۶	کرنل	وجاہت گڑھ کا فوجی کرنل	۵۰برس
۷	کمانڈنٹ	وجاہت گڑھ کا فوجی کمانڈنٹ	۵۰برس

سین......۱

امن: شانتی داس؟

شانتی: ہاں، امن علی؟

امن: دیکھو وہ اُس پہاڑی کی طرف......سورج پہاڑی کی گود میں سونے جارہا ہے۔

شانتی: امن علی......ہاہاہا......یوں کہو کہ سورج ڈوب رہا ہے...میں جانتا ہوں تمہارے ضمیر کو۔ڈوبنے میں نا اُمیدی ہے۔

امن: شانتی داس......ٹھیک سمجھ رہے ہو......کیوں نہ سمجھو گے کوی جو ٹھہرے......ایک شاعر کی بات تم نہ سمجھو گے تو کون سمجھے گا......لیکن شانتی سورج صبح پھر سے طلوع ہوگا۔

ہاں بالکل......شاعر یا کوی ہونے کے ساتھ ساتھ ہم لوگ فوجی بھی ہیں۔تم راحت گڑھ کے فوجی اور میں وجے گڑھ کا فوجی۔

امن: اور یہ دونوں ملک برسوں سے ایک دوسرے کے حریف ہیں۔

شانتی: ہم دونوں اپنے اپنے ملک کی سرحد کی حفاظت کے لئے اس وقت معمور ہیں۔

امن: ہم دونوں کے بیچ دشمنی ہونی چاہیے تھی۔

شانتی: لیکن ہم دونوں گہرے دوست ہیں۔Literature نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے۔

امن: روز ہم دونوں یہاں ملتے ہیں۔پہلے ہم دونوں آپس میں کسی خوف یا ڈر کے بغیر ملتے تھے۔کبھی تمہاری زمین پر کبھی ہماری زمین پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

شانتی: لیکن جب سے سیاست نے کروٹ لی اور حالات خراب ہونے لگے دو ملکوں کے بیچ میں بدامنی کی ہوا چلنے لگی......

امن: سب سے ہم چوری چھپے یہاں اس ویران جگہ پر ملتے ہیں کبھی تم سرحد کی فصیل روند کر ہماری طرف آتے ہو کبھی میں تمہاری طرف اس نفرت کی لکیر کو روند کر آتا ہوں۔

شانتی: ارے بھائی، کیوں نہ بڑھیں ہم ایک دوسرے کی طرف......تم میرے جذبات سمجھتے ہو اور میں تمہارے دل کی زبان سمجھتا ہوں۔

امن: کبھی تم میرے نغموں کا ترجمہ کرتے ہو کبھی میں تمہارے گیتوں کا ترجمہ کرتا ہوں اور پھر تمہارے نغمے میرے ملک میں گونجتے ہیں اور میرے گیت تمہارے ملک میں۔

شانتی: کاش ہماری سیاست بھی قلم کی زبان سمجھتی۔

امن: سیاست فقط بندوق کی زبان سمجھتی ہے۔

شانتی: ہم دونوں پیار سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں انسان ہیں اور انسان کی طرح رہنا چاہتے ہیں لیکن......لیکن......

امن: لیکن یہ سیاسی داؤ پیچ ہماری محبت کی زبان نہیں سمجھتے......ہم دونوں لڑنا نہیں چاہتے لیکن سیاست لڑوا رہی ہے۔

(دُور کہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔ گن گرج)

شانتی: اب ہمیں جانا چاہیئے......دور کہیں سیاست بول رہی ہے۔

امن: OK......خدا حافظ

شانتی: Take Care

موسیقی (Change Over)

سین......۲

(فلمی نغمہ لے میں گاتے ہوئے)

وجاہت: تاروں کی زباں پر ہے محبت کی کہانی

سُنیل: (ایک ساتھ) اے چاند مبارک ہو تجھے رات سہانی......(فلم نوشیرانِ عادل)

(اسی میں دروازہ کھلنے کی آواز)

وجاہت: آیئے آیئے حضور......آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا

سُنیل: شانتی صاحب! اتنی دیر کر دی۔

شانتی: میں معذرت خواہ ہوں وجاہت......دراصل......

وجاہت: شانتی جی! آپ کو پتہ ہے کتنا تناؤ ہے آج کل......دونوں ملکوں کے درمیان......

سُنیل: اور اس تناؤ کے بادل کہیں اور نہیں برستے۔ سرحدوں پر برستے ہیں جناب۔ سُنی ابھی آوازیں...... بادل نہیں گرجتے تھے...... بندوقیں گرج رہیں تھی......

شانتی: سُنیل...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو......

وجاہت: پہلے تشریف تو رکھیئے جناب۔

شانتی: او...... ہاں...... میں بیٹھ جاتا ہوں...... دیکھو! تم دونوں کے بیچ میں بیٹھ گیا ہوں......ہاہاہا......

سُنیل: اس طرح ہنسنے سے تمہارا جرم چھپ نہیں سکتا؟

شانتی: جرم......کون سا جرم کیا ہے میں نے؟ دوستی نبھانے کا جُرم؟

وجاہت: ہاں......ہاں......دشمن کو دوست سمجھنا جُرم ہی تو ہے۔

شانتی: امن میرا دوست ہے۔ ہم ایک دوسرے کو دوست سمجھتے ہی نہیں بلکہ ہم دونوں دوست ہیں۔

سُنیل: دشمن کبھی دوست نہیں بن سکتا۔

شانتی: لیکن ایک انسان دوسرے انسان کا دوست بن سکتا ہے نا؟

وجاہت: لیکن دونوں ملکوں کے قوانین تمہاری سوچ سے مختلف ہیں۔

شانتی: خیر جو بھی ہے۔ ہم نے دشمنی کی زمین میں دوستی کے بیج بوئے ہیں۔ دیکھتے ہیں دوستی کی فصل ضرور لہلہائے گی۔

سُنیل: شانتی! قدم اچھا ہے لیکن ایسے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہے خیر......تم اپنی مرضی کے خود مالک ہو۔

وجاہت: ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں تمہارے بوڑھے والدین ہیں۔ ایک کنواری بہن ہے...... اگر اللہ نہ کرے کچھ ہو گیا تو......

شانتی: کچھ نہیں ہوگا...... اللہ پہ بھروسہ رکھو...... میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا ہوں۔

سُنیل: راحت گڑھ کے فوجیوں سے ہمارے ملک کی فوج کے ساتھ بھی دوستیاں تھیں۔ سب لوگوں نے دوستیاں ترک کر دی جب سے حالات خراب ہو گئے۔

شانتی: سیاست نے کروٹ بدلی۔ کیا ہم بھی ایک دوسرے سے منہ موڑ لیں۔

وجاہت: وہی ٹھیک ہے ہمارے لئے

سُنیل: ہاں...... بالکل......

وجاہت: اور پھر دشمن پر کیا بھروسہ؟

شانتی: مجھے اپنے دشمن دوست پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ایک شاعر ہے اور میں کوی...... ہم دنیا کو شانتی اور امن کا پیغام دیتے آئے ہیں ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

وجاہت: شانتی...... دیکھ میرے بھائی...... دوستی کے بغیر بھی تمہارے کاندھوں پر ایک فرض کا بوجھ ہے۔ ہم لوگ فوجی ہیں اور سینے پر گولی کھاتے ہیں، کس لئے...... میرے بھائی...... کس لئے...... فقط اس لئے کہ یہ گولی عوام کے سینے پر نہ لگے اور جو گولی عوام کے سینے پر لگتی ہے وہ گولی دیش کے جگر پر لگتی ہے۔

شانتی: ہاہاہا...... وجاہت میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں...... لیکن جب فرض مجھے آواز دے گا، اُس وقت میں سارے رشتے بھول جاؤں گا اتنا کمزور نہیں ہے تمہارا شانتی...... اور میرے دوست کے ارادے بھی اتنے ہی پختہ ہیں جتنے کہ میرے۔

سُنیل: ہم آج جذبات کے سمندر میں کچھ زیادہ ہی ڈوب گئے...... ایک نغمہ ہو جائے......

شانتی: ہاں تم دونوں گاؤ اور میں سنوں گا......

سنیل
(ایک ساتھ) میری پیاری بہنیا بنے گی دلہنیا...... (دونوں طرز میں گاتے ہیں)
وجاہت

شانتی: یہ گانا بند کردو Please...... (گانا بند ہو جاتا ہے) میں اپنی بہن سے بہت پیار کرتا ہوں...... اُس کی شادی کی فکر مجھے پریشان کرتی ہے...... بہت پریشان......

(موسیقی) Change Over

سین......۳

تصور: امن...... یہ فوج کی نوکری بھی کتنی سخت ہے۔ دیکھو ہم لوگ چھ مہینوں سے اسی جگہ تعینات ہیں...... کبھی اس سرحد کی اُس چوکی پر، کبھی اس چوکی پر......

امن: ہاں...... تصور...... دیش کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اسی سے ہمیں روزی روٹی ملتی ہے...... اس وقت ہم گشت لگا رہے ہیں اس نفرت کی لکیر کے ساتھ ساتھ...... دُور دُور تک کوئی کہیں نظر نہیں آرہا ہے، کتنی خاموشی ہے۔ وہ اونچا پربت اور یہ پہاڑی ندی جو کسی سرحد کو نہیں مانتی...... دشمن کا پہاڑ اسے اپنی گود میں کھلا کر ہمارے علاقے میں بھیجتا ہے...... کتنا وسیع ہے اس کا کلیجہ......

تصور: امن علی...... پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہو تم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ارے......میں تو بھول ہی گیا تھا......

امن: کیا بھول گئے تھے تم تصور......

تصور: یہی کہ تم ایک شاعر ہو......اُس دن جب ہماری رجمنٹ کے جواں اپنی رجمنٹ کی سالگرہ منا رہے تھے تم نے اپنے اشعار سنائے تھے۔ بہت مزہ آ گیا تھا اُس دن......

امن: ہاں......ہاں......بالکل...... تمہیں تو یاد ہے سب کچھ۔

تصور: اور یہ بھی ہے پرسوں تم نے کوئی غزل لکھی تھی اور مجھے سُنائی...... مجھے بہت مزہ آیا......لیکن......

امن: لیکن کیا؟

تصور: لیکن یار، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا......ہاہاہا

دونوں ہنستے ہیں......

تصور: یار کل کتنے بجے تم بارک میں لوٹے......

امن: دو گھنٹے بعد......اُس وقت تم گہری نیند کی بانہوں میں تھے......

تصور: لیکن یار غلط کرتے ہو......

امن: کیوں......کیا ہوا؟

تصور: دشمن سپاہی سے ملتے ہو......

امن: تصور جس طرح تم میرے دوست ہو اُسی طرح وہ بھی میرا دوست ہے۔

تصور: وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب حالات بدل گئے......امن تم جانتے ہو کہ رنجیت سے میری بھی دوستی تھی...... بھائی جیسا تھا میرا...... لیکن اب ہم دونوں نہیں ملتے......کیونکہ......

امن: تصور......شانتی کے بغیر میں نامکمل ہوں......

تصور: لیکن آخر...... وہ دشمن ہی تو ہے...... امن تم ایک ایماندار اور صحیح انسان ہو...... کیوں اس آگ میں ہاتھ ڈالتے ہو...... تمہارے والدین ہیں...... بیوی ہے ایک چھوٹی سی بچی ہے...... اُن کا تو خیال کرو...... کل کو اگر پکڑے گئے...... تو کیا ہوگا؟ اگر دشمن نے پکڑ لیا تو انہیں ایک دشمن ملے گا اور اگر اپنوں نے پکر لیا تو انہیں ایک غدار ملے گا۔

امن: شانتی میرا بھائی جیسا ہے...... میں اُس سے فقط اس لئے نہیں ملتا کہ مجھے اُس کی یاد آتی ہے بلکہ اس لئے بھی ملتا ہوں کہ میرے والدین، بیوی یہاں تک کہ میری چھوٹی سی بچی بھی پوچھتی ہے کہ شانتی انکل کیسے ہیں۔ کیا اُن سے جھوٹ بولوں......

تصور: وہ لوگ شانتی کو کیسے جانتے ہیں......

امن: میں انہیں اپنی دوستی کے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں...... یہاں تک کہ اُس کے اور اُس کی فیملی کے فوٹو گراف بھی وہ دیکھ چکے ہیں...... اور شانتی کے گھر والے بھی میرے گھر والوں کو اور مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں...... جب بھی میرے گھر سے کوئی خط آتا ہے تو شانتی اور اُس کی فیملی سے متعلق بہت سارے سوالات ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے خطوط شانتی کو بھی آتے ہیں جس میں ہمارے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوتا ہے۔

تصور: کاش سرحدوں پر فوجیوں کو Cell Phone استعمال کرنے کی اجازت ہوتی......

امن: تو مزہ ہی کچھ اور ہوتا...... چلو اب واپس پلٹتے ہیں......

Change Over (تھوڑی سی موسیقی)

سین......۴

امن: شانتی......

شانتی: ہاں امن؟

امن: آج میں بہت خوش ہوں...... کیونکہ پھر سے ہم دونوں روبرو ہیں......

شانتی: میں بھی خوش ہوں......اور میں کچھ زیادہ ہی ہوں تم سے

امن: کیوں شانتی، کیا بات ہے؟ اور ہاں یہ تمہارے ہاتھ میں Packet سا کیا ہے؟

شانتی: یہ Packet نہیں......خوشیوں کا خزانہ ہے۔

امن: خوشیوں کا خزانہ؟

شانتی: اور نہیں تو کیا......میری بہن نے میرے لئے راکھی بھیجی ہے۔ پہلے یہ راکھی میں اس پیکٹ میں سے نکالتا ہوں......''آ''......''آ''......

(پیکٹ میں سے راکھی نکالنے کی آواز......کاغذی پیکٹ)

یہ نکل گئی راکھی......آ......

امن: واہ......کتنی خوبصورت راکھی ہے......

شانتی: اب میں اِسے اپنی داہنی کلائی پر باندھ لوں گا......

امن: او......او...... بائیں ہاتھ سے تم اسے دائیں کلائی پر نہیں باندھ سکتے۔ چلو...... میں مدد کرتا ہوں...... دو...... ادھر یہ راکھی......آ! یہ ہوئی نا بات بڑھاؤ کلائی......ہاں......اب میں یہ راکھی تمہاری کلائی پر باندھ رہا ہوں......آ......

امن: ......آ......یہ بندھ گئی تمہاری کلائی پر راکھی......

شانتی: اب میں اس Packet میں سے ایک اور راکھی نکال رہا ہوں......آ......(پیکٹ میں سے راکھی نکالنے کی آواز)......آ......نکل گئی

امن: ایک اور راکھی......اس کا کیا کرو گے

شانتی: تم اپنی کلائی بڑھاؤ

امن: میں...... میں کلائی بڑھاؤں...... یہ لو جی...... بڑھائی...... ارے ارے یہ تم کیا کر رہے ہو......

شانتی: تمہاری کلائی پر ایک بہن کی محبت باندھ رہا ہوں......

امن: مگر...... مگر...... کس کے کہنے پر......

شانتی: میری اور تمہاری بہن کے کہنے پر...... لو...... میں اُس کا خط پڑھ رہا ہوں (خط کھلنے کی آواز)

سنو...... شانتی بھیا...... آج میں ایک نہیں بلکہ دو راکھیاں بھیج رہی ہوں...... کیونکہ میں نے امن کو بھی اپنا بھائی مان لیا ہے...... اور تم دونوں کی طبعی زندگی کی دُعائیں مانگ رہی ہوں...... تم دونوں کو میری بھی عمر لگ جائے...... بھیا...... میں کیسے سمجھوں کہ میرا ایک ہی بھائی ہے...... دل کہہ رہا ہے کہ میرے دو بھائی ہیں...... اس لئے ایک نہیں بلکہ دو راکھیاں بھیج رہی...... میرے بھیا شانتی! میرے امن بھیا کی کلائی پر میرا پیار باندھ لینا......

تم دونوں کی اکلوتی بہن (ورشا)

شانتی: ارے...... ارے...... یہ کیا امن...... تمہاری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

امن: نہ نہ نہ...... نہیں نہیں...... نہیں تو......

شانتی: ہاں میرے بھائی تمہاری آنکھیں بھیگ گئی ہیں......

امن: ہاں۔ ہاں۔ میں۔ میں۔ رو رہا ہوں...... میں رو رہا ہوں...... ارے بھائی کون کہتا ہے کہ میری کوئی بہن نہیں...... کون کہتا ہے مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے کہ میں خود کو کیوں بہن کے بغیر تصور کر رہا تھا۔ شانتی...... شانتی...... میری بہن تو ہے...... ہے میری بہن...... ورشا...... ورشا...... میری بہن ہے۔ (جذبات اور آنسوؤں کا عجیب سنگم)

شانتی: ارے بھائی...... ورشا تمہاری بہن ہے...... ہاں...... بالکل...... اس میں اتنا جذباتی ہونے کی کیا بات ہے......

امن: شانتی......تم نہیں سمجھ سکتے......تم نے ورشا کا پیار بچپن سے محسوس کیا ہے...... میں اب کرر ہا ہوں......

شانتی: امن......اب ہمیں اپنی اپنی بارکوں کی طرف لوٹنا چاہیئے......وقت نکل رہا ہے دیکھو! چودھویں کا چاند آسمان کے بیچ میں پہنچ چکا ہے......اور ہم دونوں یہاں اس سنسان سرحد پر اپنے سکھ دکھ بانٹ رہے ہیں۔ ہمیں یہ احساس نہیں ہے کہ یہ سرحد کوئی معمولی لکیر نہیں ہے بلکہ ایک ایسی ناگن ہے جو کبھی بھی ہم دونوں کو ڈس سکتی ہے لیکن ہم کہ اسے دودھ پلا رہے ہیں......چلو پھر اجازت لیتے ہیں ایک دوسرے سے......

امن: او......کے......سلامت رہو......الوداع

شانتی: تم بھی سلامت رہو......الوداع

Change Over موسیقی

سین......۵

وجاہت: پل پل دل کے پاس تم رہتی ہو۔

(ایک ساتھ) جیون میٹھی...................... (فلم بلیک میل کا مکھڑا ایک
سُنیل ساتھ گاتے ہوئے)

سُنیل: ارے شانتی! تم یوں اداس اور منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو؟

وجاہت: بات کیا ہے دوست؟

شانتی: کچھ نہیں؟

وجاہت: کچھ نہیں......کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے...... بھائی ہم لوگ گھر سے دور اس ہیبت ناک سرحد پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سُنیل: اور اس وقت اپنی بارک میں آرام کر رہے ہیں۔ دن بھر ڈیوٹی دی ہے اور تم یوں اس طرح اداس بیٹھے ہو کیا تمہارا گھر نہیں کہ

شانتی: وجاہت بھائی...... گھر سے دور تو ہیں لیکن گھر کی الجھنیں سینے میں سکونِ دل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں۔

وجاہت: بات ہے کیا؟

شانتی: گھر سے خط آیا ہے۔

وجاہت: یہ تو خوشی کی بات ہے۔

شانتی: خوشی تو تب ہوتی اگر اس میں خوشی کا پیام ہوتا

وجاہت: آخر لکھا کیا ہے اس میں؟

شانتی: میری بہن کی شادی ہو رہی ہے اگلے مہینے......

سُنیل: یہ تو خوشی کی بات ہے......

شانتی: سُنیل...... بہن کی شادی اگلے سال طے تھی۔ تب تک شادی کا خرچہ اور جہیز کی رقم جمع کر لیتا...... لیکن......

سُنیل: ہے بھگوان...... یہ تو سچ مچ الجھن ہے، مسئلہ ہے۔

وجاہت: بالکل...... ہم لوگ تو دیش کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنے گھروں کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں۔

سُنیل: ہاں وجاہت...... دیش کی سرحدوں کو تو ہم دشمنوں کے حملوں سے تو بچاتے ہی لیکن ہمارے گھروں کی دہلیز کو سماج کی بُری رسومات کے حملوں سے کون بچائے گا۔

شانتی: مجھے تین لاکھ روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔

وجاہت: کیا کرنا ہوگا تمہیں ان روپیوں سے؟

شانتی: بہن کے لئے گہنے بنوانے ہیں...... اور گہنے لے کر بہت جلد گھر پہنچنا ہے۔

سُنیل: تو پھر سب سے پہلے چھٹی کے لئے Apply کرو۔

شانتی: بھائی چھٹی لے کر کیا کروں گا؟

وجاہت: گھر جاؤ گے بھائی اور کیا کرو گے۔

شانتی: روپیوں کے بغیر کیا کرنے جاؤں گا؟

وجاہت: لیکن تمہیں تو جانا ہی پڑے گا۔

شانتی: میں نے کہا نا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تین لاکھ کے گہنے جہیز میں نہیں دیں گے تو میری بہن کی ڈولی نہیں اٹھے گی۔

سُنیل: او......تو...... یہ بات ہے۔

شانتی: سُنیل......کیا تم میری مدد کر سکتے ہو......بس مجھے تم تھوڑے دن کے لئے قرض دے دو، یہ تین......

سُنیل: شانتی......میرے بھائی! میں تین لاکھ کہاں سے لاؤں۔ کہاں سے......

شانتی: وجاہت......کیا تم میری مدد کر سکتے ہو......

وجاہت: نہیں میرے بھائی......اتنی حیثیت نہیں ہے میری

شانتی: میں بھی کتنا خود غرض ہوں تم لوگ بھی میری جیسی تنخواہ لیتے ہو۔
کام تو ہم بہت بڑا کرتے ہیں لیکن تنخواہ......ہاہاہا۔ (طنز سے بھرا قہقہہ)

موسیقی (Change Over)

سین......٦

امن: ارے شانتی بھائی! تم یوں اُداس کیوں بیٹھے ہو؟ مجھ سے ملنے اس سرحد کی لکیر کو روند کر آئے ہو......اور یوں مُنہ لٹکائے ہوئے بیٹھے ہو۔

شانتی: امن بھائی! میں بہت اُداس ہوں...... یوں سمجھو کہ اُداسی کے ناگ نے مجھے ڈس لیا ہے۔

امن: شانتی، میں تمہاری رگ رگ سے اُداسی کا زہر اپنی پلکوں سے چوس لوں گا چاہے میں خود کیوں نہ زہریلا ہو جاؤں۔

شانتی: یہ زہر تم چوس نہیں سکتے ؟

امن: کیوں؟ کیوں نہیں چوس سکتا؟

شانتی: کیوں کہ تم دیوتا نہیں ہو۔ نہ تم دولت مند ہو......تم بھی میری طرح کام بہت بڑا کرتے ہو اور تنخواہ قلیل پاتے ہو۔

امن: یار! یوں پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ صاف صاف بتاؤ بات کیا ہے۔ کبھی کبھی چھوٹے آدمی بھی دیوتاؤں کا کام کرتے ہیں۔

شانتی: میری بہن کی شادی اگلے مہینے ہو رہی ہے۔

امن: تیری بہن کی شادی، ارے یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہماری بہن کی شادی ہو رہی ہے۔ بھئی یہ تو خوشی کی بات ہے۔

شانتی: مگر شادی تو اگلے سال ہونے والی تھی۔

امن: ہاں میں جانتا ہوں لیکن اس میں کون سی پریشانی ہے؟

شانتی: میرے پاس جہیز کی رقم نہیں ہے ابھی......اگلے سال تک جمع کر لیتا مگر......

امن: کتنا دینا ہوگا؟

شانتی: تین لاکھ کے گہنے۔

امن: ہاہاہا......فقط تین لاکھ کے گہنے۔ ارے بھائی، یہ تو میرے لئے معمولی سی رقم ہے۔ بھائی......میں نے اپنی بیٹی کے لئے چار لاکھ کے گہنے بنوائے ہیں۔ میری بیٹی ابھی دس سال کی ہے ابھی اُس کی شادی میں پورے دس سال باقی ہیں۔

شانتی: بہت اچھا کیا ہے تم نے۔

امن: ویسے یہ گہنے میرے والد صاحب نے بنوائے ہیں میری بیٹی کے لئے۔ اپنی Retirement پر......کیوں کہ اُنہیں معلوم ہے کہ ہمارا سماج وقت پر ایک بیٹی کے باپ کو سانپ بن کر ڈستا ہے۔ تم وجے گڑھ کے باشندے اور میں راحت گڑھ کا باشندہ لیکن ہمارے مسائل اور مشکلیں مختلف نہیں ہیں۔

شانتی: بالکل...... ہماری تہذیب، مشکلیں، خوشیاں، غم ایک ہیں۔ لیکن سیاست ہمیں الگ کر دیتی ہے۔

امن: لیکن اس بار ہم دونوں سیاست کو شکست دیں گے۔ شانتی میرا گھر اس سرحد سے فقط ۲۰ کلومیٹر دور ہے۔ میں کل گھر جاؤں گا اور اپنی بیٹی کے تمام گہنے تمہاری گود میں ڈال دوں گا۔

شانتی: نہیں...... امن...... نہیں...... میں یہ گہنے نہیں لے سکتا۔

امن: ہاہاہا...... تم نہیں لے سکتے...... میں کب کہہ رہا ہوں کہ میں یہ گہنے تمہیں دے رہا ہوں۔ بھئی...... دو مہینے کے لئے تمہیں دے رہا ہوں اپنی بیٹی کے گہنے۔ پھر تم لوٹا دینا۔

شانتی: امن...... سچ مچ...... کبھی کبھی انسان بھی دیوتا بن جاتے ہیں۔ آج ایک انسان نما دیوتا میرے سامنے موجود ہے۔

امن: شانتی...... میں کوئی دیوتا نہیں ہوں فقط ایک انسان ہوں...... انسان...... جو دوسرے انسان کا درد سمجھتا ہے۔ ویسے بھی ورشا میری بھی بہن ہے۔ اپنی بہن کی خاطر کیا میں دو مہینے کے لئے تمہیں اپنی بیٹی کے گہنے نہیں دے سکتا۔

شانتی: امن...... میں تمہیں تمہارے گہنے دو مہینے کے بعد ضرور لوٹا دوں گا لیکن اس احسان کا بوجھ کبھی اُتار نہیں پاؤں گا۔

امن: جسے تم احسان سمجھ رہے ہو میں اسے فرض سمجھ رہا ہوں۔

شانتی: (Overlap) احسان کو فرض سمجھنے کے لئے مجھے بھی دیوتا بننا پڑے گا۔ خیر...... یہ میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن میں شادی ہونے کے بعد ہی اپنی زمین فصل سمیت بیچ دوں گا تا کہ تمہارے تین لاکھ روپے فوراً ادا کر سکوں۔

امن: کیا سوچ رہے ہو، بھائی۔

شانتی: ک......ک...... کچھ نہیں...... امن اب ہمیں جانا چاہیئے اندھیرے اور بھی گہرے ہورہے ہیں۔

امن: ہاں شانتی...... میں اپنی Barrack کی طرف جارہا ہوں، تم بھی لوٹ جاؤ۔ کل شام یہیں پر ملاقات ہوگی۔ میں گہنے لے کر آؤں گا۔ تم بھی ضرور آنا۔

موسیقی

سین......۷

تصور: ارے امن! تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟ بات کیا ہے بھائی

امن: کچھ نہیں یار!

تصور: پھر رات کے اس سناٹے میں اس بارک کے چھت کو کیوں تک رہے ہو، بستر پر لیٹے تو ہو لیکن آنکھیں کھلی کھلی...... میں تو گہری نیند سو رہا تھا اچانک آنکھ کھلی تو تمہیں اس حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ بھائی! سرحد کی ڈیوٹی ہے یوں رات بھر جاگنا ٹھیک نہیں......صبح ہوتے ہی پہلے کسرت اور اس کے بعد ڈیوٹی۔

امن: نیند نہیں آرہی ہے؟

تصور: مجھے معلوم ہے، تمہیں نیند کیوں نہیں آرہی ہے......شانتی اب تم سے کبھی نہیں ملے گا......اُس نے تمہیں ٹھگ لیا ہے......تم بھی کتنے بھولے بھالے ہو......تین لاکھ کے زیور ایک دشمن کو ادھار دیئے۔ ہاہاہا

امن: تصور......نہیں......وہ مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا۔

تصور: امن......اُس نے تمہیں دھوکہ دے دیا اور تم نے دھوکہ کھالیا۔

امن: نہیں یار......شانتی مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا۔

تصور: پھر وہ تم سے ملنے کیوں نہیں آیا؟

امن: کسی مجبوری کے باعث مل نہیں پارہا ہے۔

تصور: مجبوری......کون سی مجبوری......دو مہینے پہلے جوائین تم نے اُسے گہنے دیئے ایک مہینے تک وہ چھٹی پہ رہا ہوگا۔ پھر ڈیوٹی واپس جوئین کی ہوگی......لیکن تم سے ملنے نہیں آیا۔ جبکہ تم ہر روز وقت مقررہ پر اُس جگہ کا طواف کرتے رہے جس جگہ تم دونوں ملتے رہے ہو پورا ایک مہینہ۔

امن: یہ سچ ہے مگر

تصور: مگر...... ہاہاہا......امن اُس نے تمہارے بھروسے کو سرحد کے چوراہے پر صلیب پر لٹکایا ہے۔

امن: تصور...... مجھے شانتی پر پھر بھی بھروسہ ہے۔ وہ میرے بھروسے کی پتنگ کا دھاگہ کبھی کاٹ نہیں سکتا۔

تصور: ہاہاہا......تمہارے بھروسے کی پتنگ فضا میں آوارہ بھٹک رہی ہے۔ کبھی بھی کسی خاردار جھاڑی سے لپٹ جائے گی اور تمہارے اعتماد کو لہولہان کردے گی۔

امن: نہیں تمہارا خیال غلط ہے۔

تصور: ارے بھائی...... کس مٹی سے بنے ہو......تم خوابوں کے آسماں میں اُڑ رہے ہو...... بھائی...... حقیقت کی زمین پر اُتر آؤ۔ ابھی بھی موقع ہے سنبھل جاؤ...... دشمن اور دوست میں فرق کرنا سیکھو۔

امن: شانتی اگرچہ دشمن کا سپاہی ہے لیکن ہے تو میرا دوست۔

تصور: دشمن کا سپاہی کبھی دوست نہیں ہوسکتا۔

امن: میں یہ ثابت کر کے دوں گا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا ہمدرد ہے۔ دشمن نہیں...... کیوں کہ اللہ نے دشمن کے سپاہی کو بھی بنایا اور ہمیں بھی......اللہ نے دشمن کے سپاہی کو بھی دو آنکھیں...... دو ہاتھ...... دو ٹانگیں عطا کی ہیں اور ہمیں بھی...... جب اُس نے عطائی میں فرق نہیں کیا تو ہم کون ہوتے ہیں فرق کرنے والے۔

تصور: مجھے تمہاری یہ باتیں سمجھ نہیں آرہی ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ دشمن نے تمہیں ڈس لیا ہے، دوستی کی آڑ میں

امن: شانتی......فقط دوست ہے اور اُس کا لباس بھی دوستی کے دھاگوں سے سلا ہوا ہے۔ میرا دوست کبھی مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔

(Change Over) موسیقی

سین......۸

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے۔
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے۔ (غزل کا ریکارڈ بج رہا ہے)۔

امن: تصور......ذرا یہ گانا بند کر دے (غزل پسِ منظر میں)۔

تصور: یہ گانا نہیں ہے، غزل ہے میری جان۔

امن: مہربانی کر کے یہ ریڈیو بند کر دو۔ مجھے اس غزل کا ایک ایک لفظ ڈس رہا ہے۔ اوپر سے اس (Barrack) بارک کا یہ سناٹا۔ اُف میں پاگل ہو جاؤں گا۔

تصور: O.K......کوئی بات نہیں میں ابھی بند کئے دیتا ہو۔ آ! آ! ریڈیو تو شلف پر رکھا ہوا ہے۔ پہلے میں اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوں آ! آ۔

ریڈیو کی آواز: اگلی غزل سننے سے پہلے ایک ضروری اطلاع ملاحظہ فرمائیں۔

''ہماری فوج نے ایک مہینے پہلے وجے گڑھ ریاست کے ایک فوجی جاسوس کو ملک کی سرحد کے اندر پکڑ لیا تھا جس کے قبضے سے تین لاکھ کے گہنے بھی برآمد کئے گئے تھے۔ یہ خبر اب تک چند وجوہات کی بنا پر راز رکھی گئی تھی۔ یہ اطلاع ہر خاص و عام کو دی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سلسلے میں فوج اور پولیس کی مدد کرنا چاہتا ہو تا کہ ملک کے غدار اور مجرم کے ساتھی کو پکڑا جا سکے۔ وہ اس E-Mail پر رابطہ قائم کرے۔ information778@gmail.com۔ اطلاع دینے والے شخص کو ۵ لاکھ روپئے انعام کے طور پر دیئے جائیں گے اور اُس کا نام راز ہی رکھا جائے گا۔

(Change Over) موسیقی

سین......۹

کرنل: کمانڈنٹ! یہ پورے ملک کے حفاظتی نظام پر ایک دھبہ ہے کہ آپ لوگ ایک جاسوس کے سینے سے ایک معمولی سا راز اگلوا نہ سکے۔

کمانڈنٹ: کرنل صاحب......ہم نے اپنے تمام داؤ آزما لئے لیکن بے سود......

وہ اُس شخص کا نام نہیں بتانا چاہتا ہے جس سے وہ ملنے ہماری سرحد کے اندر داخل ہوا تھا۔

کرنل: وہ ٹوٹ کیوں نہیں جاتا......آخر انسان ہی تو ہے۔

کمانڈنٹ: ہاں کرنل صاحب......وہ انسان ہی ہے لیکن لگتا ہے کہ اُس کے سر پر کسی کی محبت اور دُعا کا سایہ ہے۔

کرنل: Shut up......کمانڈنٹ......تم فضول بک رہے ہو......آخر مجھے بھی آگے جواب دینا ہے۔ میں کیا جواب دوں......یہی کہ اُس کے سر پر کسی کی دعا کا سایہ ہے۔

کمانڈنٹ: کرنل صاحب......میں سچ کہہ رہا ہوں وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہے۔ وہ مر سکتا ہے لیکن ٹوٹ نہیں سکتا۔

کرنل: نہیں......نہیں......اُسے زندہ رکھنا ہوگا......زندہ......

کمانڈنٹ: ہاں کرنل صاحب......ہمیں معلوم ہے تفتیش کے بھی اپنے اصول ہوتے ہیں......جن کے باہر ہم جا نہیں سکتے۔

کرنل: اور یہ مجرم ہمارے حریف ملک کا فوجی جاسوس ہے، ہمارے لئے اور بھی زیادہ پیچیدہ مسئلہ ہے۔

کمانڈنٹ: ہم کوشش کر رہے ہیں ابھی ہماری ہمت کا پتوار چھوٹا نہیں ہے ہمارے ہاتھوں سے۔

کرنل: ہمت کا پتوار چھوٹ گیا تو ہماری عزت کی کشتی تو ڈوب ہی جائے گی۔

کمانڈنٹ: کرنل صاحب! ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ عورتوں کے گہنے لے کر ہماری سرحد میں کیوں داخل ہوا اور اُس غدار کو گہنے ہی کیوں دینا چاہتا تھا۔

کرنل: یہ فضول سوال ہے ہمیں وہ غدار چاہیے کسی بھی قیمت پر۔ جو ملک کے اندر نقاب پہن کر بیٹھا ہے۔ ہمیں اُس منصوبے کو بے نقاب کرنا ہے جس کو ملک کے دشمن سرحدوں کے باہر بُن رہے ہیں۔

کمانڈنٹ: کرنل صاحب......ہم پوری کوشش کریں گے......

کرنل: کوشش نہیں......دو دن کے اندر اندر یہ معمّہ حل ہونا چاہیئے۔

(موسیقی) Change Over

سین......۱۰

تصور: ارے امن......تمہاری چھٹی منظور کب ہوئی۔

امن: ابھی نہیں ہوئی۔

تصور: پھر رختِ سفر کیوں باندھ رہے ہو......کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے؟

امن: تصور......میں اپنا گناہ قبول کرنے جا رہا ہوں۔

تصور: گناہ......کون سا گناہ؟

امن: وہی گناہ جو ہر ذی شعور انسان کرتا ہے۔ محبت کا گناہ...... دوستی کا گناہ۔ میں شانتی پر مزید ظلم ہونے نہیں دوں گا۔ وہ ٹاچر پر ٹاچر برداشت کئے جا رہا ہے۔ کس لئے۔ مجھے بچانے کے لئے......اور میں بزدلوں کی طرح......

تصور: امن......ایسی غلطی مت کرنا...... تمہیں معلوم ہے تمہاری جرم کی سزا کیا ہوگی...... حالانکہ تم بے گناہ مجرم ہو......لیکن ملک کا قانون اتنا فراغ دل نہیں ہے کہ تمہارے معصوم جذبات کو سمجھ سکے۔ بھائی تمہیں غدار تصور کیا جائے گا......اور ایک غداری کی سزا کیا ہے، وہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔

امن: تصور! مسئلہ یہ نہیں ہے کہ جرمِ محبت کی کیا سزا ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ میں نے دوستی کا راستہ چن لیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ میں اس پر چل کر ثابت قدم رہوں کہ نہیں۔

تصور: امن! جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ صحیح ہے لیکن یہ راستہ پھانسی کے پھندے پر ختم ہوتا ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہیں سے پلٹ جاؤ۔

امن: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایک بے قصور کو پھانسی پر چڑھتے ہوئے دیکھوں اور خاموش رہوں......اُس بے قصور کو جو مجھے بچانے کے لئے صلیب کو چومنے جا رہا ہے۔

تصور: آخر تمہاری بات کا اثر کون قبول کرے گا۔

امن: لیکن میں پھر بھی دونوں ملکوں کو مرتے مرتے پیغام دوں گا کہ جب دو فوجی آپس میں دوستی کے بندھن میں بندھ سکتے ہیں تو دو حکمران اس بندھن میں کیوں بندھ نہیں سکتے۔

تصور: اور اگر دو ملکوں کے حکمران آپس میں دوست بن گئے تو دونوں ملکوں میں امن کے پھول کھلیں گے۔

امن: تصور......ایک فوجی ہمیشہ گولی کی زبان بولتا ہے لیکن آج یہ فوجی محبت کی زبان بولے گا تا کہ دونوں ملکوں میں سیاست کی آب و ہوا بدل جائے......

اچھا تصور......میں جا رہا ہوں......خدا حافظ

تصور: اللہ تمہیں کامیاب کرے......خدا حافظ

The End

............☆☆☆............

☆......منوج شیری

گھر

کردار

☆	علی محمد	☆	فاطمہ
☆	ماسٹر جی	☆	ایک بچہ
☆	دوسرا بچہ	☆	تیسرا بچہ
☆	سارہ	☆	سب انسپکٹر
☆	سپاہی	☆	منشی
☆	ایک عورت	☆	ایک شخص
☆	دوسرا شخص	☆	لڑکا

(صبح کا وقت۔ پرندوں کا چہچہاٹ اور مسجد سے آتی ہوئی اذان)

(سٹیج پر بستر بچھا ہے جس میں ایک عورت لیٹی ہے اور کچھ دوری پر ایک مرد)

آدمی: (علی محمد)، او فاطمہ۔۔۔۔او فاطمہ جاگو جاگو، جاگ جاؤ۔ دیکھو دن نکل آیا ہے۔

(عورت کے کراہنے کی آواز)

فاطمہ: کبھی تو پوری رات سونے دیا کرو۔ ابھی تو سوئے ہیں۔ ابھی اٹھنا پڑ رہا ہے۔ اس کرائے کے مکان میں نیند بھی برابر نہیں ہو پاتی۔

علی محمد: گلے شکوے بعد میں کرنا۔ غسل خانے سے جلدی فارغ ہو جانا، نہیں تو مکان مالکن سویرے سویرے شروع ہو جائے گی۔

فاطمہ: وہ تو کل شام سے شروع ہے۔

علی محمد: کیا ہوا۔ مُنے نے پھر کوئی شیشہ توڑا۔

فاطمہ: نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔

علی محمد: پھر کیا ہوا؟ (حیرت کے ساتھ)۔

فاطمہ: کہہ رہی تھی کہ ہم پانی کی ٹنکی خالی کر دیتے ہیں اور کہہ رہی تھی۔۔۔

علی محمد: اور کیا کہہ رہی تھی۔

فاطمہ: کہہ رہی تھی کمرے خالی کرو۔

علی محمد: خالی تو کرنا ہے مگر ہمت نہیں مجھے ایک اور مکان ڈھونڈنے کی۔

فاطمہ: آخر کب تک ہم مکان بدلتے رہیں گے؟

علی محمد: میں نے بھی یہ سوال اپنے آپ سے کئی بار کیا کہ کتنی بار ہم یہ ٹوٹے پھوٹے برتن میلی کچلی کمبلیں اور بوسیدہ بستر دنیا والوں کی گھورتی ہوئی آنکھوں کے سامنے سے ایک اور قید خانے میں لے جائیں جہاں ایک اور مکان مالک، مجھے میرے بچوں کو اور میرے مہمانوں کو طرح طرح کی باتیں سُنا کر ذلیل کریں گے۔

فاطمہ: کیا کریں، ہماری قسمت ہی کچھ ایسی ہے مگر چلو چھوڑ اللہ بہت ہی کرم کرنے والا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہمارے لئے ضرور رکھا ہوگا۔

علی محمد: چلو جلدی کرو۔ وقت نکلتا جا رہا ہے۔

فاطمہ: خدایا! کب اپنے دو کمرے ہوں گے اور میں دیر تک آرام سے سو سکوں گی۔

(بچوں کے کھیلنے کا شور) (سٹیج پر کھیلتے ہوئے بچے)

ایک بچہ: بال مجھے دو۔ بال ادھر لاؤ۔

دوسرا بچہ: مشتاق کو دو۔ مشتاق کو دو۔

تیسرا بچہ: اوہو۔ وہاں کیوں ماری۔ سارہ آنٹی اب بال نہیں دے گی۔

پہلا بچہ: کیوں نہیں دے گی۔

دوسرا بچہ: وہ ہمیں گھر خالی کرنے کے لئے کہہ رہی ہے۔

تیسرا بچہ: اب کیا کریں۔ ہماری تیسری بال بھی گئی۔

پہلا بچہ: اب ممی بال کے لئے پیسے نہیں دینے والی۔

(ایک ونگ سے ایک عورت نکلتی ہے)۔

عورت کی آواز: آپ بچے ہو کہ کوئی جن یا کوئی خدا کی بلا۔ چار بار میں صفائی کر چکی ہوں مگر آپ لوگ بار بار گندا کر دیتے ہو۔ پتہ نہیں کس گندے ماں باپ کی اولاد ہو۔

ایک بچے کا جواب: آنٹی! آپ نے بال نہیں دینا ہو تو نہیں دو۔ مگر ماں باپ کو گالی مت دو۔

عورت: تیری زبان تو باپ کی آری کی طرح چلتی ہے۔

(اس بیچ فاطمہ بھی سٹیج پر آجاتی ہے)۔

فاطمہ: سارہ ہم جلد ہی تمہارا مکان خالی کر دیں گے مگر بچوں کے ساتھ مت لڑو۔ ان کو بال واپس دو۔

سارہ: اوہو۔ بڑی آئی مجھے سکھانے والی۔ بچوں کے کھیلنے کا اتنا ہی خیال ہے تو اُن کے لئے پولو وئیو کے نزدیک گھر کیوں نہیں بناتی۔

فاطمہ: خدا نے چاہا تو ضرور بنائیں گے۔ ابھی تو بال دے دے۔ ہم تمہارے گھر میں کوئی مفت نہیں رہتے۔

سارہ: مفت کیوں رہ لے گی۔ میں نے کیا یہاں بابا کا لنگر کھول رکھا ہے۔

فاطمہ: تیرا لنگر تو کتے بھی نہیں کھائیں گے۔ بڑی آئی مفت کھلانے والی۔

سارہ: بڑی آئی پیسے والی۔ ایک سال میں کبھی بھی وقت پر کرایہ نہیں دیا۔

فاطمہ: کبھی تیرا کرایہ ہم نے رکھا بھی نہیں۔

سارہ: نہیں دیتے تیرے بچوں کو بال، کیا کرلے گی۔

فاطمہ: بچوں کو بال دے ورنہ میں تمہارے بال نکال دوں گی۔

سارہ: میرے بالوں کو ہاتھ لگایا تو دیکھ لینا تیرے ترکھاں کو تھانے نہ پہنچا دیا، میرا نام سارا نہیں۔

فاطمہ: آج یا کل تیرا مکان تو مجھے خالی کرنا ہی ہے مگر تیرا مکان چھوڑنے سے پہلے میں تیرے بال نوچ ہی لوں گی۔ (دونوں عورتیں ایک دوسرے سے لڑ پڑتی ہیں)۔

ایک عورت کی آواز: ارے چھوڑو، زخمی ہو جائے گی۔

اس کے بال چھوڑو: یہ مرجائے گی۔

ایک مرد کی آواز: ارے! میری بیوی کو چھوڑ۔

سین ختم

(سٹیج پر لگی ایک کرسی اور میز، ایک سب انسپکٹر اس پر بیٹھا ہوا)

ایک آواز: علی محمد پیش ہو۔

علی محمد: جناب، اجازت ہے۔ (علی محمد، ونگ سے داخل ہوتا ہے)۔

سب انسپکٹر: آؤ۔ آؤ۔ اندر آؤ۔

سب انسپکٹر: آپ لوگ کیوں مکان مالک سے لڑائی کرتے ہو۔

علی محمد: نہیں جناب، ایسی کوی بات نہیں ہے۔

آواز: بکواس کرتا ہے۔ تمہاری بیوی نے اُس کی پٹائی کی ہے۔

علی محمد: جناب، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

سب انسپکٹر: پھر آپ ہی فرمائیے کہ آپ کو تھانے میں کیوں بلایا گیا ہے۔

علی محمد: ایس۔ ایچ۔ او صاحب بات یہ ہے کہ ہماری مکان مالکن ہمیں یعنی میری بیوی اور میرے بچوں کو بہت ستاتی ہیں۔
میری بیوی کی کوئی غلطی نہیں ہے۔

ایس۔ ایچ۔ او: کیا بکواس کرتے ہو۔ لڑائی تمہاری بیوی نے کی ہے اور تمہارے بچوں نے گیند مار کر اُن کے شیشے توڑے۔ حد تو یہ کہ تمہاری بیوی نے بال نوچے اُس کے مگر تمہارا کہنا ہے کہ غلطی اُن لوگوں کی ہے۔
(تھوڑی دیر بعد) چپراسی ذرا منشی کو بلاؤ۔

سپاہی: اچھا صاحب (منشی سٹیج پر آتا ہے)۔

منشی: مجھے اجازت ہے، جناب۔

ایس۔ ایچ۔ او: اس آدمی اور اُس کی بیوی کو حوالات میں ڈال دو۔

علی محمد: جناب میں حوالات جاؤں گا مگر میری بیوی کو چھوڑ دو۔

ایس۔ ایچ۔ او: بکواس بند کرو۔
(منشی علی محمد اور فاطمہ کو ونگ سے باہر لے جاتا ہے)
(سٹیج پر ایس ایچ او کرسی پر)

منشی: جناب اندر آ سکتا ہوں۔

ایس۔ ایچ۔ او: آجاؤ۔

منشی: جناب، ہم اس عورت کو تھانے میں نہیں رکھ سکتے۔ ایس۔ ایچ۔ او مجھے معلوم ہے۔ آپ ذرا اس کے خاوند کو لے آؤ۔

منشی: اچھا، جناب (تھوڑی دیر کے بعد)

منشی: جناب علی محمد حاضر ہے

ایس۔ایچ۔او: دیکھو علی محمد آج میں تمہاری بیوی اور تمہیں مچلکہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر اگر آگے سے مجھے کوئی شکایت ملی تو سبق سکھاؤں گا۔

علی محمد: ٹھیک ہے جناب، آپ کی بہت مہربانی۔

ایس۔ایچ۔او: لاؤ اس کی بیوی کو۔

منشی: ٹھیک ہے جناب۔

(تھوڑی دیر کے بعد)۔

ایس۔ایچ۔او: سنو علی محمد، بیوی کو قابو میں رکھو۔

علی محمد: ٹھیک ہے جناب۔

(علی محمد اور اس کی بیوی ونگ کے ذریعے اسٹیج پر آجاتے ہیں)۔

فاطمہ: چلتے ہوئے میری مانو اب کی بار مکان کی بنیاد ڈال دو اور جتنا جلدی ہو سکے اُس کو تیار کرو۔ (علی محمد اور فاطمہ سٹیج پر چل رہے ہیں)۔

علی محمد: مجھے جلد بازی میں مکان بنانا ہوتا تو کب کا بنالیا ہوتا۔

فاطمہ: تمہیں کون سا تاج محل بنانا ہے۔

علی محمد: دیکھنا، میرا مکان کیسا ہوگا۔ ابھی تک میں نے ۱۰۰ سے زیادہ نقشے جمع کئے ہیں۔

فاطمہ: جب مکان بن جائے تو اُن نقشوں میں سارہ کو جلانا۔ اُس عورت نے میرا جینا حرام کیا ہے۔

علی محمد: اس عورت کو صرف چھ مہینے جھیلو۔ چھ مہینے کے بعد ہم اپنے مکان میں ہوں گے۔

فاطمہ: ٹھیک ہے۔

سین ختم

(آتش بازی اور پٹاخے جلانے کی آوازیں)

(سٹیج پر علی محمد اور فاطمہ بڑے خوش و خرم تکیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ونگ سے ایک عورت گھستی ہے۔)

ایک عورت: فاطمہ مبارک ہو۔

فاطمہ: خیر مبارک

عورت: گھر تو بہت خوبصورت بنایا ہے۔

علی محمد: ہاں بہن بہت خوبصورت ہے۔ میں نے اس میں اپنا سارا ہنر ڈالا ہے۔

فاطمہ: وہ دیکھو ماسٹر جی بھی آرہے ہیں۔

علی محمد: بہت ہی بھلا آدمی ہے۔

(ایک مرد ونگ سے سٹیج پر گھستا ہے)۔

مرد: اسلام علیکم۔

علی محمد: وعلیکم السلام، ماسٹر جی۔

ماسٹر جی: مبارک ہو علی محمد، بڑا خوبصورت مکان بنایا ہے۔

علی محمد: جناب بہت محنت کی ہے میں نے اس کے لئے۔

ماسٹر جی: ہاں علی محمد۔

علی محمد: یہ لیجئے، چائے کی پیالی سنبھالیں۔

ماسٹر جی: (چائے لیتے ہوئے) بہت خرچہ ہوا ہوگا۔

علی محمد: میری عمر کی پوری کمائی۔

ماسٹر جی: اب اس کا خیال رکھنا۔ اس کے بچاؤ کے لئے کیا سوچا ہے۔

علی محمد: میں سمجھا نہیں۔

ماسٹر جی: دیکھو مکان تو بہت خوبصورت ہے اور آپ نے اپنی ساری کمائی اس میں لگائی ہے۔ مگر خدا نہ کرے کل کو کوئی واردات ہو جائے۔

علی محمد: کیا کہہ رہے ہو ماسٹر جی واردات کیوں ہو جائے گی۔

ماسٹر جی: دیکھو علی محمد، وقت کا کوئی بھروسہ نہیں، کب کیا ہو جائے کسے خبر ہے۔

علی محمد: وہ تو ٹھیک مگر آپ مکان کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔

ماسٹر جی: میری مانو تو مکان کا بیمہ کروالو۔

علی محمد: بیمہ کیا ہوتا ہے۔ مجھے ذرا سمجھاؤ۔

ماسٹر جی: بیمہ کمپنی کچھ پیسوں کے بدلے میں یہ ذمہ داری لیتی ہے کہ......

فاطمہ: کیا ذمہ داری لیتی ہے۔

ماسٹر جی: وہ یہ ذمہ داری لیتی ہیں کہ اگر آپ کے مکان یا کسی اور جائیداد کو کسی وجہ سے نقصان ہو جائے یا وہ تباہ ہو جائے۔

فاطمہ اور علی محمد: تو۔

ماسٹر جی: وہ بیمہ کمپنی والے آپ کو معاوضہ ادا کر دیتے ہیں۔

علی محمد: مگر اس میں کتنے روپیہ درکار ہوں گے۔

فاطمہ: جتنے بھی روپیہ درکار ہوں، ہم ان کا انتظام کرلیں گے۔

ماسٹر جی: پھر ٹھیک ہے۔

علی محمد: ہم کل شہر چلیں گے۔

سین ختم

(سٹیج پر اندھیرا (جوتوں کے چلنے کی آواز)

آگ۔آگ (کی آوازیں)

علی محمد: فاطمہ ذرا کھڑکی سے دیکھو باہر آگ آگ کی آوازیں آرہی ہیں۔ (سٹیج پر علی محمد اور فاطمہ پریشانی کی حالت میں)

(تھوڑی دیر بعد)

(سٹیج پر بگڈر فلیکر Flickers کا استعمال)

فاطمہ: او میرے خدا! لون صاحب کا مکان جل رہا ہے۔

علی محمد: کیا بول رہی ہو۔

علی محمد: پھر تو بڑی مصیبت ہے۔

فاطمہ: ہاں لون صاحب کا مکان تو بس، ہم سے تھوڑی ہی دوری پر ہے۔

علی محمد: میرے خدا۔ ہم کیا کریں فاطمہ؟

فاطمہ: تم بچوں کو ساتھ لے کر باہر نکلو۔

علی محمد: بچے خود نکل آئیں گے تم ساماں نکالنا شروع کرو۔

فاطمہ: ارے میرے خدا! ہم سے کیا خطا ہوئی۔ اللہ ہمارے گھر کو بچا۔ بہت محنت سے ہم نے یہ گھر بنایا ہے۔

علی محمد: میرے خدا! میری ساری عمر کی محنت کی رکھوالی کرنا۔

(آگ آگ کی آوازیں برابر جاری ہیں)

ایک شخص: علی محمد، فاطمہ۔ چلو گھر کو خالی کرو۔

علی محمد: میں نے اب تک کئی گھر خالی کئے ہیں، میں یہ گھر خالی نہیں کروں گا۔

دوسرا شخص: چلو! ناداں مت بنو۔ فاطمہ گھر سے باہر نکل رہی ہے۔ تم بھی نکل چلو۔

فاطمہ: مین بچے باہر نکال رہی ہوں۔ آگ بہت پھیل رہی ہے۔ جلدی نکلو۔

پہلا شخص: علی محمد ایک صرف تمہارے مکان کو خطرہ نہیں ہے۔ میرا مکان بھی جل رہا ہے۔ تمہارا تو ابھی بچا ہوا ہے۔

علی محمد: میں گھر میں رہ کر اپنا گھر بچاؤں گا۔

دوسرا شخص: یہ تو پاگل ہو رہا ہے۔ جیسے صرف اس کا ہی گھر جل جائے گا۔ چلو نکلو۔

علی محمد: میں گھر میں رہ کر اپنا گھر بچاؤں گا۔

دوسرا شخص: یہ تو واقعی پاگل ہو رہا ہے۔ چلو نکلو۔ پاگل مت بنو۔

علی محمد: ارے جاؤ، آپ لوگوں کو کیا معلوم یہ گھر میں نے کیسے بنایا۔ ۴۰ سال دن رات کی کمائی ہے۔ میرا یہ گھر۔ آپ لوگوں کو کیا معلوم اس کے ایک ایک دروازے کے لئے میں نے کئی دن ایک کئے ہیں۔ مجھے میرا گھر کتنا پیارا ہے۔ آپ لوگوں ک کیا معلوم میرا وجود مکان مالکوں کے تانے سُن کر کتنا جلا ہے۔ کچھ بھی ہو میں اس گھر سے نہیں نکلوں گا۔

فاطمہ: ارے! کوئی میرے شوہر کو باہر نکالے۔

ایک شخص: وہ تو باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا۔

فاطمہ: اس کو گھسیٹ کر باہر لے آؤ۔

ایک شخص: ٹھیک ہے۔

سین ختم

(تھوڑی دیر بعد)

علی محمد: ارے مجھے چھوڑو میں یہی پر ہی رکوں گا۔ میں اپنے آشیانے کو جلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ارے! مجھے چھوڑو۔ مجھے چھوڑو۔

ایک شخص: آگ بہت پھیل گئی ہے۔

فاطمہ: ارے میرے خدایا! میرا آشیانہ جلنے لگا۔

ایک بچے کی آواز: پاپا! آگ میرے کمرے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میرے سارے کھلونے جل جائیں گے (بچہ رونے لگتا ہے)۔

فاطمہ: بیٹا چُپ رہو۔ ہم نئے کھلونے لادیں گے (عورت کی بھی رونے کی آوازیں)۔

سین ختم

(تھوڑی دیر بعد)

(مسجد سے اذان کی آواز)

ایک شخص: علی محمد کا مکان رات بھر جلتا رہا۔

دوسرا شخص: ہاں یار، کافی پختہ مکان بنایا تھا۔ سنا ہے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

پہلا شخص: چلو وہ وہاں ہے، ساتھ میں اُس کے بیوی بچے بھی ہیں۔

(تھوڑی دیر بعد)

(اسٹیج پر ایک ٹین کے شیڈ Shed کا سیٹ)

ایک شخص کی آواز: او علی محمد اٹھو نماز کا وقت ہو گیا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

علی محمد: مجھے نہیں آنا۔ میرا تو دل جل رہا ہے۔

فاطمہ: چلو اٹھو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ جاؤ خدا کے گھر میں سجدہ کر کے آ جاؤ۔ وہ سب کچھ لینے والا بھی ہے اور دینے والا بھی ہے۔

علی محمد: چلو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی

(اذان اختتام کو پہنچتی ہے)

(بارش کے برسنے کی آواز)

فاطمہ: ان جلی ہوئی ٹین کی چادروں میں معلوم نہیں کتنے سوراخ ہیں۔ بارش ٹپ ٹپ اندر آتی ہے۔

علی محمد: اب کیا کریں، ہماری قسمت ہی خراب ہے۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

علی محمد: ذرا دیکھو، باہر کون ہے۔

فاطمہ: میں دیکھتی ہوں۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

فاطمہ: اوہو، اتنی بارش میں ماسٹر جی کیوں آئے۔
(ماسٹر جی اسٹیج پر داخل ہوتا ہے)۔

ماسٹر جی: بات ہی ایسی کچھ تھی بارش میں آنا پڑا۔

علی محمد: آؤ ماسٹر جی، آج ہمارے پاس آپ کو بٹھانے کے لئے بھی جگہ نہیں۔

ماسٹر جی: کوئی بات نہیں، آپ کے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔

علی محمد اور فاطمہ: (ایک ساتھ) وہ کیا ہے ہمیں تو بتائے۔ ہم تو تقدیر کے مارے ہیں۔

ماسٹر جی: علی محمد آپ کو یاد ہے ہم نے آپ کے مکان کا بیمہ کرایا تھا۔

علی محمد: جی ہاں مجھے خوب یاد ہے۔ میں آپ کے ساتھ اس غرض سے شہر بھی گیا تھا۔

ماسٹر جی: کل جب ڈاکیہ خط لایا تو مجھے یاد آیا۔ خدا نے چاہا تو تمہیں اچھا خاصا روپیہ ملے گا۔

فاطمہ: آپ ہمارے لئے فرشتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ آج ہی شہر چلے جائیں۔

علی محمد: آج بارش ہو رہی ہے۔ کل جائیں گے۔

ماسٹر جی: ہاں کل سویرے ہی چلیں گے۔

(بارش کے گرنے کی، آواز کے ساتھ ہی Scene مکمل ہو جاتا ہے)۔

نیا سین شروع

(Type writer) کی آواز۔ دفتر کا ماحول

ماسٹر جی: ارے بیٹا سنو۔ منیجر صاحب بیٹھے ہیں؟

لڑکا: جی ہاں، بیٹھے ہیں۔

ماسٹر جی: ہماری یہ پرچی اُن کی میز پر رکھیں۔

لڑکا: جی اچھا:

(تھوڑی دیر بعد)

(ایک دفتر کا سیٹ)

ماسٹر جی: ٹھیک ہے، بیٹا۔

(تھوڑی دیر بعد)

(سٹیج پر ایک کرسی، ایک میز اور سامنے دو کرسیاں، دفتر کا ماحول)

ماسٹر جی: ہم بیٹھ سکتے ہیں۔

ماسٹر جی: ہم نے آپ کی کمپنی کے ساتھ، ان کے مکان کا بیمہ کرایا ہے۔

منیجر: اچھی بات ہے۔

ماسٹر جی: جس مکان کا بیمہ کرایا وہ مکان کچھ دن قبل جل گیا۔

منیجر صاحب: تو آج آپ معاوضے کے لئے آئیں ہیں۔

علی محمد: جی جناب۔

منیجر: آپ ذرا اپنی پالیسی دکھائیں۔

علی محمد: یہ دیکھئے جناب۔

منیجر: یہ تو کافی بڑی رقم ہے۔ آپ کا مکان شہر کے کون سے محلے میں ہے۔

ماسٹر جی: شہر میں نہیں بلکہ گاؤں میں ہے۔

منیجر: یہ پالیسی کس نے کی ہے۔ گاؤں میں مکان کی یہ قیمت ہو ہی نہیں سکتی۔

علی محمد: جناب ایسی بات نہیں ہے۔ میرا مکان بہت ہی اچھا تھا۔

منیجر: آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ مگر میری کمپنی گاؤں کے لئے ایسا معاوضہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوسکتی۔

ماسٹر جی: مگر ہماری پالیسی میں جو رقم درج ہے۔

منیجر: مجھے نہیں معلوم کہ ابھی تک کسی گاؤں کے مکان کے لئے اتنی رقم لکھی گئی ہو۔

علی محمد: جناب کچھ انصاف کریں۔ میرا مکان اس سے زیادہ رقم کا حق دار تھا۔

منیجر: مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

علی محمد: ماسٹر جی آپ ہی منیجر صاحب کو سمجھائیں۔

ماسٹر جی: منیجر صاحب علی محمد کا مکان پورے علاقے میں مشہور تھا۔

منیجر: جی، ضرور رہا ہوگا۔ مگر ہم اتنا معاوضہ دے نہیں سکتے۔

علی محمد: جناب یہ تو ناانصافی ہے۔

ماسٹر جی: آپ ہمت نہ ہاریں۔ ہم چیف منیجر سے بات کریں گے۔

(اسکول کا سیٹ)

(سکول کا ماحول۔ بچے زور زور سے پڑھ رہیں گے)

ماسٹر جی: ذرا آہستہ پڑھو، کوئی آرہا ہے۔

علی محمد: جناب آسکتا ہوں۔

ماسٹر جی: آؤ۔ آؤ۔ علی محمد۔ آؤ۔ سناؤ کیا حال ہے؟

علی محمد: جناب، چیف منیجر نے بھی ہماری کوئی مدد نہیں کی۔

ماسٹر جی: میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ کیا کریں۔

علی محمد: مگر میں نے کچھ سوچ لیا ہے۔

ماسٹر جی: مجھے بھی ذرا بتاؤ، تم نے کیا سوچ لیا ہے۔

علی محمد: ضرور بتاؤں گا۔ پہلے بتائیے آپ کل میرے ساتھ شہر چلیں گے۔

ماسٹر جی: کل نہیں پرسوں چل سکتا ہوں۔

علی محمد: ٹھیک ہے۔

ماسٹر جی: مگر ہمیں جانا کہاں ہیں۔

علی محمد: بیمہ کمپنی کے دفتر۔

ماسٹر جی: مگر وہ لوگ تو مانتے ہی نہیں۔

علی محمد: میں اُن کو منا کر ہی دم لوں گا۔

ماسٹر جی: وہ کیسے۔

علی محمد: پرسوں بتاؤں گا۔

ماسٹر جی: ٹھیک ہے۔

سین ختم

(تھوڑی دیر بعد

دفتر کا ماحول

(Type Writer) کی آواز۔ دفتر کا سیٹ، سٹیج پر سجا ہوا)

علی محمد: معلوم نہیں منیجر صاحب آئے ہوں گے کہ نہیں۔

ماسٹر جی: مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ آئے ہیں۔ مگر آپ اس ڈبے میں کیا لائے ہو۔ منیجر کے لئے کوئی تحفہ لائے ہو۔

علی محمد: جی نہیں ایسی کوئی شئے نہیں ہے۔

ماسٹر جی: پھر کیا ہے۔ ابھی منیجر صاحب کے کمرے میں دکھاؤں گا۔

منیجر: آؤ جناب آؤ۔

علی محمد۔ منیجر صاحب آج میں آپ سے کوئی بحث نہیں کروں گا۔ مجھے صرف اپنے میز پر کچھ خالی جگہ دیجئے۔

منیجر: ارے سنو (چپراسی کی طرف) میز پر تھوڑی جگہ بناؤ۔

علی محمد: ٹھیک ہے منیجر صاحب میں یہاں اپنی کاری گری کا نمونہ آپ کو پیش کروں گا۔

(ایک مکان کا ماڈل علی محمد میز پر رکھتا ہے)۔

منیجر: اوہو۔ یہ تو یورپ کے کسی مکان کا ماڈل ہے۔

ماسٹر جی: علی محمد یہ تو کمال ہے۔ تم نے اپنے گھر کا ماڈل بنایا۔

علی محمد: جی ماسٹر جی۔ منیجر صاحب بتائے خوبصورت ہے کہ نہیں۔

منیجر: واقعی، بہت خوبصورت ہے۔

علی محمد: یہ تو نقل ہے جناب اصلی گھر کتنا خوبصورت تھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

منیجر: مجھے اب یقین ہوا کہ آپ صحیح بول رہے ہیں۔

ماسٹر جی: میرے خیال سے اب آپ کو ہمارا معاوضہ ادا کرنا چاہیئے۔

منیجر: جی ضرور ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف ہے اور کمپنی کو یہ معاوضہ دینے میں اب کوئی اعتراض نہیں، مگر میری علی محمد سے ایک گزارش ہے۔

علی محمد: جناب وہ کیا۔

منیجر: آپ کے گھر کا ماڈل ہم اپنے دفتر میں رکھنا چاہتے ہیں۔

علی محمد: جی ضرور رکھیں مگر اس کے نیچے یہ ضرور لکھیں کہ گھر کی قیمت روپیوں سے ادا نہیں کی جا سکتی۔

منیجر: ایسا ہو ہوگا۔

☆☆☆

علی محمد: ضرور بتاؤں گا۔ پہلے بتائیے آپ کل میرے ساتھ شہر چلیں گے۔

ماسٹر جی: کل نہیں پرسوں چل سکتا ہوں۔

علی محمد: ٹھیک ہے۔

ماسٹر جی: مگر ہمیں جانا کہاں ہیں۔

علی محمد: بیمہ کمپنی کے دفتر۔

ماسٹر جی: مگر وہ لوگ تو مانتے ہی نہیں۔

علی محمد: میں اُن کو منا کر ہی دم لوں گا۔

ماسٹر جی: وہ کیسے۔

علی محمد: پرسوں بتاؤں گا۔

ماسٹر جی: ٹھیک ہے۔

سین ختم

(تھوڑی دیر بعد

دفتر کا ماحول

(Type Writer) کی آواز۔ دفتر کا سیٹ، سٹیج پر سجا ہوا)

علی محمد: معلوم نہیں منیجر صاحب آئے ہوں گے کہ نہیں۔

ماسٹر جی: مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ آئے ہیں۔ مگر آپ اس ڈبے میں کیا لائے ہو۔ منیجر کے لئے کوئی تحفہ لائے ہو۔

علی محمد: جی نہیں ایسی کوئی شئے نہیں ہے۔

ماسٹر جی: پھر کیا ہے۔ ابھی منیجر صاحب کے کمرے میں دکھاؤں گا۔

منیجر: آؤ جناب آؤ۔

علی محمد۔ منیجر صاحب آج میں آپ سے کوئی بحث نہیں کروں گا۔ مجھے صرف اپنے میز پر کچھ خالی جگہ دیجئے۔

منیجر: ارے سنو (چپراسی کی طرف) میز پر تھوڑی جگہ بناؤ۔

علی محمد: ٹھیک ہے منیجر صاحب میں یہاں اپنی کاری گری کا نمونہ آپ کو پیش کروں گا۔

(ایک مکان کا ماڈل علی محمد میز پر رکھتا ہے)۔

منیجر: اوہو۔ یہ تو یورپ کے کسی مکان کا ماڈل ہے۔

ماسٹر جی: علی محمد یہ تو کمال ہے۔ تم نے اپنے گھر کا ماڈل بنایا۔

علی محمد: جی ماسٹر جی۔ منیجر صاحب بتائے خوبصورت ہے کہ نہیں۔

منیجر: واقعی، بہت خوبصورت ہے۔

علی محمد: یہ تو نقل ہے جناب اصلی گھر کتنا خوبصورت تھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

منیجر: مجھے اب یقین ہوا کہ آپ صحیح بول رہے ہیں۔

ماسٹر جی: میرے خیال سے اب آپ کو ہمارا معاوضہ ادا کرنا چاہیئے۔

منیجر: جی ضرور ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف ہے اور کمپنی کو یہ معاوضہ دینے میں اب کوئی اعتراض نہیں، مگر میری علی محمد سے ایک گزارش ہے۔

علی محمد: جناب وہ کیا۔

منیجر: آپ کے گھر کا ماڈل ہم اپنے دفتر میں رکھنا چاہتے ہیں۔

علی محمد: جی ضرور رکھیں مگر اس کے نیچے یہ ضرور لکھیں کہ گھر کی قیمت روپیوں سے ادا نہیں کی جا سکتی۔

منیجر: ایسا ہو ہوگا۔

☆☆☆

☆......پرویز ملک

اونچے دروازے

کردار

۱۔ الفو — ساٹھ، پینسٹھ سال کا مزدور
۲۔ الیاس — بائیس، پچیس سال کا نوجوان
۳۔ دھنی رام — پچپن، ساٹھ سال کا بزرگ
۴۔ نظیر — ٹھیکیدار، پینتالیس پچاس سال کا
۵۔ رھندھیر — ٹھیکیدار، پینتالیس پچاس سال کا
۶۔ سکینہ — ایک بیس، بائیس سالہ لڑکی
۷۔ مزدور......۱
۸۔ مزدور......۲
۹۔ کچھ اور مزدور

منظر......۱

رات کا پہلا پہر ہے۔آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔بجلی چمکتی ، ہے گرجتی ہے۔شہر کے ایک بڑے چوراہے پر چنار کے ایک پیڑ کے نیچے بنے چبوترے پر ساٹھ سالہ بوڑھا الفو اور اس کا نوعمر بیٹا الیاس چادر اوڑھے لیٹے ہوئے دکھائی

دیتے ہیں۔ بجلی کی لگاتار چمک اور گرج سے پریشان ہوکر الیاس اُٹھ بیٹھتا ہے اور ڈری ڈری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ الفو کی طرف دیکھتا ہے جو اس وقت گہری نیند میں ڈوبا خراٹے بھر رہا ہوتا ہے۔ اچانک بجلی کوندتی ہے اور ایک تیز گرج کے ساتھ سارے ماحول کو ہیبت ناک بنا کر چلی جاتی ہے۔ الیاس بُری طرح کانپ اٹھتا ہے۔ وہ الفو کی طرف دیکھتا ہے جس کی نیند اب ٹوٹ چکی ہوتی ہے......اور وہ برابر بولے جا رہا ہے۔

الفو: توبہ استغفار......توبہ استغفار......یا اللہ خیر، یا اللہ خیر......

(الیاس فکر مند ہوکر الفو سے کہتا ہے۔)

الیاس: بابا لگتا ہے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔

(الفو کچھ آہستگی سے جواب دیتا ہے۔)

الفو: خدا خیر کرے......میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔

الیاس: کیا بات ہے بابا، آپ تو سو رہے تھے......

الفو: یہ کوئی پانچ منٹ پہلے آنکھ لگی تھی......کمبخت بجلی کی گرج نے جگا دیا......

الیاس: کیا ہوگا بابا...... دیکھو نا ہوا بھی تیز چلنے لگی ہے۔ اس انجان شہر میں اس وقت کہاں جائیں گے۔ بابا ہم نے غلطی کی جو گاؤں چھوڑ کر شہر چلے آئے۔ وہاں سر پر چھت تو تھی......

الفو: (سرد آہ بھرتے ہوئے) بیٹا وہاں چھت تو تھی مگر پیٹ کی آگ جلانے لگی تھی۔ پہلے سیدھے سادے لوگ ہوا کرتے تھے۔ مٹھی بھر آٹا دے دیا کرتے تھے تو زندگی گزر رہی تھی۔ مگر اب پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ سو سو سوال کرنے لگے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ بھیک کیوں مانگتے ہو، مزدوری کیوں نہیں کرتے......اس لئے سوچا شہر چلیں، مزدوری کریں......مگر اب یہاں کوئی ٹھکانہ مل جائے تب نا......ورنہ کیا ہوگا......اللہ تیری آس......یہ کہہ کر الفو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے اور الیاس سے کہتا ہے۔

ذرا میرا سر دبا دے گا۔ بہت زور سے درد ہو رہا ہے

الیاس: او ہو...... ہو...... بابا آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ (اسی لمحے بجلی پھر تیزی سے کوندتی ہے)۔

الفو: یا اللہ خیر...... آج کی رات خیر سے گزر جاتی تو کل ٹھیکیدار سے منت سماجت کرتا، کہیں کوئی سر چھپانے کی جگہ مل جاتی......

الیاس: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں بابا ہاں...... اُس دن جب ٹھیکیدار نے مجھے چابی لانے کے لئے گھر بھیجا تھا نا...... وہاں ڈھیر سارے کمرے ایسے ہی خالی پڑے تھے۔ بابا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے ایک بہت بڑا کمرہ دیکھا تھا جہاں ٹھیکیدار کا کُتا لالی رہتا ہے...... پلنگ بچھے ہوئے تھے بابا...... نرم نرم بستر پر کُتا اچھل کود کر رہا تھا۔ بابا اگر ہم ٹھیکیدار سے کہیں تو ضرور ایک کمرہ ہمیں دے دے گا۔

(الیاس باتیں بھی کر رہا تھا اور الفو کا سر بھی دبا رہا تھا)۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد الیاس پھر اپنی بات شروع کرتا ہے۔

الیاس: بابا سیڑھیاں گھوم گھوم کر چڑھا تھا۔ اتنا خوبصورت گھر...... کیا بتاؤں بابا...... شیشوں والی کھڑکیاں...... خوبصورت اونچے اونچے دروازے، بابا ایسا گھر بنانے کے لئے کتنے پیسے لگتے ہوں گے۔

الفو: (اُکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے) کروڑوں روپئے، اربوں روپئے۔ دیکھ میرا سر نہیں سنبھالا جا رہا ہے...... مجھے تھوڑا لیٹنے دے۔

الیاس: لو بابا...... اپنا سر میری گودی میں رکھو اور ٹانگیں پسار لو۔ الفو اپنا سر الیاس کی گود میں رکھتا ہے۔ ٹانگیں پسارتا ہے۔ الیاس اُس کے اوپر میلی کچلی چادر آگے لا کر ڈالتا ہے۔ الفو اپنے پاؤں سے اُسے درست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر الیاس اُس کا سر دبانا شروع کرتا ہے۔ بجلی پھر چمکتی ہے۔ ہوا تیز ہو جاتی ہے...... الیاس فکر مند ہو جاتا ہے۔ الفو کے منہ سے ایک بار پھر وہ جملے نکلنے لگتے ہیں۔

الفو: یا اللہ خیر...... یا اللہ خیر۔ ہمارے حال پر رحم کھا۔

الیاس: (کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے) بابا کیا ہم ایسا گھر نہیں بنا سکتے۔

الفو: (الفو آنکھیں کھولتے ہوئے اور ٹکٹکی باندھ کر الیاس کو دیکھتے ہوئے)
نہیں...... تُو دیکھتا نہیں...... دونوں مل کر جو کماتے ہیں۔ تو بس پیٹ ہی بھر پاتے ہیں۔ اتنی گنجائش نہیں نکلتی کہ اوڑھنے کے لئے کوئی کمبل خرید سکیں...... یہ ایک ایک چادر ہے۔ جب یہ جواب دے دے گی تو جانے کتنے دن فاقہ کر کے خرید سکیں گے۔ بیٹا، اگر سر چھپانے کے لئے کوئی جگی جھونپڑی مل جائے تو وہی ہمارے لئے محل ہے......
(تھوڑی دیر چپ ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور پھر اپنی بات جاری رکھتا ہے)
آج تو خدا خیر کرے، طوفان ٹل گیا لگتا ہے۔ مگر کب تک یہ طوفان ہماری خستہ حالی پر رحم کھاتا رہے گا۔ اس لئے کل ہر حال میں کچھ کرنا پڑے گا۔

الیاس: ہاں بابا...... کچھ کرنا پڑے گا۔ آج طوفان کا ڈر...... کل تو پولیس والے بھگانے آگئے تھے...... کبھی میونسپلٹی والے ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ یہاں تو بہت ہی مشکل ہے۔

الفو: اچھا، اب تھوڑا لیٹ جا...... ایک دو گھنٹے میں صبح بھی ہو جائے گی اور کام پر چلنا ہے......
(یہ کہہ کر الفو کروٹ لیتا ہے اور منہ پر چادر تان لیتا ہے۔ الیاس، بھی اپنی چادر اوڑھ کر سو جاتا ہے۔)
پردہ گرتا ہے۔

منظر......۲

دوپہر کا وقت ہے۔ ایک کچی سڑک کے کنارے بہت سارے مزدور ہاتھوں میں ہتھوڑے لئے روڑی کوٹ رہے ہیں۔ الفو اور الیاس بھی برابر ہتھوڑا چلا

رہے ہیں۔ سب مزدوروں کے سامنے کٹی ہوئی روڑی کی اونچی اونچی ڈھیریاں دکھائی دے رہی ہیں۔ ماحول ٹھک ٹھک کی آوازوں سے گونج رہا ہے...... تھوڑی دیر بعد الیاس کے ہاتھوں سے ہتھوڑا چھوٹتا ہے اور وہ ڈھیری پر سر جھکا لیتا ہے۔ یہ دیکھ کر سبھی مزدور اپنا اپنا کام چھوڑ کر اُس کے پاس آجاتے ہیں۔ الفو بھی پریشان حالی میں وہیں آجاتا ہے۔ کوئی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ کوئی آواز دیتا ہے۔ ایک مزدور دھنی رام پورے ہجوم کو پیچھے ہٹنے کے لئے کہتا ہے۔

دھنی رام: پیچھے ہٹو، سبھی پیچھے ہٹو، میں دیکھتا ہوں کیا ماجرا ہے۔

الفو: یا اللہ...... یا اللہ...... میرے بیٹے کو کیا ہوا۔

(دھنی رام الیاس کو ہلاتا ہے...... وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ ایک مزدور پانی کا گلاس لے کر آجاتا ہے۔ الیاس پانی پیتا ہے۔ دھنی رام اُسے پوچھتا ہے۔)

دھنی رام: کیا ہوا تجھے۔

الیاس: کچھ نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔ ایسے ہی نیند کا جھونکا آگیا تھا۔ آج رات سویا نہیں نا اس لئے۔

الفو: ہاں بھائی۔ آج رات پوری آنکھوں میں گزاری ہے۔

دھنی رام: لیکن کیوں؟

الفو: کیا کریں بھائی۔ کھلے آسمان تلے سوتے ہیں۔ رات کچھ طوفان کی رُت بن گئی تھی۔ ڈر گئے۔ سوچا کدھر جائیں گے۔ اوپر سے میری طبیعت بھی بگڑ گئی تھی۔ بس بیٹھے بیٹھے رات گزاری ہے۔ میں تو سخت جان ہوں مگر یہ ابھی کچا ہے نا۔ اس لئے برداشت نہیں کر سکا۔

دھنی رام: تو کیا آپ کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

الفو: بھائی نئے نئے گاؤں سے آئے ہیں۔ ابھی ایسے ہی چوک والے پیڑ تلے جا کر پڑے رہتے ہیں۔

دھنی رام: تو بتانا تھانا بھائی...... یہ آج کل پیڑوں کے نیچے سونے کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ وہی شہر تھا جہاں ہم آدھی آدھی رات تک گھومتے رہتے تھے۔ آج تو شام ہوتے ہی سُنسان ہو جاتا ہے۔ ایسی حماقت خطرے میں ڈال دے گی، سمجھے۔

الفو: اور کیا...... سولہ آنے درست...... کبھی پولیس والے آتے ہیں۔ کبھی میونسپلٹی والے...... مگر کیا کریں...... جب تک کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا بڑی مشکل میں ہیں۔

دھنی رام: کوئی بات نہیں...... میں تمہیں ٹھکانہ دوں گا۔ آج تم میرے ساتھ چلو...... سر چھپانے کا بندوبست ہو جائے گا...... (باقی مزدوروں سے مخاطب ہوتے ہوئے) چلو بھائی، سب اپنا اپنا کام کرو۔

(سب مزدور اپنے اپنے کام کی طرف چلے جاتے ہیں۔ دھنی رام الیاس کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔)

دھنی رام: تو اُدھر ایک طرف جا اور تھوڑا آرام کر لے۔

(باقی مزدوروں سے) اے بھائیو۔ سبھی تھوڑا تیز ہاتھ چلاؤ اس کے حصے کا کام آج ہم کریں گے، منظور ہے......؟

بہت سی آوازیں: ہاں...... کیوں نہیں۔

دھنی رام: دیکھو، ہم ایک دوسرے کا احساس نہیں کریں گے تو کس کو ہماری پڑی ہے۔ ایسا کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

الفو: خدا تمہارا بھلا کرے بھائی۔

دھنی رام: تم چِنتا چھوڑو۔ آج سے رہنے سہنے کی تمہیں کوئی دِقت نہ ہوگی۔ بھائی محل چوبارے تو ہیں نہیں۔ مگر ہم مزدوروں کے لئے ایک کٹیا بھی کسی محل سے کم نہیں ہے۔

(یہ کہہ کر دھنی رام اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔ ہتھوڑا تھام کر روڑی کو ٹنے لگتا ہے۔ الیاس تھوڑی دوری پر لیٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سب مزدور اپنے کام میں جُھٹ جاتے ہیں کہ ٹھیکیدار نظیر کی آمد ہوتی ہے۔ سب مزدور چوکنے ہو جاتے ہیں۔ ٹھیکیدار کی نظر سیدھی الیاس پر پڑتی ہے جو پتھر کا تکیہ لگائے سو رہا ہوتا ہے۔ وہ ایک لمحے میں آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔)

نظیر: وہ دیکھ حرام خور! مزدوری کرنے آیا ہے اور سو رہا ہے گھوڑے بیچ کر۔

دھنی رام: (کھڑا ہو کر) نہیں صاحب، اُسے میں نے وہاں بھیجا ہے۔ دراصل اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم سب نے اُسے آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔ اُس کا کام ہم سب مل کر کریں گے۔

نظیر: سُنو دھنی رام، ڈھیری ناپ کر میں نے تم سے لینی ہے۔ اُس کی طبیعت خراب ہو یا کچھ بھی ہو...... مجھے تو کام چاہیے، کیونکہ میں پیسے دیتا ہوں مفت نہیں کرواتا ہوں۔

دھنی رام: بالکل جناب...... دراصل اُسے غش گیا تھا...... بیچارے رات کو کسی پیڑ کے نیچے پڑے رہے۔ ایک پل بھی نہیں سوئے۔ آج رات موسم بھی بگڑ گیا تھا...... تو طبیعت تو بگڑنی ہی تھی۔

نظیر: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن کل یہ نہیں کہنا کہ آج رات سردی زیادہ تھی آج مچھر نے کاٹ لیا...... یہ سب نہیں چلے گا۔ چلو دھنی رام اُسے اٹھاؤ، میں بھی تو دیکھوں اُسے ہوا کیا ہے۔

دھنی رام: جی حضور......

(کہہ کر الیاس کے پاس چلا جاتا ہے۔ اُسے اٹھاتا ہے۔ وہ نیند کے غلبے سے بڑی مشکل کے ساتھ اٹھ پاتا ہے۔ اُس کی نظر ٹھیکیدار پر پڑتی ہے۔ لرز جاتا ہے...... پھر ہمت جٹا کر قریب آتا ہے۔)

الیاس: السلام علیکم۔

نظیر: ہاں، کیا ہوا تجھے۔

الیاس: بس ایسے ہی حضور......رات کو......

نظیر: (بات کاٹتے ہوئے) رات کو جاگو......سوؤ......کچھ بھی کرو۔ دن کو صرف کام کرتے نظر آؤ......ٹھیک ہے......

الیاس: جی حضور۔

نظیر: تو اس دن میرا مکان دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا نا......ارے ایسے گھر بنانے کے لئے محنت بھی تو خوب کرنی پڑتی ہے نا۔ اگر محنت سے جی چراؤ گے تو پھر پیڑوں تلے ہی سونا پڑے گا نا، ٹھیک ہے۔ آج تمہارے حصے کا کام یہ سب مل کر کریں گے۔ مگر روز روز یہ بھی نہیں کریں گے۔ اس لئے کام سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہے۔ آئندہ یہ دیکھنے کو نہ ملے......جاؤ۔

(الیاس سر جھکائے اپنی ڈھیری کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے اور پتھر کوٹنے لگتا ہے۔)

نظیر: دھنی رام، میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ مگر میں فیتا مار کر ہی جاؤں گا۔ کوئی ڈھیری کم نہیں ہونی چاہیئے۔

دھنی رام: جی حضور......آپ جائیے۔ کوئی شکایت نہیں ملے گی۔ سب ٹھیک ہوگا۔

نظیر: ہاں بھائی، میں تجھ پر اعتبار کچھ زیادہ ہی کر لیتا ہوں۔

دھنی رام: بھگوان نے چاہا تو آپ کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔

نظیر: ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔

(یہ کہہ کر ٹھیکیدار نظیر تیز تیز قدم بڑھاتا نکل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی کے ساتھ سبھی مزدور اپنے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ پھر دھنی رام سب سے کہتا ہے۔)

دھنی رام: چلو بھائی الیاس کے کام کو پورا کرو۔ سب ایک ساتھ اُٹھ کر الیاس کی ڈھیری کی طرف بڑھتے ہیں۔

(پردہ گرتا ہے۔)

سین......۳

(رات کا وقت ہے۔ایک چھوٹے سے کچے کمرے میں الفو لیٹا ہوا اونگھ رہا ہے۔ الیاس اُس کے پاس بیٹھا ہے۔نزدیک ہی کچھ برتن اور ایک سٹوو بھی رکھا ہوا ہے۔ الفو زمین پر بچھے ہوئے بوریئے پر لیٹا ہوا ہے۔الیاس بھی وہیں پاس بیٹھا ہے۔الفو کی سانسیں تیز تیز چل رہی ہیں۔وقفے وقفے سے سخت قسم کی کھانسی بھی آ رہی ہے۔ الیاس کبھی اُس کے سر کی تپش دیکھنے کے لئے اُس کے ماتھے کو چھوتا ہے کبھی اس کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ایک زوردار کھانسی کھانسے کے بعد الفو الیاس کو کہتا ہے۔)

الفو: مجھے بٹھا......

(الیاس اُسے سہارا دے کر بٹھاتا ہے۔)

الفو: تو دھنی رام کو نہیں بلا سکتا۔

الیاس: بابا! وہ تو کوئی بات نہیں۔لیکن آنے جانے میں دو گھنٹے لگ جائیں گے۔آپ اکیلے کیسے رہو گے۔کچھ زیادہ تکلیف ہوگئی تو کیا ہوگا۔

الفو: ارے مجھے کیا بَلا چھوتی ہے۔ایسے ہی دل کرتا ہے۔وہ ہوتا تو کچھ باتیں کرتا۔ آج دو دن ہو گئے ہیں اِدھر آیا بھی نہیں۔

الیاس: بابا! آپ کے لئے پوچھا تھا۔میں نے کہا ذرا افاقہ ہے۔خوش ہو گئے تھے۔یہ دوائیاں بھی لے کر دی تھیں۔اُنہیں بھی دور جانا ہوتا ہے نا۔دن بھی آج کل چھوٹے ہیں۔کل تو اُنہیں لے ہی آوٗں گا۔

الفو: اچھا ٹھیک ہے۔تو میری بات سن...... تجھے شہر کی وہ راتیں یاد ہیں نا جب ہمارے سر پر چھت نہیں تھی۔ کتنی بھیانک تھیں وہ راتیں...... پل پل خطرہ، ڈر...... خدا بھلا کرے دھنی رام کا آج سر پر چھت تو ہے۔اُس نے ہمارے ساتھ بہت اچھا کیا ہے۔اُس کی نیکی کبھی نہ بھولنا۔اُسی کی وجہ سے آج دو سال ہونے آئے ہیں ہم سُکھ چین سے رہ رہے ہیں...... (پھر کھانسی آتی ہے)

الیاس: ہاں بابا میں سن رہا ہوں۔

الفو: تونے اُس سے آج دوائی بھی لی ہے۔نہیں لینی تھی۔اُس کے پاس بھی کیا ہے وہ پیسے کوئی درختوں سے تھوڑا ہی جھاڑتا ہے۔

الیاس: بابا میں سمجھتا ہوں۔میرے لاکھ منع کرنے پر بھی نہیں مانے۔کہنے لگے تیرا باپ ہے تو میرا بھی بھائی ہے۔مجھے دوکاندار کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ بھی کردی...... بولے تو اپنا حق زیادہ کیوں جتاتا ہے۔پھر میں مجبور ہو گیا بابا۔

الفو: اچھا دیکھ...... میری بات غور سے سُن، میں نے اس دنیا کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔غریب تھانا۔اس لئے ہر سختی میں نے سہی ہے، غریب زندگی بھر دنیا سے جنگ کرتا رہتا ہے اور پھر تھک ہار کر اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔تو بھی غریب ہے۔تجھے بھی جنگ لڑنی ہوگی۔خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو اکیلا پڑ جائے گا۔ہاں دھنی رام پر ضرور بھروسہ رکھنا۔وہ جیسا کہے ویسا ہی کرنا میری یہ بات گانٹھ مار کر پلے باندھ لے...... مگر ہر کسی پر بھروسہ نہ کرنا......

(اس وقت الفو کی سانسیں تیز ہو جاتی ہیں۔زور کی کھانسی آتی ہے۔کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔الیاس جان لیتا ہے کہ الفو کی طبیعت زیادہ بگڑتی جارہی ہے۔وہ اُسے سیدھا کر کے لِٹاتا ہے، سر کے نیچے تکیہ رکھتا ہے۔کمبل اوڑھاتا اور پریشانی کے عالم میں سٹپٹاتے ہوئے کہتا ہے)۔

الیاس: بابا! آپ اتنے نِڈھال کیوں ہو گئے ہیں...... آپ کا بخار اُتر کیوں نہیں رہا...... دوائی بھی کھائی ہے...... یا اللہ کیا کروں، کیا کروں...... میرے بابا کو بچالے میرے اللہ...... میرے بابا کو بچالے۔

الفو: ......(سٹپٹاتے ہوئے)...... اُف...... اُف...... گھبراہٹ...... گھبراہٹ مجھے باہر لے چل الیاس...... باہر لے چل۔

(الیاس اُسے تھامتا ہے۔کبھی پاؤں کی مالش کرتا ہے۔کبھی سر دباتا ہے۔کبھی اِس کروٹ کرتا ہے کبھی اُس کروٹ بدلتا ہے)۔

الیاس: حوصلہ رکھو بابا...... آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ بولو تو چائے بنا کر دوں۔

الفو: (آنکھوں کو کھولتے ہوئے)...... کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... کچھ نہیں۔ اللہ...... اللہ...... اللہ...... کہتے کہتے...... ایک طرف لڑھک جاتا ہے اور اُس کی سانسیں تھم جاتی ہیں۔ (الیاس سمجھ جاتا ہے کہ بابا چلا گیا ہے...... وہ سکتے میں آجاتا ہے کچھ دیر بعد وہ ہمت جٹاتا ہے۔ اُٹھتا ہے...... بابا کی آنکھیں بند کرتا ہے۔ اُسے سیدھا کر کے لِٹاتا ہے۔ کمبل اوڑھاتا ہے اور پھر پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد...... دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔)

الیاس: کیوں بابا...... کیوں چھوڑ کر چلے گئے...... اب میں کس سے باتیں کروں گا۔ کون میرے درد بانٹے گا۔ کون مجھے حوصلہ دے گا۔ یہ دیواریں مجھے کھا جائیں گی...... یہ تنہائی مجھے کھا جائے گی۔ میرا بابا چلا گیا...... میرا سب کچھ لٹ گیا......

یہ کہتے کہتے وہ الفو کی لاش پر اپنا سر ٹیک دیتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے۔)

منظر...... ۴

دن کا وقت ہے سڑک کے کنارے مزدور روڑی کوٹنے میں مصروف ہیں۔ دھنی رام بھی اپنے کام میں لگا ہے۔ دوسری طرف الیاس بھی بیٹھا ہتھوڑا چلا رہا ہے۔ الیاس کے چہرے پر آج کچھ عجیب سی بے چینی نظر آرہی ہے۔ وہ کام تو کر رہا ہے مگر اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ اُکھڑا اُکھڑا سا معلوم ہو رہا ہے۔ گپ شپ کا ماحول بھی گرم ہے۔

ایک مزدور: دھنی رام بھائی...... وہ کیا کہتے ہیں ہر موشر کے پر موشر......

دھنی رام: (ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرے ہوئے) کیا بتاؤں بھائی پہلی بار یہ لفظ سنا ہے۔ سب مزدور کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔

وہی مزدور: بھائی وہ جو ملازم لوگوں کو ترقی نہیں ملتی......اُسے کیا کہتے ہیں؟

دھنی رام: ہاں ہاں......اب سمجھ گیا......پرموشن۔

وہی مزدور: ہاں پرموشن...... بھائی میں سوچتا ہوں کہ یہ مزدور کے لئے کیوں نہیں ہے۔ مزدور جتنی چاہے محنت کرلے، مشقت کرلے لیکن مزدور ہی رہتا ہے۔

ایک اور مزدور: تو کیا ٹھیکیدار بننا چاہتا ہے مگر تیری جگہ لکھت پڑھت کون کرے گا۔ حاضری کون لگائے گا......سب ہنستے ہیں۔

دھنی رام: ارے مزدور کی پرموشن ہوتی ہے نا۔ جب ہاتھ پاؤں جواب دے دیتے ہیں تو گھر جاکر آرام سے پڑا رہتا ہے۔ پھر نہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔

مزدور: اناج بھی ہوگا تو دشمن بنیں گے نا......ارے کُتے کو کوئی پنی ضرور ڈالتا ہے مگر بے کار مزدور کو فاقے دیکھ دیکھ کر مرنا پڑتا ہے۔ ہاں کچھ ملتا ہے تو بس طعنے......سننے کے لئے پل پل طعنے۔ یہ سوچ کر دل کانپ اٹھتا ہے بھائی۔

دھنی رام: یہی دعا کرو۔ بھگوان چلتے پھرتے اٹھالے نہیں تو وہ امتحان بڑا سخت ہوتا ہے۔ اب دیکھو الف دین کو۔ تھوڑی سی بیماری دیکھی خدا کو پیارا ہوگیا۔ اگر بیماری طول کھینچ لیتی تو کیا کرتا...... حالانکہ الیاس نے اُس کی دیکھ ریکھ کی...... مگر بھائی اُس نے زیادہ موقع ہی نہیں دیا۔ ورنہ شاید یہ بھی......بس یہی دعا کرو بھگوان کسی کا محتاج نہ کرے۔

الیاس: چچا اس نے موقع ہی نہیں دیا...... ورنہ میری دنیا تو خراب تھی ہی...... قیامت کی اُمید بھی چلی جاتی۔

دھنی رام: ارے بڑے بڑے دنیا دار، لاکھوں کروڑوں کے مالک بھی ہاتھ اوپر کر لیتے ہیں۔ مزدور کی اوقات ہی کیا ہے۔

ایک مزدور: چلو بھائی۔ لمبی کیا سوچنی......جو پل گزرتا ہے اُسے گزارو۔

دھنی رام: اچھا چلو چھوڑو...... ٹھیکیدار صاحب آگئے۔

(سب مزدور اُدھر دیکھتے ہیں۔ ٹھیکیدار نظیر اور اُس کے ساتھ ایک اور آدمی ہلکے ہلکے قدم بھرتے اُن کی طرف آرہے ہیں۔ بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ٹھیکیدار اور اُس کا ساتھی قریب آجاتے ہیں۔ ٹھیکیدار دھنی رام سے مخاطب ہوتا ہے۔)

نظیر: کیوں دھنی رام! کام ٹھیک چل رہا ہے۔

دھنی رام: صاحب جو بھی ہے آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔

نظیر: بھائی وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن تم سے پوچھ کر تسلی ہو جاتی ہے۔ تم پر میں بہت بھروسہ کرنے لگا ہوں۔

دھنی رام: حضور مزدور کے پاس بھروسے کے لئے ہے ہی کیا۔ یہی ہاتھ ہیں جب تک چلیں گے، چلاتے رہیں گے۔ جب جواب دے گئے تو نہ گلہ نہ شکوہ۔

نظیر: بہت اچھا۔ (دوست کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ دھنی رام ہے۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ (پھر دھنی رام سے مخاطب ہوتا ہے)

بھائی یہ رندھیر ہیں، میرے دوست۔ یہ بھی ٹھیکیدار ہیں۔ اس سڑک کا اگلا کام یہی کروائیں گے۔ یہ کہہ کر نظیر، رندھیر سے کچھ کانا پھوسی کرتا ہے دونوں کی نظریں الیاس کی طرف جاتی ہیں۔ پھر نظیر الیاس کو بلاتا ہے۔

نظیر: الیاس۔ تم ذرا اِدھر آؤ۔

(الیاس اٹھتا ہے اور ٹھیکیدار کی طرف جاتا ہے۔ سب مزدور کچھ شش و پنج میں مبتلا اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔ نظیر اور رندھیر الیاس سے کچھ باتیں کرتے ہوئے الیاس کو کچھ قدم کے فاصلے پر لے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر یہ سلسلہ رہتا ہے اُس کے بعد رندھیر اور نظیر چلے جاتے ہیں اور الیاس واپس مزدوروں کے درمیان آجاتا ہے۔)

مزدور: ٹھیکیدار صاحب اور الیاس کی آج کوئی خاص بات تھی۔

دوسرا مزدور: کہیں پرموشن تو نہیں دینے والے الیاس کو ایک بار پھر ہنسی اُبھرتی ہے۔

(دھنی رام کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوتا ہے، کہتا ہے۔)

دھنی رام: ہم یہ عقل کے گھوڑے تب دوڑائیں جب الیاس یہاں نہ ہو۔ وہ خود بتائے گا نا کیا ماجرا ہے۔

الیاس: (کچھ سوچتے ہوئے) چچا دراصل ٹھیکیدار صاحب نے گھر بلایا ہے۔

دھنی رام: اچھی بات ہے۔ بلایا ہے تو کچھ کام بھی بتایا ہوگا۔

الیاس: کام تو نہیں بتایا۔ پھر بھی کہتے تھے کہ ایک کام ہے۔ تم آجانا۔

دھنی رام: پوچھنا تھا نا کیا کام ہے۔

الیاس: اب انہوں نے بتایا نہیں تو کیسے پوچھتا۔

ایک مزدور: بھائی چھٹی کرو...... او دھنی رام بھائی ہوگا بھگار...... کچھ کروائیں گے بے چارے سے اور کوئی دعوت پر تو نہیں بلایا ہوگا۔ ہمیں اپنے مقدروں کا پتہ ہے۔ اچھا چلو، چھٹی کرو۔

تب مزدور اٹھتے ہیں ہاتھ جھاڑتے ہیں۔

پردہ گرتا ہے۔

منظر......۵

رات کا وقت ہے۔ ایک خوبصورت سجے دھجے کمرے میں ٹھیکیدار نظیر اور ٹھیکیدار رندھیر بیٹھے ہوئے ہیں۔ رندھیر کے فون کی گھنٹی بجتی ہے وہ جیب سے فون نکالتا ہے اور کسی سے بات کرنے لگتا۔

رندھیر: ہیلو...... نمستے جی...... ہاں مجھے آنے میں ابھی کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ سکتا ہے...... (پھر دوسری طرف سے آنے والی آواز سنتا ہے)۔ سنو ابھی تک وہ آدمی آیا نہیں۔ بس آتا ہی ہوگا...... آپ اطمینان رکھیں...... جی...... جی...... ہاں ہاں ...... اس کا انتظار کر رہا ہوں......

ok......(فون بند کر کے جیب میں ڈالتا ہے)

نظیر: کس کا فون تھا؟

رندھیر: وہی سکینہ......ہاتھ پاؤں میں مرچی لگی ہوئی ہے۔

نظیر: ایک کام کرو۔ اُسے ادھر ہی بلالو۔

رندھیر: یہاں آکر کیا کرے گی۔

نظیر: بھائی اُس لڑکے کو ایک خواب اور دکھائیں گے......اُس کے دماغ میں دولت کا نشہ تو چڑھا ہی ہوا ہے اور اگر دل میں حسن کے پھول بھی کھل جائیں تو وہ ساری دنیا کو بھول جائے گا۔

رندھیر: تمہارے دماغ کا جواب نہیں۔

نظیر: پرندہ جال کے قریب تبھی آتا ہے جب پُرکشش دانے بکھرے ہوں۔ کرو اُسے فون۔

رندھیر: (کھکھلا کر ہنستے ہوئے)۔ (فون لگاتا ہے)......تھوڑی دیر بعد......ہیلو...... اچھا سنو۔ آپ ادھر ہی آجاؤ......(دوسری طرف کی آواز سنتا ہے)......آپ آجاؤ نا، بہت ضروری ہے......سب باتیں یہیں ہوگی آپ آؤ۔ Very Good ہم انتظار کر رہے ہیں......(فون بند کر کے پھر جیب میں ڈالتا ہے)۔ لو وہ آرہی ہے۔

نظیر: Very Nice......بھائی سب دماغ کا کھیل ہے۔ اسے استعمال کرنا آنا چاہئیے۔

اسی لمحے الیاس جھجکتا ہوا اندر داخل ہوتا۔

الیاس: السلام علیکم۔ (کہہ کر سہما سہما کھڑا ہو جاتا ہے)۔

نظیر: مسکراتے ہوئے......آؤ بھائی......ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے......(اشارہ کرتے ہوئے)......ادھر صوفے پر بیٹھو۔

الیاس: جی میں کھڑا کھڑا ہی ٹھیک ہوں۔ آپ کے سامنے صوفے پر کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔

نظیر: ارے یار! میں بول رہا ہوں نا۔ بیٹھو ادھر...... چلو بیٹھو......

الیاس ڈرتے ڈرتے صوفے پر بیٹھتا ہے

نظیر: ارے پیچھے ہو کر آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھو۔ (پھر رندھیر سے مخاطب ہوتے ہوئے)...... رندھیر جی ...... یہ الیاس ہے...... یہ غریبوں کی بے لطف زندگی سے نکل کر عزت اور شان سے جینا چاہتا ہے۔ اس لئے آج میں اسے آپ سے ملوا رہا ہوں۔ امید ہے آپ اس کے خوابوں کو پورا کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔

رندھیر: بالکل جناب...... یہ بہت جلد بڑا آدمی بن جائے گا۔ لیکن اس کے لئے اسے ایک کام کرنا ہوگا...... اور دوسری بات یہ کہ اس بات کا پتہ کسی کو نہ چلے...... کیونکہ راتوں رات بڑا آدمی بننے کے کچھ اپنے اصول ہوتے ہیں۔ یہ راز داری کا کام ہے...... کامیاب ہو جائے گا تو دنیا کی ہر خوشی اس کے پاؤں چومے گی۔ مگر اس کے بارے میں پردہ ہی رکھے گا تو کامیاب ہوگا۔

نظیر: الیاس اس کی بھنک بھی کسی کو نہ لگنی چاہئیے۔

الیاس: جناب میرا کون ہے جسے میں بتاؤں گا۔ بابا تھا چل بسا۔ اب ایک چچا دھنی رام ہے اگر آپ کہیں تو اُسے بھی کچھ پتہ نہ دوں گا۔

رندھیر: دھنی رام...... ونی رام کو چھوڑ۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ وہ چاہے گا کہ تو بڑا آدمی بن جائے اور وہ مزدور رہے۔ جب تک تیری مراد پوری نہیں ہوتی اپنے آپ سے بھی کچھ نہ بولنا۔ (اس وقت سکینہ۔ ایک خوبصورت نوعمر لڑکی، جین کی پینٹ، شرٹ اور کھلے ہوئے خوبصورت بال، دراز قد...... خوبصورتی کا ایک پیکر...... اندر داخل ہوتی ہے...... مسکراتے ہوئے...... سلام کرتی ہے۔)

رندھیر: لو جی! سکینہ جی بھی آ گئیں۔

نظیر: تشریف رکھیئے۔ (سکینہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)۔ نظیر اپنی بات جاری رکھتا ہے۔ سکینہ یہ الیاس ہے۔ بہت جلد یہ بہت بڑا آدمی بننے والا ہے...... شکل سے بہت پُر کشش ہے مگر اس کی شکل کو غریبی کی دیمک چاٹ رہی ہے۔ لیکن ہم اس دیمک سے اسے آزاد کر دیں گے اور پھر ہم اسے آپ کے پلے باندھ دیں گے...... مطلب...... اگر آپ چاہیں گی تو اس سے شادی کروائیں گے آپ کی...... دیکھ لو ٹھیک ڈھنگ سے......

سکینہ: ایک نظر الیاس پر ڈالتے ہوئے مسکراتی ہے۔ چلو اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں بھی تیار ہوں۔

(الیاس یہ سب سن کر شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ اُس کی نظریں زمین میں گڑھ جاتی ہیں۔ رندھیر بھانپ لیتا ہے اور وہ اب موضوع بدلتا ہے۔)

رندھیر: اچھا الیاس، بات یہ ہے کہ کہ تجھے یہاں سے ائرپورٹ...... کیا بولتے ہیں اسے...... ہوائی اڑہ...... جہاں جہاز آتے جاتے ہیں...... جانا ہوگا۔ جانتا ہے نا وہ کہاں ہے......؟

الیاس: جی جناب! ایک دو بار گیا ہوں۔

رندھیر: کوئی بات نہیں۔ اگر نہیں بھی گیا ہے تب بھی تجھے ہمارے آدمی وہاں چھوڑ آئیں گے۔ وہاں ایک آدمی تیرے پاس آئے گا، وہ تجھے ایک بیگ دے گا۔ بس وہ بیگ لے کر تجھے ہم تک پہنچنا ہوگا۔

الیاس: ارے صاحب بس اتنا سا کام۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ کوئی بڑا کام ہوگا۔

رندھیر: سن یہ کام آسان تو ہے۔ مگر اس میں ایک مشکل بھی ہے۔ وہ بیگ کسی بھی طرح پولیس والے نہ دیکھیں...... کیونکہ وہاں سے آتے پولیس چیک کر سکتی ہے اس لئے تو وہ بیگ کسی کو نہ دکھانا گا۔

الیاس: کچھ سوچتے ہوئے ہاں......اگر پولیس نے چیک کرنے کے لئے کہا تو......

رندھیر: یہی تیرا امتحان ہے۔تو کیسے کر سکتا ہے......تو جان......سیدھی بات ہے بیگ لے کر بھاگ جانا......مگر اُن کے ہاتھ نہ آنا۔

نظیر: کیوں کہ اُسی بیگ میں تیری قسمت کی چابی ہے۔وہ بیگ ہمیں ملے گا۔تیری قسمت کا تالا کھول دیں گے۔تو بڑا آدمی بن جائے گا۔تیری خواہش پوری ہو جائیں گی اور یہ میڈم تجھ سے شادی بھی کرے گی۔

سکینہ: مسکراتے ہوئے......جی بالکل

نظیر: رندھیر کو ساتھ لیتے ہوئے......اچھا میڈم تم اسے تیار کرو۔ہم ایک کام سے باہر جاتے ہیں۔جلدی تیار کرنا اسے۔

سکینہ: جی ٹھیک ہے۔

(نظیر اور رندھیر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔سکینہ اور الیاس کمرے میں ہوتے ہیں۔سکینہ اُس کے پاس جاتی ہے۔)

سکینہ: اٹھو میرے راجا۔میرے خوابوں کے شہزادے۔

الیاس: ڈرتے ہوئے......جی......جی آپ۔

سکینہ: مسکراتے ہوئے میں تمہیں اچھے کپڑے پہنا کر دیکھنا چاہتی ہوں۔پہلے جاؤں اندر۔نہا کر آؤ۔

(سکینہ الیاس کو باتھ روم میں بھیج دیتی ہے اور خود الماری سے اُس کے لئے کپڑے نکالنے لگتی ہے۔کالی پینٹ، سفید قمیض، ٹائی ایک ٹوپی...... جوتے وغیرہ نکال کر خود صوفے پر بیٹھ کر اُس کے باہر آنے کا انتظار کرتی ہے۔تھوڑی دیر میں الیاس باہر آجاتا ہے۔سکینہ مسکرا کر اُس کے قریب جاتی ہے اور اُسے چھوتے ہوئے کہتی ہے۔)

سکینہ: کتنے خوبصورت ہو تم......تم مٹی میں پڑے ہوئے لعل ہو۔میں تمہیں سنوار کر چمکیلا بنا دوں گی۔لو کپڑے پہنو

(سکینہ اُس کی قمیض کے بٹن کھولنے لگتی ہے۔ الیاس سہم جاتا ہے۔ مگر وہ اُسے پیار بھرے انداز میں کہتی ہے۔)

سکینہ: ڈرنے یا شرمانے کی کیا بات ہے۔ ہم دونوں ایک ہونے والے ہیں۔ لو پہنو یہ قمیض۔

(باری باری وہ اُسے کپڑے پہناتی ہے۔ کپڑے پہنا کر اُسے صوفے پر بٹھاتی ہے اور مسکراتے ہوئے کہتی ہے۔)

سکینہ: چشمِ بد دور۔

(اس لمحے نظیر اور رندھیر بھی اندر آجاتے ہیں۔ سکینہ الیاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں پوچھتی ہے۔)

سکینہ: کیسا لگ رہا ہے میرا چاند۔

رندھیر: واہ بھائی جواب نہیں۔ چودہویں کا چاند۔

اچھا الیاس، اب تم نیچے جاؤ۔ گاڑی (لگی ہے اُس میں بیٹھ جاؤ وہ لوگ تمہیں ائرپورٹ چھوڑ کر واپس آجائیں گے۔ اگلا کام ہوشیاری سے کرنا۔ Good Luck۔ الیاس اٹھ کر باہر نکل جاتا ہے۔ رندھیر، نظیر اور سکینہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے۔)

منظر......٦

ٹھیکیدار نظیر اپنے کمرے میں بیٹھا ہے۔ وہ بار بار دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ بارہ بج چکے ہیں۔ اُس کے چہرے پر پریشانی صاف صاف نظر آ رہی ہے۔ وہ اٹھتا ہے الماری سے وسکی کی بوتل نکال کر ٹیبل پر پڑے گلاس میں انڈیلتا ہے اور گھٹ گھٹ کر کے پی جاتا ہے۔ اسی اثناء میں رندھیر ہانپتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ نظیر اُس کو دیکھ کر بھانپ جاتا ہے کہ کوئی پریشانی ضرور ہے۔ وہ

فوراً رندھیر سے سوال کرتا ہے۔

نظیر: کیا ہوا؟ کیا الیاس پکڑا گیا۔

رندھیر: پکڑا تو نہیں گیا، ہوسکتا ہے مارا گیا ہو یا پھر زندہ بچ نکل آیا ہو۔

نظیر: (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مارا گیا تو بھی بہتر، زندہ نکل آیا ہو تو اور بھی بہتر۔

رندھیر: مگر بھاگتے ہوئے کمبخت اپنا شناختی کارڈ تو چھوڑ آیا ہے نا جو پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اگر مر گیا تو بھی مشکل ہے اور اگر زندہ ہے تو اور بھی مشکل ہے۔ سمجھ لو پولیس دو چار دن میں ہم تک پہنچ جائے گی۔

نظیر: (تلملاہٹ میں) کوئی بات نہیں بس وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیئے باقی دونوں صورتوں میں...... میں دیکھ لوں گا۔

رندھیر: تمہارا مطلب کیا ہے۔

نظیر: تم اپنے آدمیوں کو الرٹ کر دو۔ اگر پولیس اُسے پکڑ چکی ہے تو اسے مارنے کی کوشش کریں...... باقی میں دیکھ لوں گا۔ جاؤ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو...... سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔

رندھیر: ٹھیک ہے۔

(یہ کہہ کر رندھیر تیز تیز قدم بھرتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ نظیر کچھ دیر کھڑا کھڑا سوچتا رہتا ہے۔ پھر وسکی کا ایک پیگ بنا کر انڈیلتا ہے اور صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ کافی دیر سوچتا رہتا ہے۔ اچانک دروازے پر ہلچل ہوتی ہے۔ وہ اٹھتا ہے دروازے کی طرف بڑھنے ہی لگتا ہے کہ الیاس اندر داخل ہوتا ہے۔)

نظیر: الیاس......

الیاس: ہاں میں الیاس...... آ گیا ہوں...... یہ لو صاحب اپنا مال۔ بڑی مشکل سے یہاں تک لایا ہوں...... موت کو چکمہ دے کر آیا ہوں مجھے نہیں معلوم تھا یہ کام اتنا مشکل ہے۔

نظیر: بیگ کو الماری میں رکھتے ہوئے شاباش......تم پولیس سے کیسے بچ نکلے۔

الیاس: بس زندگی تھی...... پولیس نے بہت گولیاں چلائیں۔ لگی کوئی نہیں۔ ایک جگہ اندھیرا دیکھ کر گٹر میں کود گیا۔ دو گھنٹے وہیں بیٹھا رہا۔ چھپر چھپر گندہ پانی نیچے سے بہتا رہا۔ ہاتھ پاؤں سن ہو گئے۔ پھر نکلا دیکھا سڑک سنسان ہے...... اِدھر اُدھر چھپ چھپاتے یہاں تک آ گیا ہوں......

نظیر: بغیر کوئی جواب دیئے رندھیر کو فون لگاتا ہے۔

ہیلو...... چلے آؤ...... جلدی......

(اور پھر فون جیب میں ڈال دیتا ہے۔ پھر الیاس سے مخاطب ہوتا ہے۔)

نظیر: بیٹھ جاؤ......صوفے پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تمہارا کام ختم ہوا۔ تم اپنے امتحان میں پاس ہو گئے ہو......مبارک ہو۔

(الیاس بیٹھ جاتا ہے۔ درد کی کراہت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے)۔

الیاس: سارا جسم درد کر رہا ہے۔ بہت تھک گیا ہوں۔

نظیر: کوئی بات نہیں۔ اس کا علاج ہے۔

وہ اٹھتا ہے......وسکی کا پیگ بنا کر الیاس کو دیتا ہے۔

نظیر: یہ لو......پی لو...... یہ دوائی درد کے لئے بڑی بہتر ہے......

(الیاس گلاس اٹھا کر حلق کے اندر ڈال دیتا ہے اور پھر منہ بسورتے ہوئے کہتا ہے۔)

الیاس: بڑی کڑوی دوائی ہے۔

نظیر: ہاں کڑوی ضرور ہے مگر اثر بہت اچھا ہے۔

(الیاس تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ اب وہ سکون محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ ٹھکیدار سے کہتا ہے)

الیاس: تھوڑی سی اور دے دو بڑی اچھی دوائی ہے۔ مزہ آ گیا...... ٹھیکیدار ایک پیگ اور بنا کر اُسے دیتا ہے...... الیاس پورا پی جاتا ہے۔ اب وہ پوری طرح نشے میں مست ہو جاتا ہے اور کھل کر ٹھیکیدار سے باتیں کرنے لگتا ہے۔

الیاس: ٹھیکیدار صاحب...... تم بڑے پیارے آدمی ہو۔ میں نے تمہارا کام کر دیا ہے۔ اب تم میرا کام کرو...... اب بنا دو مجھے بڑا آدمی۔ وہ گھر دکھا دو...... اونچے دروازوں والا...... آج اگر بابا زندہ ہوتا تو دیکھ کر کتنا خوش ہوتا...... چلو...... میرا چچا دھنی رام ہے۔ اُسے تو ساتھ ہی رکھوں گا۔

(اسی لمحے رندھیر اندر داخل ہوتا ہے...... الیاس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر نظیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔)

رندھیر: لگتا ہے تقدیر مہربان ہے۔ مگر اس کی مہربانی کا بہت جلدی فائدہ اٹھا لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بدلنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔

نظیر: رندھیر تقدیر اب مٹھی میں بند ہے۔ اب تم دیکھتے جاؤ۔ ٹھیکیداری کیسے کرتا ہوں...... اینٹ بھی کھڑی رکھنی ہوتی ہے اور پکی بھی رکھنی ہوتی ہے۔ اس میں بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن چلو پہلے ہم الیاس کو اُس کا گھر دکھا دیں۔

رندھیر: ہاں بالکل میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ (تینوں اُٹھ کر نکل جاتے ہیں)

منظر......۷

قریب آدھی رات کا وقت ہے۔ شہر سے کچھ دوری پر شاہراہ کے کنارے کچھ نئی تعمیر شدہ عمارتیں کھڑی ہیں۔ شاہراہ سے اندر جاتی ہوئی ایک کچی سڑک پر نظیر، رندھیر اور الیاس کھڑے ہیں۔ نظیر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے الیاس سے کہتا ہے۔

نظیر: الیاس وہ رہا تیرا گھر۔ تو یہ سیڑھیاں چڑھ کر قریب سے اُسے دیکھ آ...... اگر اچھا لگتا ہے تو ٹھیک نہیں تو کوئی اور دکھاؤں گا۔ تیری منزل تیرا انتظار کر رہی ہے۔

الیاس: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) واہ کیا خوبصورت گھر ہے...... اتنا بڑا کاش میرا بابا زندہ ہوتا...... لیکن چچا دھنی رام کو تو میں ساتھ ہی رکھوں گا۔ اس کے لئے انتظار نہ کرنا۔ اُس نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اب میرا فرض بنتا ہے اُس کا خیال رکھوں۔ اُسے ایک اچھے سے کمرے میں رکھوں گا۔ وہ بھی کچھ دن آرام سے جی لے گا۔

نظیر: الیاس جاؤ...... سیڑھیاں چڑھو۔

الیاس خوشی سے باولا جلدی جلدی دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔ کچھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلتی ہے۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہیں۔ پیٹھ کے بل گرتا ہے۔ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آپڑتا ہے۔ کچھ دیر تڑپتا رہتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ نظیر اور رندھیر اُس کے قریب آتے ہیں۔ نظیر پستول جیب میں ڈالتے ہوئے رندھیر سے کہتا ہے......

نظیر: چلو...... یہ اپنی منزل کو پہنچ چکا ہے۔

(پردہ گرتا ہے۔)

............☆☆☆............

☆......راجہ یوسف

پرایا آنگن

کردار:۔

ا۔ رشید احمد	......	شادی شدہ نوجوان
۲۔ تاجہ	......	بوڑھی عورت (رشید احمد کی ماں)
۳۔ رانی	......	رشید احمد کی بیوی
۴۔ سارہ	......	رشید احمد کی بہن
۵۔ کنج	......	تاجہ کی ہم عمر
۶۔ قادر	......	پڑوسی
۷۔ کاکہ	......	بزرگ آدمی
۸۔ڈاکیہ		
۹ سے ۱۳		گاؤں والے

منظر......ایک

......شہر کا منظر......

(ایک چھوٹا سا لیکن خوبصورت گھر۔ گھر کا سجا ڈرائنگ روم......ایک نوجوان رشید احمد ٹی وی دیکھ رہا ہے۔ اس کی بیوی رانی چائے کی ٹری لے کر اندر آجاتی ہے۔ وہ چائے سامنے رکھی چھوٹی میز پر رکھ دیتی ہے۔ تھوڑی دیر شوہر کی طرف دیکھتی ہے جو ٹی وی دیکھنے میں مست ہے)۔

رانی:۔ ''بس آپ دن رات ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں۔''

(رانی غصے سے بولتی ہے۔لیکن رشید احمد اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا ہے۔)

''سن نہیں رہے ہیں آپ۔؟''

رشید احمد:۔ ''کیوں چلا رہی ہو۔دیکھ تو رہی ہو......میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔''

رانی:۔ ''ہاں ہاں! دیکھ رہی ہوں......چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔پی لو''

رشید احمد:۔ ''پی لوں گا۔پی لوں گا۔تم خواہ مخواہ ناک بھوں کیوں چڑھا رہی ہو۔؟دیکھو غصے نے تیرے چہرے پر جھریوں کا جال بُنا ہے''

رانی:۔ (چہرے پر ہاتھ پھرتے ہوئے) ''کیا کہہ رہے ہو۔میرے چہرے پر جھریاں۔؟''

رشید احمد:۔ ''اور نہیں تو کیا۔زیادہ غصہ کرو گی تو بہت جلد بوڑھی ہو جاؤ گی......سمجھی''

(رشید نے شرارت بھری مسکراہٹ سے کہا)

رانی:۔ ''رشید!اب بس بھی کرو۔ہنہ''(رانی نے غصے سے ناک بھوں چڑھا کر کہا)

''کام کا نہ کاج کا......(اپنے ساتھ ہی بڑبڑاتی ہے۔لیکن چہرے پر ابھی بھی غصہ ہے)

رشید احمد:۔ (چائے اٹھاتے)''پھر غصہ۔ارے بابا بلڈ پریشر ہو جائے گا۔سر درد ہو جائے گا۔جان کا خطرہ ہے،جان کا......کیوں اپنی دشمن بنتی جا رہی ہو۔''

رانی:۔ ''دیکھو رشید،مجھے غصہ نہ دلاؤ......نہیں تو......؟''

رشید احمد:۔ (بیوی کی بات کاٹتے ہوئے)''کیا ابھی تک تم پیار دکھا رہی تھی۔؟کیا کہنے تیرے پیار کے واہ واہ۔مائی ڈیئر رانی،اتنے برسوں سے ہم ساتھ رہ رہے ہیں۔لیکن میں آج تک تیرے غصے اور پیار میں فرق نہ سمجھ سکا۔'' (رشید احمد نے مسکراتے ہوئے کہا)

رانی:۔ (نرمی سے بات کرتے ہوئے) ''رشید اب صرف اپنی ہی کہو گے یا میری بھی کچھ سنو گے''

رشید احمد:۔ (پیار سے) ''بولو جانِ من......بس ایسے ہی پیار سے بولا کرونا۔ پھر دیکھنا میں تیری کیا کیا نہیں سنتا۔ ویسے بھی میں برسوں سے تمہاری ہی سنتا آرہا ہوں۔ آج ایک بار اور سہی۔''

رانی:۔ ''میری بہن آرہی ہے۔ وہ دوبئی سے سیدھے یہیں آرہے ہیں۔''

رشید احمد:۔ ''اوہ گڈ......ڈالی آرہی ہے۔'' (چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ)

رانی:۔ ''اس کا شوہر آصف بھی ساتھ آرہا ہے۔''

رشید احمد:۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے'' (رانی اسے غصے سے دیکھتی ہے) ''اوہ......میرا مطلب ہے وہ بچے بھی ساتھ لاتی تو زیادہ مزا آتا......آتا نا......'' (چہرے پر خجل سی مسکراہٹ)

رانی:۔ ''لارہی ہے نا......'' (طنز سے) ''تم فکر نہ کرو۔ وہ پوری فیملی ساتھ لارہی ہے۔''

رشید احمد:۔ ''مر گئے......مے میرا مطلب ہے......گڈ، ویری گڈ'' (آہستہ لیکن مذاق میں) ''ہم لوگ کہیں شفٹ کررہے ہیں کیا......؟؟؟'' (مسکراتے ہوئے)

رانی:۔ ''ہم لوگ نہیں......صرف ماں''

رشید احمد:۔ ''مااااں......؟؟؟'' (رشید احمد کی ہنسی میں بریک لگ جاتی ہے اور وہ حیرانگی کے ساتھ اپنی بیوی کو دیکھتا ہے)

رانی:۔ ''ہاں......ماں کا کمرہ ڈالی کو دیں گے۔''

رشید احمد:۔ ''اور مااااں......؟ ماں کہاں رہے گی۔'' (رشید احمد حیران و پریشان)

رانی:۔ ''ماں کچھ مہینوں کے لئے سارہ کے پاس جائے گی''

رشید احمد:۔ ''سارہ؟ مطلب بھابی کے پاس......لیکن کن......؟''

رانی:۔ ''لیکن ویکن کچھ نہیں'' (رانی رشید احمد کے قریب جاتی ہے۔اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیتی ہے) ''آپ میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔''

رشید احمد:۔ (تشویش کے ساتھ) ''لیکن اگر ماں نہیں مانی......تو؟''

رانی:۔ (رشید احمد کے کندھے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے ذرا سا تیز لہجے میں) ''کیوں نہیں مانے گی۔ اگر میں کہوں گی تو اس کو برا لگے گا۔ ویسے بھی اس کو میری ہر بات بری ہی لگتی ہے۔ میرے ساتھ تو وہ بات بھی نہیں کرتی۔''

رشید احمد:۔ ''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، تم روز روز جھگڑا کیوں کرتی ہو۔؟''

رانی:۔ ''جھگڑا میں کرتی ہوں؟ تم نہیں جانتے ہو ماں مجھے کتنا پریشان کرتی ہے۔ بات بات پر جھگڑتی ہے''۔

رشید احمد:۔ ''رانی......میری رانی......تم بھی تو چپ نہیں رہتی ہو۔''

رانی:۔ ''اب کیا مجھے ہی چپ کراؤ گے۔؟ پھر یہاں میری کیا حیثیت رہے گی۔''

رشید احمد:۔ ''رانی......وہ میری ماں ہے۔'' (رشید احمد بے بسی سے بولتا ہے)

رانی:۔ ''جانتی ہوں......جانتی ہوں وہ تمہاری ماں ہے۔ میری ماں تو نہیں ہے وہ۔ پھر میں اسے کیوں ڈروں''

رشید احمد:۔ ''بات ڈرنے کی نہیں ہے رانی۔'' (سمجھاتے ہوئے) ''آخر بڑے بزرگوں کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے......''

رانی:۔ (رشید احمد کی بات کاٹتے ہوئے) ''بس جی رہنے دو اب یہ لکچر بازی......تم پھر بات کا بتنگڑ بناتے ہو۔

اگر تم میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے تو رہنے دو۔ میں ڈالی کو فون کر کے بتا دوں گی کہ اگر تم کو کشمیر آنا ہی ہے تو ہمارے گھر مت آنا۔ کیوں کہ تمہارے جی جاجی کو تمہارا یہاں آنا اچھا نہیں لگتا ہے۔''

رشید احمد:۔ (غصے سے) ''اب وہاں بھی مجھے ہی ذلیل کرو گی؟''

رانی:۔ ''تو میں کیا کروں۔ تم میری بات مانتے ہی نہیں ہو۔ دیکھو، اگر تم ماں کو سمجھا دو گے تو وہ سمجھ جائے گی۔

آخر تم ماں سے اتنا ڈرتے کیوں ہو۔؟'' (رشید احمد اسے گھورتا ہے) ''دیکھو رشید، ماں کا حق صرف ہم پر ہی تو نہیں ہے۔ آخر سارہ بھی تو اس کی بیٹی ہے۔ کچھ دن اس کے پاس رہے گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔''

رشید احمد:۔ ''اب یہ بات میں ماں کو کیسے کہوں۔؟'' (رشید احمد پریشان ہو جاتا ہے)

رانی:۔ ''تم رہنے ہی دو ۔میں خود ہی بات کر کے دیکھتی ہوں۔''

رشید احمد:۔ ''اچھا جو تمہاری سمجھ میں آجائے کرو۔ مجھے ویسے بھی آفس دیر ہو رہی ہے۔ لیکن...... ماں ہے کہاں''

رانی:۔ ''منے کے کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ تو ایک کام میں پورا پورا دن لگا دیتی ہے۔ ابھی اتنا کام پڑا ہے اور مجھے بھی آفس دیر ہو رہی ہے......''

(رانی کچھ سوچتی ہے۔)

''ہاں رشید...... پلیز تم ایک کام کرو۔ میرے آفس میں میری لیو (Leave) ڈال دینا...... آج میں ماں سے بات کروں گی۔''

رشید احمد:۔ (رشید احمد پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ چہرے پر ہاتھ پھیر لیتا ہے۔ پھر اچانک کھڑا ہو جاتا ہے)

''اچھا میں آفس جانے کے لئے تیار ہو کے آتا ہوں۔'' (وہ جلدی میں کمرے سے نکل جاتا ہے)

منظر......دو

(ایک بزرگ خاتون تاجہ (رشید احمد کی ماں) کپڑے دھو رہی ہے۔ اس کے سامنے کپڑوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ چہرے سے لگ رہا ہے کہ وہ بہت تھک چکی ہے۔ رانی (اس کی بہو) اور کپڑے لے کر آجاتی ہے۔)

رانی:۔ ''اوہ ہووو...... کتنا وقت لیتی ہو تم۔ یہ چند کپڑے ہی تو دھونے تھے۔'' (مزید کپڑے سامنے رکھتے ہوئے)

تاجہ:۔ ''بس بہو۔ ہو گیا'' ماتھے سے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے۔

رانی:۔ ''تم تو ایک کام کے لئے پورا دن صرف کر لیتی ہو۔ ابھی برتن مانجھنے ہیں۔ کمروں کی صفائی کرنی ہے...... تمہارا سامان سمیٹنا ہے۔ پھر یہ کب کرو گی۔؟''

تاجہ:۔ ''کیا؟ میرا سامان سمیٹنا ہے؟؟ لیکن کیوں؟؟؟'' (تاجہ، رانی کو حیرانی سے دیکھتی ہے)

رانی:۔ ''کیوں کیا؟'' (چہرے پر مصنوعی حیرت) ''تمہیں نہیں معلوم؟؟''

تاجہ:۔ (کھڑی ہو کر بہو کے قریب جاتی ہے) ''کیا نہیں معلوم؟'' (تاجہ کی آواز میں تھرتھراہٹ)

رانی:۔ ''اوہ ہو...... کس مصیبت سے پالا پڑا ہے۔ کیا رشید نے تم کو نہیں بتایا؟''

تاجہ:۔ ''رشید نے؟'' (تشویش کے ساتھ) ''کیا نہیں بتایا رشید نے؟''

رانی:۔ ''یہی کہ میری بہن ڈالی بچوں کے ساتھ آ رہی ہے۔''

تاجہ:۔ ''تو......'' (تاجہ بہو کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ جانتی ہے کچھ انہونی ہونے والی ہے)

رانی:۔ ''تو کیا۔؟'' (جھنجھلا کر) ''وہ تمہارے کمرے میں رہیں گے۔ تم اپنا سامان سمیٹ لو اور کمرہ خالی کر دو''۔

تاجہ:۔ ''لیکن میں کہاں رہوں گی؟'' (اس کے چہرے پر مردنی سی چھا جاتی ہے)

رانی:۔ ''ہمیں کیا معلوم۔ جہاں دل چاہے رہ لو۔'' (رانی بے پرواہی سے کہہ دیتی ہے)

تاجہ:۔ ''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو بہو؟؟ (تھوڑی جرأت کے ساتھ)

رانی:۔ ''تم کچھ دنوں کے لئے سارہ کے ہاں جاؤ۔ جب ہم بلائیں گے تو چلی آنا۔''

تاجہ:۔ ’’سارہ کے ہاں جاؤں ۔مگر کیوں؟؟؟‘‘

رانی:۔ ’’وہ اس لئے کہ یہاں جگہ کی کمی ہے۔اگر تم نہیں جاؤ گی تو ڈالی اور اس کے بچے کہاں رہیں گے‘‘

تاجہ:۔ ’’رشید نے کیا کہا‘‘ (تاجہ بے بسی سے پوچھتی ہے)

رانی:۔ ’’وہ کیا کہتا؟ یہ تو اسی نے کہا کہ ماں تب تک سارہ کے ہاں رہے گی۔‘‘

تاجہ:۔ (حیرت سے اس کا منہ کھل جاتا ہے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) ’’یہ...... یہ......رشید نے کہا......

نہیں نہیں ......رشید ایسا نہیں کہے گا۔‘‘ (ملا جلا رد عمل) ’’وہ کہے بھی تو اسے کیا۔ میں بار بار بیٹی کے گھر نہیں جا سکتی۔ وہ سسرال میں رہتی ہے ۔میں وہاں نہیں جا سکتی‘‘۔

رانی:۔ ’’کیوں نہیں جا سکتی۔اس پر بھی تو تمہارا حق بنتا ہے۔تم جاؤ گی تو وہ کیا ناراض ہو گی‘‘

تاجہ:۔ ’’بہو۔اس کے اپنے بچے ہیں۔ساتھ میں سسر رہتا ہے۔اس کے دیور اور نند بھی ساتھ رہتے ہیں۔ وہ اکیلی ہوتی تو بات الگ تھی۔ میں اتنے مہینے وہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔‘‘

رانی:۔ ’’تو ہم کیا کریں...... یہ تو تم کو سوچنا ہے تم کہاں رہو گی۔ ہمیں تو کمرہ خالی چاہیئے ۔وہ بھی ابھی۔

چلو جلدی کرو۔‘‘

تاجہ:۔ (ہار مانتے ہوئے) ’’اچھا بہو......میں ڈالی کے لئے کمرہ خالی کرتی ہوں اور اپنا سامان کچن میں رکھ دیتی ہوں‘‘

رانی:۔ ’’کچن میں؟ کچن میں اتنی جگہ کہاں ہے......ویسے بھی کچن کے ساتھ میرا کمرہ ہے......تم آدھی رات کو ہی اٹھ جاتی ہو اور کھانستی بھی رہتی ہو۔‘‘

تاجہ:۔ ''بہو...... میں جلدی نہیں اٹھوں گی۔ کھانسوں گی بھی نہیں۔ خاموشی سے پڑی رہوں گی۔''

(بہو کی خوش آمدی کرتے ہوئے)

رانی:۔ (غصے سے) ''بس...... اب بہت ہو گیا۔ تم تو پھر پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔ اب یہ کپڑے کون دھوئے گا۔

جلدی کرو اور اپنا بوریا بسترہ سمیٹ لو۔'' (رانی غصے میں واپس چلی جاتی ہے)

(تاجہ جاتی ہوئی رانی کو دیکھ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ بیٹھ جاتی ہے۔ کپڑوں پر آہستہ آہستہ صابن کی ٹکیہ چلانا شروع کرتی ہے...... لیکن اس کی نظریں اس پتھریلی راہ میں گڑ جاتی ہیں جس راستے سے ابھی ابھی رانی گئی ہے۔ اس کے تصور میں کہیں دور گاؤں کی ہریالی کا منظر ابھر رہا ہے)

منظر...... تین

Flash back

(ایک گاؤں کا منظر۔ گاؤں میں تاجہ کا صاف ستھرا گھر...... رشید کا لڑکپن۔ نئی قمیض پینٹ پہن رکھی ہے۔ رشید بیگ میں کتابیں رکھ رہا ہے اور ساتھ ہی کپڑے ٹھونس رہا ہے۔ اپنی بہن کو آوازیں بھی دے رہا ہے)

رشید احمد:۔ ''بھاجی...... بھاجی...... او ہو دیر ہو رہی ہے مجھے...... ماں''

سارہ:۔ ''آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں'' (ایک نوجوان لڑکی سارہ کمرے کے اندر آ جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں تہہ کئے ہوئے کچھ کپڑے ہیں۔) ''تمہارے کپڑوں کی استری کر رہی تھی۔ لو یہ رہ گئے تھے'' (رشید احمد نے کپڑے لئے اور جلدی سے بیگ میں ٹھونس دیئے)

سارہ:۔ ''ارے ارے...... یہ کیا کر رہے ہو۔ بھائی میں نے ابھی ان کپڑوں کی استری کی ہے۔ تم نے ایسے ہی ان کو بیگ میں ٹھونس دیا ہے''۔

رشید احمد:۔ ''اوہ ہو بھاجی۔ کیا ضرورت تھی ان کو استری کرنے کی۔ ویسے بھی بیگ میں رکھنے سے کپڑوں کی استری کہاں رہے گی۔ کالج پہنچتے پہنچتے کتنی گاڑیاں بدلنی پڑتی ہیں۔ یہاں سے بس سٹینڈ۔ وہاں سے شہر۔ شہر سے کالج۔ کالج سے ہوسٹل۔ ایک گاڑی سے بیگ اتارو، تو دوسری میں رکھ دو۔ یہاں اٹھالو وہاں ڈال دو۔ وہاں سے یہاں پھینکو۔ پوری اٹھک بیٹھک۔ پھر کاہے کی استری۔''

سارہ:۔ ''ہاں ہاں پتہ ہے......اوہ ہو یہ پینٹ بھی سنبھالو۔ یہیں رکھ چھوڑو گے کیا''۔

رشید احمد:۔ ''مجھے یاد ہے بھاجی۔ میرے پاس کپڑے ہی کتنے ہیں جو میں آدھے بھول جاؤں۔ دو پینٹ اور تین قمیض۔ بس نا'' (پینٹ بیگ میں رکھتے ہوئے) ''اب ماں کہاں رہ گئی۔ بہت دیر ہو رہی ہے''۔

سارہ:۔ ''آ رہی ہو گی۔ تمہارے لئے پیسوں کا انتظام کر رہی ہے۔''

رشید احمد:۔ ''بھاجی، مجھے معلوم ہے ماں میرے لئے کتنا پریشان رہتی ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ پڑھائی چھوڑ دوں اور کہیں کوئی کام دھندا شروع کروں۔''

سارہ:۔ ''اوہ......نا نا رشید۔ میرے بھائی یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ اب تو یہ تمہارا آخری سال ہے۔ پھر اس کے بعد نوکری تو مل ہی جائے گی نا۔''

رشید احمد:۔ ''مگر بھاجی۔ ماں کو میرے لئے کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔''

سارہ:۔ ''ہاں ماں نے تمہارے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن اب تو کچھ ہی مہینے باقی ہیں۔ بس تمہارا رزلٹ آجائے تو پھر سارے دکھ، سارے غم دور ہو جائیں گے'' (تاجہ اندر آجاتی ہے) ''یہ دیکھو ماں بھی آ گئی''

رشید احمد:۔ ''ماں بہت دیر ہو گئی۔ اب کچھ انتظام ہو گیا کیا''

تاجہ:۔ ''رشید تم اتنی فکر کیوں کرتے ہو۔ ابھی تمہاری ماں زندہ ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے'' (تاجہ ایک پوٹلی کھولتی ہے جس میں کچھ گہنے رکھے ہیں۔ رشید اور سارہ ہکا بکا دیکھ رہے ہیں)

رشید احمد:۔ ''یہ...... یہ...... یہ کیا ہے ماں'' (رشید احمد پریشان ہوتے ہوئے)

سارہ:۔ ''ماں...... یہ...... یہ تیرے گہنے؟'' (سارہ بھی حیران)

رشید احمد:۔ ''نہیں نہیں ماں۔ یہ تم کیا کر رہی ہو؟ یہ گہنے......''

تاجہ:۔ (رشید احمد کی بات کاٹتے ہوئے) ''میرے بیٹے، یہ گہنے تو میں نے اسی دن کے لئے سنبھال کر رکھے ہیں۔ یہ صرف میرے ہی نہیں ہیں، ہم سب کے ہیں۔''

رشید احمد:۔ ''لیکن ماں......''

تاجہ:۔ ''دیکھو بیٹے، یہ تیری پڑھائی کا آخری سال ہے۔ اگرچہ یہ امتحان صرف تم ہی کو پاس کرنا ہے۔ مگر یہ ہم سب کے لئے بھی بہت معنی رکھتا ہے۔ تمہیں دل لگا کر پڑھائی کرنا ہوگی۔ تمہاری کامیابی سے اس گھر کا سارا نقشہ بدل سکتا ہے...... اس گھر کو تمہاری بہت ضرورت ہے، بیٹا۔'' (تاجہ کا لہجہ امید افزا تھا)

سارہ:۔ (آنکھوں میں آنسوں لئے) ''ماں لیکن یہ گہنے......''

تاجہ:۔ ''بس سارہ بس ایک آنسوں بھی تیری آنکھ سے نہ گرنے پائے۔ یہ گہنے، یہ زیورات میرے بچوں کے مستقبل کے سامنے بہت ہیچ ہیں۔ اگر میرے پاس ان زیورات سے بھی زیادہ کوئی قیمتی شئے ہوتی تو میں اسے بھی اپنے بچوں پر نچھاور کرتی۔ حالانکہ یہ زیورات میرے پاس تمہارے ابو کی نشانی ہیں۔ پھر بھی ایک ماں کے لئے اس سے بڑی کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے زیورات اپنے بیٹے کی پڑھائی پر خرچ کر رہی ہے۔ میرے لئے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں ہے۔''

رشید احمد:۔ ''ماں میں پڑھائی چھوڑ دوں گا۔ محنت مزدوری کروں گا۔ لیکن تم ابو کی یہ نشانی اپنے پاس رکھو۔''

تاجہ:۔ ''میرے بیٹے، میری کائنات تو تم سے ہے۔ یہ ساری کائنات تبھی میرے لئے خوشنما اور خوشگوار ہوگی جب تم خوش رہو گے۔ بیٹا اب تم وقت ضایع مت کرو۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ شہر میں ان زیورات کا اچھا پیسہ ملے گا۔''

(تاجہ زیورات کی پوٹلی رشید احمد کی طرف بڑھا دیتی ہے جو لینے سے ہچکچا رہا ہے) ''رکھ لے بیٹا۔ ان کو خرچ کرنے کا یہ صحیح وقت آ گیا ہے۔ رکھ لے (ماں زبردستی پوٹلی بیٹے کے ہاتھ میں دیتی ہے اور رشید احمد پوٹلی کے ساتھ ساتھ ماں کا ہاتھ بھی اپنی نم آنکھوں سے لگا دیتا ہے۔ سارہ کی آنکھیں بھی چھلک پڑتی ہیں) ''بس بیٹا من لگا کر پڑھنا۔ امتحان میں خوب محنت کرنا۔ کسی اور چیز کی ضرورت پڑے تو چٹھی میں لکھ دینا''۔

سارہ:۔ (رشید کا بیگ اٹھاتے) ''چلو بھیا''

رشید احمد:۔ ''بھاجی...... میں بیگ خود اٹھاتا ہوں۔''

سارہ:۔ ''نہیں......تم چلو میں اٹھاتی ہوں۔''

رشید احمد:۔ ''ارے یہ بھاری ہے بھاجی۔''

سارہ:۔ ''کوئی بات نہیں۔ بھائی کا بوجھ اتنا زیادہ نہیں ہوتا ہے جو بہن خوشی سے کندھے پر نہ اٹھا سکے۔''

تاجہ:۔ ''رہنے دے بیٹا۔ باہر تک اٹھا لے گی تو اس کا دل بھی خوش ہو جائے گا'' (سبھی گھر سے باہر آ جاتے ہیں)

Outdoor

رشید احمد:۔ ''اچھا ماں۔ اپنا خیال رکھنا۔''

تاجہ۔ (رشید کو گلے لگاتے ہوئے) ''بیٹا تم بھی اپنا خیال رکھنا۔''

رشید احمد۔ ''بھاجی لاؤ بیگ۔''

(رشید سارہ سے بیگ لے لیتا ہے اور آنگن سے باہر آجاتا ہے۔ دونوں ماں بیٹی تب تک اسے دیکھتی رہتی ہیں جب تک وہ نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ جب ان کی نظریں لوٹ آتی ہیں تو دونوں کی آنکھیں بھیگی ہوئیں ہوتی ہیں)

سارہ:۔ ''نہیں ماں نہیں''

تاجہ:۔ ''ارے یہ کیا بیٹی ۔ مجھے روکتی ہو اور خود رو پڑتی ہو...... نا بیٹا نا۔ آنسو نہیں'' (تاجہ اسے گلے لگاتی ہے)

سارہ:۔ ''تم بھی تو روتی ہو ماں''

تاجہ:۔ ''پگلی یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ جب ہمیں زیادہ خوشی ملتی ہے تو اسے من میں سمانہیں پاتے ہیں ۔ تبھی آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں۔ آ۔ چل اندر۔ پھر کھیت پر بھی جانا ہے۔

منظر...... چار

(گاؤں کا منظر۔ دور دور تک کھیت ہی کھیت نظر آرہے ہیں ۔ کھیتوں میں لوگ کام کررہے ہیں ۔ کنج اور قادر بھی اپنے کھیتوں میں کام کررہے ہیں۔ ان کا کھیت تاجہ کے کھیت سے ملحق ہے ۔ تاجہ بھی اپنے کھیت پر کام کررہی ہے۔ اچانک تاجہ کو چکر آگیا۔ وہ کنج کو آواز دیتی ہے لیکن خود کو سنبھال نہیں پارہی ہے اور آہستہ آہستہ بیٹھ جاتی ہے)

تاجہ:۔ ''کنج ......کنجی......'' (کنج سن لیتی ہے اور تاجہ کی طرف دیکھتی ہے)

کنج:۔ ''کیا ہے تاجہ'' (کنج تاجہ کو سر پکڑے بیٹھے دیکھتی ہے تو وہ دوڑ کر اس کی طرف آتی ہے۔ ساتھ ہی دوسرے لوگوں کو بھی بلاتی ہے) ''غلاما...... قادرا...... ارے دیکھو تاجہ کو کیا ہو گیا۔'' (کنج تاجہ کا سر اپنی گود میں لیتی ہے۔ جب تک اور لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں)۔

قادر:۔ ''ارے ہٹو...... ہٹو ذرا ہوا تو آنے دو'' (قادر تاجہ کا ہاتھ پکڑتا ہے)
''اوہ......اوہ......تاجہ تم کو تیز بخار ہے......غلاما تھوڑا پانی لانا۔'' (غلاما پانی کا برتن لے آتا ہے اور یہ تاجہ کو پانی پلاتے ہیں)

کتج:۔ ''کیا کرتی ہو تاجہ۔ اگر تم بیمار تھی تو کام پر کیوں آئی۔'' (کتج نے نصیحت آموز لہجے میں کہا)

تاجہ:۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو کتج۔ کام تو کرنا ہے نا۔ یہ سب کون دیکھے گا۔''

قادر:۔ ''اوہ ہو تاجہ......تم بھی نا......تم بیمار تھی تو گھر میں ہی کہہ دیتی۔ ہم کیا تیرا کام نہیں کرتے۔''

تاجہ:۔ (تھوڑا سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے) ''کیسی باتیں کرتے ہو قادر۔ یہ تم ہی لوگ تو ہو جو بار بار میرا کام کرتے ہو۔ میری مدد کرتے ہو۔ ورنہ میں رشید کو اتنا کہاں پڑھا سکتی تھی۔۔ گھر کا گزارہ بھی نہیں چل سکتا...... یہ سب تو تم ہی لوگوں کی مہربانی سے ہوا ہے۔''

کتج:۔ ''اب دیکھو تم بھی کیا لے بیٹھی۔ ہم سب تو ایک ہی گھر کے جیسے لوگ ہیں۔ اپنے گاؤں میں کیا اپنا، کیا پرایا۔
ایک دوسرے کا غم ہو یا ایک دوسرے کی خوشیاں۔ ہم سب مل کر بانٹتے ہیں۔''

قادر:۔ ''اور کیا۔ تاجہ ہم سب تو تمہارے اپنے ہیں۔ تم کبھی خود کو اکیلی مت سمجھنا۔ جیسے ہمارے اپنے کھیت ویسے ہی تمہارے۔ جیسے ہم اپنے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح تمہارے کھیتوں پر بھی کریں گے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔ کتج تاجہ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ تم اس کو گھر لے جاؤ۔ ہم پہلے اسی کے کھیتوں میں کام کریں گے۔ پہلے ان کو ہی کو نپٹاتے ہیں۔ چلو تم اسے لے جاؤ۔''

تاجہ:۔ ''نا قادرہ...... میں کہاں جاؤں گی۔ یہیں تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گی۔ گھر جاؤں گی تو سارہ رو پڑے گی۔ ویسے بھی میں اب ٹھیک ہوں۔''

کنج:۔ ''نہیں تاجہ، تم کو آرام کرنا ہوگا۔ چلو میں تمہارے ساتھ ہی آ رہی ہوں۔ چلو اٹھو۔'' (اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے)

تاجہ:۔ ''نہیں کنج...... رکو نا تم۔ اچھا ٹھیک ہے تم تھوڑی دیر یہیں رکو میرے پاس...... قادر۔ غلاما۔ جاؤ تم لوگ۔ تم کام کرو۔''

قادر:۔ ''اچھا ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ۔ کنجی۔ تم اس کے ساتھ ہی بیٹھو۔ ہاں یہیں چھاؤں میں ہی بیٹھنا۔ اگر کچھ گڑ بڑ ہوگئی تو آواز دینا۔ اچھا بھائی لوگو...... چلو کام پر۔'' (سبھی لوگ کام پر جاتے ہیں)

منظر...... پانچ

(گاؤں کی کچی سڑک پر ڈاکیہ سائیکل سے جا رہا ہے۔ وہ گاؤں کے مختلف گلی کوچوں سے گزرتا ہے۔ تاجہ کے گھر کے سامنے رکتا ہے۔ سائیکل کی گھنٹی بجاتا ہے۔ گھر سے سارہ نکلتی ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی ہے۔ وہ ڈاکیہ سے چٹھی لے کر گھر کے اندر چلی جاتی ہے۔ ڈاکیہ آگے بڑھ جاتا ہے۔)

منظر...... چھ

(کاکہ گاؤں کا ایک بزرگ آدمی۔ مشکل وقت میں پڑوسیوں کے کام آنے والا۔ کبھی کسی پڑوسی کے بیٹے یا بیٹی کے رشتے کی بات ہو تو کاکہ اس میں بھی پیش پیش رہتا ہے۔ وہ مختلف راستے کاٹ کر تاجہ کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ باہر آنگن میں ایک طرف صاف ستھری چٹائی ڈال رکھی ہے۔ تاجہ کو آواز دے کر چٹائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ دوسری طرف سے تاجہ بھی آ جاتی ہے۔)

تاجہ:۔ ''کاکہ آپ۔ السلام علیکم'' (مسکراتے)

کاکہ:۔ ''وعلیکم السلام۔۔ کیسی ہو تاجہ بیٹی'' (کاکہ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا)

تاجہ:۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ آپ کیسے ہیں''

کاکہ:۔ ''بس اللہ کا کرم ہے۔ رشید احمد اور سارہ بیٹی کیسے ہیں۔ رشید احمد کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔''

تاجہ:۔ ''سب ٹھیک ہے کاکہ۔ اللہ کا شکر ہے۔ رشید پاس ہو گیا۔ ابھی کچھ دن پہلے آیا تھا۔ نوکری کے سلسلے میں پھر شہر گیا ہوا ہے۔ آپ بھی دعا کیجئے۔ اسے اچھی نوکری مل جائے۔''

کاکہ:۔ (ہاتھ اٹھاتے ہوئے) ''وہ چارہ ساز ہے بیٹی۔ راستہ سجاتا بھی وہی ہے اور راستہ دکھاتا بھی وہی ہے۔ تم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ جو تمہارے پاس تھا سب بیٹے پر خرچ کر دیا۔ اس کا پھل ضرور ملے گا۔''

تاجہ:۔ ''انشاء اللہ۔''

کاکہ:۔ ''اچھا تاجہ اب سارہ کے لئے کیا سوچا ہے۔ وہ لوگ شادی کے لئے ضد کر رہے ہیں۔ پرسوں بھی آئے تھے میرے پاس۔''

تاجہ:۔ ''کاکہ آپ تو جانتے ہیں میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب رشید احمد کی پڑھائی پر خرچ ہو گیا۔ اب میں اتنی جلدی کیا کر سکتی ہوں۔'' (غم میں ڈوبی)

کاکہ:۔ ''تاجہ بیٹی یہ رشتہ بڑی مشکل سے ملا ہے۔ یہ بھی جبھی ممکن ہوا کہ وہ لوگ تمہارے شوہر کو جانتے تھے۔ مرحوم کی شرافت کے قائل تھے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سارہ بیٹی اچھی لڑکی ہے۔ ورنہ آج کے زمانے میں غریب لوگوں کو کون پوچھتا ہے''

تاجہ:۔ ''صحیح کہہ رہے ہو کاکہ۔ یہ تو میری قسمت اچھی ہے جو سارہ کو اتنا اچھا رشتہ ملا ہے۔ اس رشتے کے لئے آپ کی دوڑ دھوپ کرنا مجھ پر احسان ہے۔ آپ کی وجہ سے ہی یہ اتنا اچھا رشتہ ملا ہے۔ لیکن کاکہ آپ تو جانتے ہیں، میں اس وقت کس کسم پرسی میں دن کاٹ رہی ہوں۔ بس رشید کی نوکری لگ جائے تو سب سے پہلے میں سارہ کا نکاح پڑھوا لوں گی۔''

کا کہ:۔ اللہ کرے رشید احمد کو جلدی نوکری مل جائے۔ مجھے تو اس رشتے کی سخت فکر ہے۔ اتنے اچھے رشتے سے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ پھر نیا رشتہ ڈھونڈنا...... بہت مشکل ہے تاجہ بیٹی۔"

تاجہ:۔ "ہاں کا کہ سمجھتی ہوں۔ اللہ ایسے دن کسی دشمن کو بھی نہ دکھادئے۔ بس اب تھوڑا اور انتظار"

کا کہ:۔ "ہاں بیٹی، سوچتا ہوں جب مصیبت آجاتی ہے تو سب سے پہلے ہم غریبوں کو ہی کیوں دبوچ لیتی ہے"

تاجہ:۔ "کا کہ اللہ کا شکر ہے۔ رشید کو یہاں تک پڑھایا لکھایا۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ بس اب میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گی۔ یہ سب اللہ کا ہی کرم ہے جو رشید اچھے نمبر لے کر پاس ہو گیا۔"

کا کہ:۔ "ہاں۔ وہ نہیں کہتے۔ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم۔ تم کو جو اپنے اللہ پر بھروسہ ہے وہ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔ مجھے بھی پوری امید ہے۔ اچھا بیٹی، چلتا ہوں" (کھڑا ہو جاتا ہے)

تاجہ:۔ "اچھا خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔" (دونوں تھوڑی دور تک ساتھ چلتے ہیں)

منظر......سات

(گاؤں کے بیچ جاتی سڑک کا منظر۔ کئی لوگ آرہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ڈاکیہ سائیکل تاجہ کے گھر کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے اور گھنٹی بجاتا ہے۔)

ڈاکیہ:۔ "چٹھی آئی ہے......چٹھی لے لو

(دروازہ کھلتا ہے۔ اندر سے تاجہ نکلتی ہے۔ اب تاجہ کے چہرے پر کچھ تبدیلی آئی ہے۔ اس کے کچھ بال سفید بھی ہو چکے ہیں)

ڈاکیہ:۔ "آداب ماں جی"

تاجہ:۔ "آداب بیٹا۔ میرے رشید کی چٹھی لائے ہونا

ڈاکیہ:۔ (چٹھی نکلتے ہوئے) ''ہاں ماجی...... پڑھ کے سناؤں''

تاجہ:۔ ''ارے نہیں بیٹا۔ وہ سارا آرہی ہوگی وہی پڑھے گی۔ تم جاؤ بیٹا۔ اللہ تیرا بھلا کرے......''

(ڈاکیہ نکل جاتا ہے۔ سارہ آجاتی ہے۔ وہ ماں کے ہاتھ میں چٹھی دیکھ کر خوش ہوجاتی ہے)

سارہ:۔ ''اوہ ماں۔ رشید بھائی جان کی چٹھی آئی ہے نا''

تاجہ:۔ ''ہاں بیٹی۔ تم سامان اندر رکھ دو۔ پھر چٹھی پڑھ لینا''

سارہ:۔ ''اچھا ماں'' (سارہ اندر جاتی ہے۔ تاجہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر جاتی ہے۔ سامان رکھ کر سارہ بھی ماں کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ ماں سے چٹھی لے کر کھولتی ہے)

منظر...... آٹھ

سارہ:۔ ''پیاری بھاجی اور ماں...... میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تم لوگوں کی بہت یاد آتی ہے۔ ہاں ماں مجھے نوکری مل گئی۔ (دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں اور خوش ہوجاتی ہیں۔ دونوں چٹھی کو بوسہ دیتی ہیں۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو گلے لگاتی ہیں)

سارہ:۔ ''ماں۔'' (بہت زیادہ خوشی کے ساتھ)

تاجہ:۔ ''آگے پڑھو...... آگے پڑھو'' (خوشی سے تاجہ کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں)۔

سارہ:۔ ''میں ایک بڑی کمپنی میں منیجر ہوگیا ہوں۔ دراصل ماں، مجھے یہ نوکری ایک لڑکی کی وجہ سے مل گئی ہے۔ رانی خوبصورت ہے اور شریف بھی۔ رانی کا ڈیڈی ایک امیر آدمی ہے جس نے مجھے یہ نوکری دلادی ہے۔ لیکن ماں رانی کی شرط تھی کہ پہلے میں اس کے ساتھ شادی کرلوں''۔

(دونوں ماں بیٹی حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں)

''شادی نوکری سے پہلے ہی کرنی پڑی اور رانی کے ڈیڈی نے ہمیں رہنے کے لئے ایک چھوٹا لیکن خوبصورت گھر بھی دیا ہے۔'' (ماں بیٹی حسرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں)

''ماں تم نہیں جانتی شہر میں گھر ملنا کتنا مشکل ہوتا ہے...... یہ گھر اور نوکری مجھے رانی کی وجہ سے ملی ہے۔

اس لئے مجھے جلدی میں ہی رانی سے شادی کرنا پڑی'' (سارہ نے ماں کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ سارہ کی بھی ہچکی بندھ چکی تھی اور وہ رک رک کر چٹھی پڑھ رہی تھی)

''مجھے افسوس ہے میں تم لوگوں کو جلدی میں بلا نہ سکا۔ کبھی موقعہ ملا تو تم لوگوں کو رانی سے ملادوں گا''۔

(سارہ چٹھی ختم کرتے ہی زور زور سے رونے لگتی ہے۔ تاجہ کے آنسو بھی رکنے کا نام نہیں لیتے ہیں)

تاجہ:۔ (روتے روتے) ''میرے بیٹے، یہ تم نے کیا کِیا۔ ماں کے بغیر۔ ماں سے پوچھے بنا۔ شادی بھی کرلی۔ تم ایسے تو نہ تھے''۔

سارہ:۔ ''ماں، میرا بھائی ایسا نہیں ہے، وہ ہمارے ساتھ مذاق کررہا ہے۔ ماں وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ وہ جانتا ہے ہمارا اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے ہم اسے کتنا پیار کرتے ہیں..... نہیں نہیں ماں، یہ سب مذاق ہے۔ سب مذاق ہے۔ میرا بھائی ایسا نہیں کرسکتا'' (سارہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر)

تاجہ:۔ (اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے) ''نہیں بیٹی، یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ کڑوا ہے مگر سچ ہے''

سارہ:۔ ''لیکن ماں اگر اس کو شادی کرنی ہی تھی تو ہم کو بلایا کیوں نہیں''۔

تاجہ:۔ بیٹی اس نے ایک امیر باپ کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی ہے جس کی وجہ سے اسے نوکری ملی۔ گھر ملا۔

سب سے بڑی بات امیر بیوی ملی ہے۔ اسے اب ہماری کیا ضرورت۔"

(تاجہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور سر دیوار کے ساتھ ٹکا دیتی ہے۔ سارہ بہت رو رہی ہے)

تاجہ:۔ "نا بیٹی......نا......مت رو۔ مت رو میری بیٹی" (تاجہ سارہ کو گلے لگاتی ہے۔ اسے چپ کراتے کراتے خود بھی زور زور سے روتی ہے اور روتے روتے رشید کو بھی یاد کرتی ہے)

"رشید......رشید......میرے بیٹے یہ......یہ تم نے کیا کر دیا"

منظر......نو

(ٹائم چینج کے لئے گاؤں کے مختلف منظر۔ کھیت، کھیتوں میں کام کرتے لوگ۔ صبح اور شام ڈھلنے کے مناظر۔ آتے جاتے اور کام میں مشغول لوگوں کی پاسنگس۔ تاجہ اپنے آنگن میں صفائی کر رہی ہے اور سارہ گھر سے باہر آنگن میں آجاتی ہے۔ تب تک کاکہ بھی آنگن میں پہنچ جاتا ہے)

سارہ:۔ "السلام علیکم کاکہ" (تاجہ بھی کاکہ کو دیکھ کر سلام کرتی ہے)

کاکہ:۔ "وعلیکم السلام۔ بیٹی کیا حال ہے ٹھیک ہو۔ تاجہ تم کیسی ہو"۔

تاجہ:۔ "اللہ کا فضل ہے کاکہ۔ آؤ بیٹھو۔ سارہ بیٹی تم کاکہ کے لئے چائے بناؤ"

کاکہ:۔ "نا بیٹی چائے نہیں۔ بس ایک گلاس پانی لے کر آؤ" (سارہ اندر جاتی ہے۔ کاکہ چٹائی پر بیٹھ جاتا ہے)

"تاجہ بہت دیر لگا رہی ہو تم۔ بیٹی ایسا گھر ملنا دشوار ہے۔ آج کل غریب لوگوں کو کون پوچھتا ہے۔ میری مانو تو جلد سے جلد سارہ بیٹی کی شادی کر دو۔ نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

تاجہ:۔ (لمبی سانس لے کر) "ہاں کاکہ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ اب رشید بھی ملازم ہوگیا ہے۔ مجھے امید ہے اب زیادہ وقت نہیں لگے گا" (سارہ پانی لے کر آتی ہے اور کاکہ گلاس لے کر کہتا ہے)

کاکہ:۔ "اللہ کرے سب اچھا ہو......تو پھر میں ان کو کیا جواب دوں"

تاجہ:۔ "بس کاکہ میں رشید کو خط لکھوا دوں گی"۔

کاکہ:۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ یہ شادی جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی ٹھیک ہے۔ تاجہ یہ سارہ بیٹی کی قسمت اچھی تھی جو اتنا اچھا رشتہ ملا ہے۔ تقدیر سے ہی ایسے لڑکے ملتے ہیں۔ بس یہ دیری کہیں رشتے میں بدمزگی پیدا نہ کرے"۔

تاجہ:۔ "نہیں کاکہ۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آپ کو بہت جلد بتا دوں گی"۔

کاکہ:۔ "اچھا چلتا ہوں۔ فیصلہ ذرا جلدی کرنا"۔

تاجہ:۔ "فیصلہ کیا کرنا ہے کاکہ بس تھوڑا پیسہ ہاتھ میں آجائے تو۔ ہم کو کیا تھوڑی دھوم دھام کی شادی کرنی ہے۔ رشتہ دار تو اپنا کوئی ہے ہی نہیں۔ بس اپنے پڑوسی ہیں اور وہی اپنا سب کچھ ہیں"

کاکہ:۔ "ہاں ہاں جانتا ہوں۔ اچھا چلتا ہوں۔ ابھی ایک دو جگہ اور جانا ہے"۔

تاجہ:۔ "اچھا خدا حافظ"

(کاکہ چلا جاتا ہے۔ تاجہ اسے جاتے دیکھ تو رہی ہے مگر اس کی سوچ کہیں اور اٹک چکی ہے۔ سارہ آہستہ آہستہ چل کر اس کے قریب آجاتی ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھاتی ہے، پھر رک جاتی ہے۔ آخر کچھ فیصلہ کر کے ہاتھ ماں کے کندھے پر رکھ دیتی ہے۔ تاجہ پیچھے کی طرف دیکھتی ہے۔ بیٹی سے آنکھیں ملاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گھر کے اندر کی طرف بڑھتی ہے۔ دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں میں نمی تیر رہی ہے)

منظر......دس

(گاؤں کی مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ڈاکیہ کی سائیکل تاجہ کے گھر کے قریب سے گزرتی ہے تو سارہ دوڑ کے گھر سے باہر آجاتی ہے اور ڈاکیہ کو روک کر پوچھتی ہے)

سارہ:۔ ''ڈاکیہ بابو......ڈاکیہ بابو......ہماری چٹھی؟؟؟ (سائیکل کی ہینڈل پکڑ کر)

ڈاکیہ:۔ ''آپ کی کوئی چٹھی نہیں ہے۔'' (ڈاکیہ کا سیدھا سا جواب)

سارہ:۔ ''کیا مطلب......کیوں نہیں ہے۔'' (سارہ کا بے تکا سوال)

ڈاکیہ:۔ ''اب کیوں نہیں ہے۔ یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں'' (ڈاکیہ سائیکل آگے بڑھاتا ہے اور سارہ اسے حیرانی سے جاتے ہوئے دیکھتی ہے۔ وہ تھکے قدموں سے گھر کی طرف بڑھتی ہے)

(تاجہ اور سارہ کے کام کاج کے مختلف منظر۔ ماں بیٹی سے خط لکھوا رہی ہے......گھر کا کام کر رہی ہیں۔
کھیتوں پر جا رہی ہیں۔ آس پاس کے لوگوں سے ملتی ہیں۔ پھر خط لکھنے بیٹھ جاتی ہیں۔ تاجہ اکثر اداس رہتی ہے......سارہ بار بار ڈاکیہ کو روکتی ہے اور بد دل ہو کر واپس آجاتی ہے)

منظر......گیارہ

(کمرے میں تاجہ اداس بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور سر دیوار کے ساتھ ٹکا رکھا ہے۔ سارہ اندر آجاتی ہے۔ ماں کو دیکھتی ہے۔ پھر خاموشی سے اس کے قریب بیٹھتی ہے اور آہستہ سے اپنا ہاتھ ماں کے ماتھے پر رکھتی ہے۔ تاجہ آنکھیں کھولتی ہے اور حسرت سے بیٹی کو دیکھتی ہے)

سارہ:۔ ”ماں......تم ٹھیک ہونا۔“ (تاجہ ہاں میں سر ہلاتی ہے)
”آخر رشید ہمارے خطوط کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ ہم نے تو اتنے خط لکھے، اس نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ آخر ایسا بھی کیا ہوا ہوگا۔“

تاجہ:۔ ”کیا پتہ بیٹی۔ میں تو پریشان ہوں۔ سوچتی ہوں شہر جا کر معلوم کرلوں۔“

سارہ:۔ ”لیکن ماں۔ اسے وہاں کہاں تلاش کرتی پھروگی

تاجہ:۔ ”پرانی چٹھیوں سے پتہ لے کر جاؤں گی۔ اُسی پتے پر تلاش کروں گی۔ اسے پوچھوں گی تم نے ہم بے سہاروں کو کس کے سہارے چھوڑا ہے۔ آخر ہم سے کیا قصور ہوا ہے کہ تم ہمیں بھول ہی بیٹھے ہو۔“

سارہ:۔ ”نہیں ماں، نہیں۔ وہ ہم کو نہیں بھول سکتا۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہوئی ہے۔ ماں میں آج ہی اس کو ایک اور چٹھی لکھتی ہوں۔ اس کو بتادوں گی کہ وہ ایک بار، صرف ایک بار ہمیں دیکھنے کے لئے آجائے۔“

تاجہ:۔ ”ہاں بیٹی یہ ٹھیک ہے۔ اس کو یہ بھی لکھنا کہ اگر تم نہیں آتے ہو تو میں شہر آجاؤں گی۔ (سارہ خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے اور ماں اسے سمجھا رہی ہے کہ خط میں کیا کیا لکھنا ہے)۔

منظر......بارہ

(رشید احمد کا کمرہ۔ وہ کمرے کے چکر کاٹ رہا ہے۔ چہرے سے پریشان نظر آرہا ہے۔ رانی اندر آجاتی ہے۔ تھوڑی دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے پھر مسکرا کر رشید کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ رشید اس کی طرف دیکھتا ہے۔ رانی رشید کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھاتی ہے۔ خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے پیار سے دیکھتی ہے)

رانی:۔ ”رشید ڈیئر۔ اتنے پریشان کیوں ہو“ (نرم لہجے میں)

رشید احمد:۔ ''رانی تم جانتی ہو''

رانی:۔ ''اوہ ہو...... وہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اس میں پریشان ہونے کی بات ہی کیا ہے۔ تمہاری بہن سارہ کی شادی کا مسئلہ ہے نا......''

رشید احمد:۔ ''مسئلہ صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ ایک تو بھاجی کی شادی کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور پھر اگر کسی طرح سے اس کی شادی کرا بھی دوں تو ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اس کے پاس کون رہے گا۔ ہم گاؤں میں تو نہیں رہ سکتے نا......''

رانی:۔ ''اوہ...... نو نو رشید احمد۔ میں نے کتنی بار کہا تم سے۔ میرے سامنے یہ گاؤں جانے کا پراپوزل نہ رکھا کرو۔ تم جانتے ہو میں وہاں نہیں رہ سکتی۔ یہ گاؤں کا ماحول اب تم کو بھی راس نہیں آئے گا۔ نوکری یہ گھر سب چھوڑ کر ہم گاؤں جا کر کیا کریں گے۔ نو نو'' (اپنا پورا غصہ ظاہر کرتے ہوئے)

رشید احمد:۔ ''میں بھی وہی کہہ رہا ہوں۔ ہم گاؤں میں نہیں رہ سکتے۔ لیکن میں کیا کروں''۔

رانی:۔ ''میں کچھ کہوں۔ تو...... تو؟''

رشید احمد:۔ ''کہو نا...... میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ہے۔'' (رشید سر پکڑتے ہوئے)۔

رانی:۔ ''اگر تم تھوڑی سوجھ بوجھ سے کام لوگے تو یہ سارے مسئلے یوں حل ہو جائیں گے'' (چٹکی بجاتے)

رشید احمد:۔ ''وہی بتاؤ نا...... کیسے؟ (بیوی کو غور سے دیکھتے ہوئے)

رانی:۔ ''تم گاؤں کا گھر بیچ دو......''

رشید احمد:۔ کیا۔؟؟؟ کیا مطلب ہے تیرا ۔۔کیا کہنا چاہتی ہو تم۔'' (رشید بیوی کو گھورتے ہوئے)

رانی:۔ ''میری بات ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ گاؤں میں تم کو تو رہنا نہیں ہے۔ سارہ کی شادی ہو جائے گی اور وہ اپنے سسرال جائے گی۔ تو پھر گاؤں کا گھر تیرے کس کام کا۔''

رشید احمد:۔ ''ہاں...... یہ تو ٹھیک ہے۔ میرے کسی کام کا نہیں۔ لیکن ماں کہاں رہے گی''۔

رانی:۔ یہاں...... وہ یہاں ہمارے ساتھ رہے گی۔''

رشید احمد:۔ (حیران ہو کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے) ''کیا...... کیا تم سچ کہہ رہی ہو۔ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ مگر میں تمہاری ہاں چاہتا تھا۔ سوچ رہا تھا اگر میں کہوں اور تم نے انکار کر دیا تو کیا ہوگا۔''

رانی:۔ ''مطلب......؟ اچھا تو تم یہ سوچتے ہو میرے بارے میں'' (رانی روٹھے انداز میں)

رشید احمد:۔ (ہچکچاتے ہوئے اور بے چارگی سے) ''وہ...... رانی...... وہ...... دراصل...... پلیز رانی''۔

رانی:۔ ''مجھے معلوم ہے تم میرے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے ہو۔ میں بیوی ہوں تمہاری''۔

رشید احمد:۔ ''وہ...... رانی قسم سے۔ تم پر جان سے فدا ہوں۔ تم نے میرے لئے کیا نہیں کیا۔ مجھے نوکری دلا دی۔ مجھے گھر دیا۔ میرے ساتھ شادی کی۔ یار سچی۔ معاف کر دو یار۔'' (بیوی کی منت سماجت کرتے ہوئے)

رانی:۔ ''اچھا اچھا، رہنے دو اب یہ مکھن لگانا۔ تم جلدی سے تیاری کرو۔ گاؤں جاؤ اور سارے کام نپٹا کر واپس آ جاؤ۔ چلو چلو...... تیار ہو جاؤ'' (رانی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہے اور رشید احمد اسے پیار سے گلے لگاتا ہے۔ اسے چومنا چاہتا ہے لیکن رانی اپنا چہرہ دوسری طرف موڑتی ہے)

''نو نو...... کہا نا...... مکھن نہیں۔ چلو'' (وہ رشید احمد کو کھینچ کر کمرے سے باہر لے جاتی ہے)

منظر......تیرہ

(سارہ خوش ہے۔ وہ کچن میں چائے کی ٹری اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے کر جاتی ہے۔ یہاں کمرے میں رشید احمد بیٹھا ہے۔ تاجہ اپنے آنچل سے اسے ہوا دے رہی ہے۔ سارہ پیالوں میں چائے انڈیلتی ہے)

رشید احمد:۔ (سارہ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے) ''دیکھو ماں، اب یہ گھر ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ بھا جی اپنے گھر چلی جائے گی اور میں شہر۔ میں اب اس گاؤں میں واپس نہیں آسکتا۔ تو اس گھر کو رکھنے کا فائدہ کیا ہے۔ اس پر تالا لگانے سے بہتر ہے اس کو بیچ دیں گے......''

تاجہ:۔ (بیٹے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے) ''رشید...... بیٹے یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو...... میں یہ گھر بیچ دوں؟ یہ گھر جو تمہارے ابو کی آخری نشانی ہے میرے پاس۔ نہیں بیٹا نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں تمہارے ابو کی یہ آخری نشانی نہیں بیچ سکتی''۔

رشید احمد:۔ ''اوہ ہو ماں۔ تم کیوں نہیں سمجھتی۔ دیکھو ماں'' (سمجھانے کے انداز میں) ''ہم یہ گھر بیچ دیں گے۔ سارا بھا جی کی شادی کر دیں گے۔ یہ بھی خوش اور ہم بھی خوش''۔

تاجہ:۔ (چہرے پر حیرت) ''سارا کی شادی یہ گھر بیچ کر کریں گے؟ کیا تم کچھ نہیں کرو گے؟''

رشید احمد:۔ ''ماں مجھے ابھی ابھی نوکری ملی۔ شادی شدہ ہوں۔ شہر میں رہتا ہوں۔ اپنے ہی خرچے اتنے زیادہ ہیں کہ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ میں بھا جی کی شادی کیسے کرا سکتا ہوں...... ماں (سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے) بھا جی تم ہی سمجھاؤ نا ماں کو''۔

سارہ:۔ ''ماں رشید ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ ابھی سے یہ اتنا پیسہ کہاں سے لائے گا۔ اس کو اپنے گھر کی ذمہ داریاں بھی تو ہیں''۔

تاجہ:۔ ''کیا یہ گھر اس کا نہیں ہے۔'' (تاجہ پریشان)

رشید احمد:۔ ''تبھی تو کہہ رہا ہوں ماں اس گھر کو بیچ دو''

تاجہ:۔ ''تو میں کہاں رہوں گی۔؟؟'' (تاجہ حسرت سے بولتی ہے)

رشید احمد:۔ ''تم...... میرے ساتھ۔ شہر میں...... میرے گھر میں رہو گی۔

تاجہ:۔ ''تمہارے گھر میں؟؟؟ (حیرت سے) اپنا گھر بیچ کر تمہارے گھر میں رہوں گی؟''

رشید احمد:۔ ''اوہ ماں...... یہ تم نے کیا لگا رکھا ہے۔ میرا گھر تمہارا گھر۔ دیکھو ماں (ماں کو سمجھاتے ہوئے)

''تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ بھاجی کی شادی ہمارے لئے سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس مسئلے کو حل کرنے میں ہمیں اس گھر کی ضرورت ہے۔ آخر یہ گھر جیسا میرا ہے اسی طرح بھاجی کا بھی ہے نا۔ کیا اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں۔ ویسے بھی اس گھر میں اب کوئی نہیں رہنے والا۔ تو پھر اس گھر کو رکھنے کا فائدہ ہی کیا''۔

تاجہ:۔ (ہار مانتے ہوئے) ''اچھا بیٹا، جو تیرے جی میں آئے کر لے''۔

رشید احمد:۔ ''او ماں...... (اور تاجہ اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکا دیتی ہے)

منظر...... چودہ

گاؤں کے بہت سارے لوگ تاجہ کے گھر آ جاتے ہیں جن میں زیادہ تر پڑوس کی عورتیں ہیں۔ کاکہ، کنجی قادر، غلام اور بہت سارے لوگ کھڑے ہیں۔ تاجہ ایک ایک کر کے عورتوں سے گلے ملتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عورتوں کی آنکھیں بھی نم ہیں۔ تاجہ کاکہ کے سامنے آ کر رکتی ہے۔ پھر کسی کو تلاش کر کے ادھر اُدھر دیکھتی ہے۔ کنجی ٹکسی کے پاس کھڑی رو رہی ہے۔ تاجہ اس کے قریب جا کر اس کے ساتھ لپٹ جاتی ہے۔ کنجی جیسے بے حس ہو چکی ہے۔ تاجہ کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ وہ جلدی جلدی دوسری طرف منہ کر کے کھڑی ٹکسی کی طرف جاتی ہے۔ رشید احمد مردوں سے ہاتھ ملا کر گاڑی میں ماں کو بٹھاتا ہے اور خود بھی بیٹھ جاتا ہے۔ مختصر سامان کے ساتھ ٹکسی گاؤں سے شہر کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہے۔ تاجہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی ہے۔ کنج کو جیسے اچانک ہوش آ جاتا ہے اور وہ چلاتے ہوئے ٹکسی کے پیچھے دوڑتی ہے)

کنج:۔ ''تاجہ......تاجہ......تاجہ ہمیں چھوڑ کر مت جا......مت جا تاجہ۔'' (کنج گرنے لگتی ہے۔ قادر اور دوسری عورتیں اسے سنبھالتی ہیں۔ تاجہ تو گاؤں سے چلی جاتی ہے لیکن اپنے پیچھے پورے گاؤں کو رلا کے جاتی ہے)

منظر......پندرہ

(دروازہ کھل جاتا ہے اور رانی اندر آجاتی ہے)

رانی:۔ ''واہ......رشید صاحب۔ آپ تو تیار بھی ہو گئے ہیں۔ کم از کم میرا انتظار ہی کر لیتے۔ اب میں آفس کیسے جاؤں گی۔'' (رشید احمد سوٹ پہنے آئینے کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ بال بنا رہا ہے)۔

رشید احمد:۔ ''تم اتنا وقت کیوں لگاتی ہو۔ تم کو تو پتہ ہے 9 بجے آفس کے لئے نکلنا ہے۔ پھر بھی ہر دن لیٹ ہو جاتی ہو۔''

رانی:۔ ''اب میں کیا کروں۔ صبح صبح ناشتہ بنانا ہے۔ گھر کی صفائی کرنی ہے۔ کپڑے دھونے ہیں۔ پھر کھانا بنا کے رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سب اتنی جلدی کہاں ہوتا ہے...... اب دیکھو نا ابھی صفائی کرنی ہے۔ برتن مانجھنے ہیں۔ سب ایسے ہی پڑا ہے۔''

(اسی وقت تاجہ اندر آجاتی ہے)

تاجہ:۔ ''بہو تم آرام سے آفس جاؤ۔ میں ہوں نا یہاں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ برتن بھی دھو لوں گی اور گھر کی صفائی بھی کر لوں گی۔ جاؤ تم لوگ۔''

رشید احمد:۔ ''ماں......تم......تم کہاں کر لوگی یہ سب''۔

رانی:۔ ''ماں جی، میں کر لوں گی''۔

تاجہ:۔ ''میرے بچو یہ تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے دن بھر کرنا کیا ہے۔ اب میں اتنا بھی نہیں کر سکتی کیا۔
تم لوگ جاؤ آفس۔ تم کو دیر ہو جائے گی......میں کر لوں گی''۔

رانی:۔ ''تھینک یو ماں جی''

تاجہ:۔ ''تم لوگوں کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔گاؤں میں تو اسے زیادہ کرتی تھی۔ یہاں کتنا کرنا ہے۔تم لوگ فکر نا کرو۔ یہ سب میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔جاؤ بچو......تم لوگ جاؤ۔''

رشید احمد:۔''اچھا ماں۔ (دونوں میاں بیوی نکل جاتے ہیں اور تاجہ ان کو پیار سے جاتے ہوئے دیکھتی ہے)

(کئی منظر بدلتے ہیں۔تاجہ صفائی کر رہی۔رانی ٹی وی دیکھ رہی ہے......تاجہ کپڑے دھو رہی ہے۔رانی آئینہ کے سامنے میک اپ کر رہی ہے۔تاجہ کچن میں کھانے کی مختلف چیزیں بنا رہی ہیں اور رانی اپنے مہمانوں کے ساتھ کھا رہی ہے۔تاجہ تھک جاتی ہے اور ماتھے کا پسینہ پونچھتی ہے تو رانی صوفے پر لیٹی کوئی میگزین پڑھ رہی ہے...... کچھ اور منظر بدلتے ہیں۔تاجہ بہت کمزور لگ رہی ہے۔بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتی ہے۔پھر بھی صفائی میں لگی رہتی ہے اور اس کی بہو بیٹا گاڑی نکال کر شاپنگ کرنے چلے جاتے ہیں)۔

Flash back Ends

منظر...... دوسرا (جاری)

(تاجہ کے سامنے کپڑوں کا ڈھیر ہے اور رانی آجاتی ہے۔اس کا چہرہ غصے سے ٹمٹما رہا ہے۔وہ کرخت آواز میں تاجہ پر چلاتی ہے اور تاجہ کا سپنا ٹوٹ جاتا ہے)

رانی:۔ ''کیا تم ابھی تک کپڑے ہی دھو رہی ہے۔برتن کون مانجھے گا۔تم اپنا بوریا بسترہ کب سمیٹ لوگی۔پھر کمرے کی صفائی کب ہوگی؟؟؟''

تاجہ:۔ ''بہو......'' (روہانسی آواز میں)

رانی:۔ (تاجہ کی بات کاٹتے ہوئے) ''مرگئی تیری بہو......اٹھو اٹھو......جلدی اٹھو......یہ کپڑے ایسے ہی چھوڑ دو میں لانڈری میں بھجوادوں گی۔اٹھو تم۔کمرہ خالی کردو۔''

تاجہ:۔ ''(تاجہ زار و قطار روتی ہے) ''بہو۔ میں کہاں جاؤں گی۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ میں یہیں برآمدے میں پڑی رہوں گی''۔

رانی:۔ ''ہاں ہاں...... ہمیں اور بدنام کرلو گی۔ پھر لوگ یہی کہیں گے کہ ساس کو برآمدے میں سلا رہی ہے۔ ویسے بھی یہاں کوئی جگہ خالی نہیں رہے گی...... ڈالی کا شوہر، اس کے بچے...... وہ سبھی لوگ آرہے ہیں۔
اب اٹھو بھی۔ چلو جلدی کرو۔'' (رانی تاجہ کے سامنے رکھے کپڑوں کو ایک طرف ہٹا دیتی ہے)
''چلو...... پھر تم کو گاڑی بھی نہیں ملے گی''
(وہ تاجہ کا بازو پکڑ کر اسے زبردستی اٹھا لیتی ہے اور کھینچنے کی کوشش کرتی ہے)

تاجہ:۔ (روتے روتے) ''نہیں بہو نہیں۔ خدا کے لئے مجھے مت نکالو۔ مجھے یہیں پڑی رہنے دو...... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میں تو تمہارے گھر میں ایک نوکر سے بدتر زندگی گزار رہی ہوں۔ تمہارے گھر کی صفائی کرتی ہوں۔ تم لوگوں کے کپڑے دھوتی ہوں۔ تمہارے لئے کھانا بناتی ہوں اور بدلے میں تم سے کبھی کوئی شکایت نہیں کرتی ہوں۔ بیمار ہو کے بھی کام کرتی رہتی ہوں اور تم سے ایک ٹکی دوائی بھی نہیں مانگتی ہوں۔ پھر تم مجھے کیوں نکال رہی ہو......

رانی:۔ (سر ہلاتے اور ہاتھ نچاتے ہوئے) ''اوہ...... اچھا...... تم اتنے سالوں سے یہاں میرے گھر میں مفت کی روٹیاں توڑتی رہی ہو۔ اب اس کا یہ صلہ دے رہی ہو مجھے۔''

تاجہ:۔ ''بہو، مجھے معاف کردو۔ لیکن مجھے یہاں سے مت نکالو...... میں ڈالی اور اس کے شوہر کے پیر دھولوں گی۔ اس کے بچوں کے کپڑے دھولوں گی۔ ساری عمر تیری خدمت کروں گی۔ مگر مجھے یہاں سے مت نکالو''

رانی:۔ ''تم مجھے میرے ہی گھر میں ذلیل کررہی ہو۔ ٹھہر، میں تمہیں ابھی اس کا مزا چکھاتی ہوں''

(رانی غصے میں جاتی ہے اور تاجہ اپنی بھیگی آستین سے آنکھیں صاف کرتی ہے۔
وہ اس دروازے کو ایک ٹک دیکھ رہی ہے جس سے رانی اندر گئی ہے۔ ابھی تاجہ سنبھل بھی نہیں پاتی ہے کہ رانی آجاتی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پرانا بکسہ اور ایک ہاتھ میں کچھ کپڑے ہیں۔ وہ زور سے بکسہ تاجہ کے سامنے ڈال دیتی ہے اور ایک ایک کر کے کپڑے اس کی طرف پھینکتی جاتی ہے)

رانی:۔ "یہ لے...... یہ لے اور یہ بھی لے......اب یہاں سے دفع ہو جا۔ نکل جا...... پھر یہاں آنے کی کبھی کوشش مت کرنا......اور ہاں یہ بھی لے۔"

(رانی کچھ گرے کپڑے اٹھا لیتی ہے جو اس کے ہاتھ سے گر چکے تھے اور ان کو تاجہ کے منہ پر پھینکتی ہے۔
کپڑے ہوا میں تیرتے ہوئے تاجہ کے چہرے کے قریب آجاتے ہیں لیکن چہرے پر لگنے سے پہلے ہی کیمرا اسٹل ہو جاتا ہے۔

............☆☆☆............

☆......شوکت نسیم

سٹیج ڈراما

سچ کی جیت

کردار

۱۔لالہ جی	گاؤں کا رئیس آدمی۔ایک ظالم شخص
۲۔مہر بخش	ایک ایماندار اور غریب شخص
۳۔نجمہ	مہر بخش کی بیوی
۴۔زبیر	مہر بخش کا بیٹا
۵۔نوراں	مہر بخش کی بیٹی
۶۔حلیمہ	لالہ کی بیٹی
۷۔دلاور	لالہ کا بیٹا
۸۔کچھ آدمی	لالہ کے چیلے (چھ سات لوگ)

سین......۱ (جھلکیں)

بنسری کی پہاڑی دھن بجتی ہے اور پردہ اٹھتا ہے۔ایک دوشیزہ دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے اللہ سے دعا کر رہی ہے۔بیک گراؤنڈ سے گانے کی آواز آتی ہے۔

میں ہوں مانگن ہاری مولا، تو ہے دیون ہارا
تو ہی تو ہے، تو ہی دے دے، مانگے او گن ہارا

Next Cut

خوبصورت جنگل میں ایک دوشیزہ اور ایک خوبصورت جوان لڑکا بنسری کی آواز میں مست ہیں۔ دنیا کے تمام رنج و غم سے بالاتر حسین پل دکھائے جاتے ہیں۔

Next Cut

لایٹ دوبارہ آن ہوتی ہے۔ بیک گراؤنڈ سے شور و غل کی آواز اور سٹیج پہ ایک لاش رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ شور و غل کی آواز مدھم ہوتی جاتی ہے اور لایٹ آف ہو جاتی ہے۔

Next Cut

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دولہا ہے اور بارات سٹیج کے ایک طرف سے نمودار ہوتی ہے اور دوسری جانب نکل جاتی ہے۔

سین......۱

مہر بخش: (حقہ کا کش بھرتے ہوئے۔ مزاحیہ انداز میں)
ارے او جھگڑے کی مشین...... ہر وقت بک بک نہیں کیا کر۔
تیرا مہاراجوں کا خزانہ...... جو برباد ہو گیا...... بچے ہیں!! چھوٹے ہیں!...... کھیلنے دو......

نجمہ: آ...... ہا۔ہا۔ہا...... بہت لاڑلے ہیں نا؟ گھر کے برتنوں کے کھلونے بنا کر کھیلیں گے یہ......اور میں......

مہر بخش: (بات کاٹتے ہوئے) ارے او نیک بختے؟؟ (مسکراتے ہوئے) کھیلنے دے!!!......بس یہی چار دن ہیں ان کی ستیوں کے (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) بھول جائیں گے یہ بےچارے

نجمہ: (جذباتی ہو جاتی ہے) نہیں......نہیں......میرے سر کے تاج......آپ غریب نہیں۔ آپ تو اس اللہ کے پیروکار ہو......آپ کے پاس بہت بڑی دولت ہے......جو کسی کے پاس نہیں۔ وہ ہے......ایمان کی دولت۔

مہر بخش: حسرت بھری نظروں سے نجمہ کو دیکھتا ہے۔ دونوں مسکراتے ہیں۔ نجمہ اپنے دونوں بچوں کو گلے لگاتی ہے۔ مہر بخش نجمہ اور اپنے دونوں بچوں کو بانہوں میں لیتا ہے۔ بیک گراؤنڈ سے گانے کی آواز آتی ہے۔

میں ہو مانگن ہاری مولا، تو ہے دیون ہارا
تو ہی تو ہے، تو ہی دے دے، مانگے اوگن ہارا

(لائیٹ آف ہو جاتی ہے۔)

سین......۲

(تقریباً چھ سال کے وقفہ رکھ دیا گیا ہے)

نجمہ اپنے گھر کے باہر گیلے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے۔

نجمہ: نوراں۔ اے......نوراں...... بیٹی کہاں ہو تم......؟ (گلہ کرتے ہوئے) ارے کب سے بول رہی ہوں۔ ذرا آؤ میرے بالوں میں کنگھا کر دو۔

نوراں: (معصومیت والے غصہ سے) اماں؟؟ کب جان چھوٹے گی میری تمہارے ان بے کار کے بالوں سے......(غصہ میں کنگھا ہاتھ میں لیتے ہوئے) جی کرتا ہے نوچ لوں آپ کے ان بالوں کو......(غصہ سے) ہوں!! (کنگھا کرنے لگتی ہے)

نجمہ: (پیار بھری مسکراہٹ سے) ارے بیٹی...... بیٹیاں ہی اپنے ماں کے بال سنوارا کرتی ہیں......(ٹھوڑی پہ ہاتھ ہاتھ رکھتے ہوئے) میری پیاری پیاری بیٹی......؟؟ (دونوں مسکرانے لگتی ہیں اور نوراں نجمہ کو کنگھا کرنے لگتی ہے)

مہر بخش: اچانک باہر سے آتا ہے...... آؤ...... بننے سنور نے سے ابھی فارغ نہیں ہوئی ہو......اُف......کیا کہوں۔ جب دیکھو......بس۔

نجمہ: (مسکراتے ہوئے) بس ہو گیا...... یہ......نوراں بھی نا...... ہر کام میں دیر کر دیتی ہے۔

نوراں: (مسکراتے ہوئے) سچ۔ سچ......ابو جان!! بالکل سچ......امی کبھی بھی کوئی اچھا کام نہیں کرنے دیتی......کوئی نہ کوئی بھگار ہوتی ہی ہے اس اماں کی۔

مہر بخش: ہا۔ ہا۔ ہا...... مجھے لگتا ہے کہ یہ ملک الموت کو بھی کہے گی۔ ذرا مجھے تیار ہونے دو۔ ابھی میں نے کنگھا نہیں کیا۔ ایک گھنٹہ بعد آنا میری جان نکالنے (نوراں اور مہر بخش دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

نجمہ: (سر پر چادر اوڑھتے ہوئے) بیکار کی باتیں نہیں کیا کر نوراں......
جلدی چولہے میں آگ جلا...... تیرے ابو تھکے ہوئے آئے ہیں......چائے بنا کے لا۔ (نوراں چلی جاتی ہے)

نجمہ: کیا ہوا؟ نوراں کے ابو۔ لالہ جی ملے؟......کیا بولا انہوں نے؟ کچھ دیا؟؟

مہر بخش: (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) کیا بتاؤں نجمہ......بس قسمت میں ہی انتظار لکھا ہوا ہے......ایسا لگتا ہے کہ......
کارِ جہاں دراز ہے

نجمہ: آخر کہا کیا لالہ جی نے؟

مہر بخش: کہا جب تک ان کا بیٹا شہر سے واپس آجائے تب تک انتظار کرو۔ یا......یا پھر؟

نجمہ: یا پھر کیا؟ نوراں کے ابو، صاف صاف بتاؤ نا؟

مہر بخش: یا پھر میں لالہ کے گھر میں نوکر رہ جاؤں......وہ بھی پورے چار سال کے لئے۔ (بات کرتے کرتے مہر بخش کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

نجمہ: (گھبراتے ہوئے) یا اللہ...... یا اللہ...... اب کیا ہوگا۔ کیسے میرے زبیر کی پڑھائی کا انتظام ہوگا...... یا اللہ تو ہی مسبب الاسباب ہے۔

اتنے میں نوراں کی سہیلی حلیمہ جو کہ لالہ کی بیٹی ہوتی ہے وہ اندر آجاتی ہے۔

حلیمہ: السلام علیکم۔ چاچا جی۔

مہر بخش: (احتراماً کھڑا ہوتا ہے) وعلیکم السلام...... آؤ...... آؤ۔ حلیمہ آؤ...... (نوراں کو آواز دیتے ہوئے) نوراں...... اے نوراں...... بیٹا نوراں۔

ارے ادھر آؤ...... ذرا دیکھو تو...... کون آیا ہے۔

نوراں: (بھاگ کر حلیمہ کو گلے لگاتی ہے) حلیمہ مجھے آج صبح سے ہی کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کا انتظار ہے۔

دونوں ہنسنے لگتی ہیں۔

مہر بخش: (مسکراتے ہوئے) اچھا اب تو تیرا انتظار ختم ہو گیا نا؟ اب جلدی کرو اور حلیمہ کو میٹھی...... میٹھی چائے پلاؤ......

حلیمہ: ارے نہیں نہیں چاچا...... میں ابھی ابھی چائے پی کے آئی ہوں...... یوں ہی نوراں سے ملنے کو جی کر رہا تھا...... سوچا ملنے آؤں......

مہر بخش: ہاں بیٹی...... کون غریبوں کے ہاں آتا ہے...... یہ تو تمہارا بڑا پن ہے۔

حلیمہ: ارے چاچا...... ایسی باتیں نہیں کیا کرتے...... چلو کوئی نہیں ہم سب کچھ کھائیں پئیں گے...... آپ کیجئے اپنا کام......

مہر بخش: (مسکراتے ہوئے) ہاں بیٹا، ویسے بھی بزرگوں کو بچوں کی محفل میں رہنا مناسب نہیں...... اچھا میں جاتا ہوں...... جنگل سے لکڑی لانی ہے۔ تم لوگ بیٹھو...... (مسکراتے ہوئے چلا جاتا ہے)

نوراں نجمہ کے لئے چائے لے کر آتی ہے۔ دونوں چائے کے ساتھ باتیں بھی کرتی ہیں۔

حلیمہ: نوراں؟؟

نوراں: جی حلیمہ

حلیمہ: اب تو میں زبیر کے بنا ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ تم ہی بتاؤ؟ اب میں کیا کروں؟

نوراں: حلیمہ تو باولی باتیں نہیں کیا کر...... تجھے کتنی بار سمجھا چکی ہوں کہ......

حلیمہ: (بات کاٹتے ہوئے) ہاں...... بس تو اپنا وہی پرانا بے تکا جملہ دھرانے لگتی ہے...... میں ایک امیر لالہ کی بیٹی ہوں اور زبیر ایک غریب مہر بخش کا بیٹا؟

نوراں: ہاں...... مگر یہ بے تکا جملہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جسے بالآخر تسلیم کرنا تیری مجبوری ہوگی۔

حلیمہ: نوراں تو نہیں جانتی ہے اگر مجھے پیار دولت سے ہوتا تو میرا باپ صرف نام کا لالہ نہیں...... زندگی بھر کھاتی اڑاتی رہوں تو بھی بہت ہے مگر مجھے دولت سے نہیں۔ مجھے زبیر سے پیار ہے اور رہے گا۔

نوراں: حلیمہ تو نہیں جانتی ہے کہ کوئی غریب کس طرح بے مہر کالی راتوں میں دیودار کے پتوں کا بستر بنا کے آگ کے الاؤ کے سہارے اپنی راتیں گزارتا ہے...... اور تو نہیں جانتی ہے کہ زبیر ایک چرواہے کا بیٹا ہے جس کا نہ کوئی آشیانہ...... نہ رہنے کے لئے کوئی مکمل ٹھکانہ......

حلیمہ: ہاں...... ہاں...... جانتی ہوں...... مگر نوراں تو نہیں جانتی...... زبیر کا ٹھکانہ میرے دل میں ہے......

نوراں: (جذباتی ہو جاتی ہے) غریب کے چہرے کا درد محسوس کرنا بہت مشکل ہے۔ حلیمہ۔

حلیمہ: نوراں؟ سچ پوچھئے تو آج دولت جھک چکی ہے...... ایمانداری اور مفلسی میں لپٹے ہوئے ایک چرواہے کے قدموں پر۔

نوراں: حلیمہ؟ تجھے واسطہ ہے اُس اللہ کی سچی ذات کا، مہربانی کر کے زبیر کو اپنے حال پہ چھوڑ دو...... مجھ بدنصیب کے اکلوتے بھائی کو جینے دو۔

حلیمہ: (اپنے دوپٹے کا دامن پھیلاتے ہوئے) ایک مجبور اور بے بس آج تیرے سامنے پیار کی بھیک مانگ رہی ہے...... نوراں؟ یہ حلیمہ زندگی بھر تیری غلامی کا وعدہ کرتی ہے...... لیکن تو ایک بار زبیر سے اس بھکارن کے لئے پیار کی بھیک مانگ لے...... (کہتے کہتے رونے لگتی ہے۔)

(بیک گراونڈ سے گانے کی آواز)

میں ہوں مانگن ہاری مولا، تو ہے دیون ہارا
تو ہی تو ہے، تو ہی دے دے، مانگے اوگن ہارا

سین...... ۳

(بنسری کی آواز سے لایٹ آن ہوتی۔ ایک خوبصورت جنگل کے بیچ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں زبیر اور حلیمہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔)

حلیمہ: زبیر، میں آپ سے صرف محبت کی بھیک مانگ رہی ہوں۔

زبیر: حلیمہ تو نے اب تک امیری کی ٹھنڈی چھاؤں کا نظارہ دیکھا ہے۔ اس لئے تو مفلسی کی کڑکتی دھوپ کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔

حلیمہ: زبیر اگر ہو سکے تو میری محبت کو سمجھنے کی کوشش کرو...... آپ نہیں جانتے کہ مجھے مخملی کمبل سے بھی پیارے ہیں تیری محبت میں ملے ہوئے کانٹے۔

زبیر: حلیمہ؟؟

حلیمہ: (بات کاٹتے ہوئے) تجھے واسطہ ہے مفلسی میں کمائی ہوئی ایمانداری کی دولت کا، اپنی اس غلام کی محبت کو قبول کرے۔ (جذباتی ہو جاتی ہے)۔

زبیر: (سہارا لیتے ہوئے) اس کا نتیجہ تو جانتی ہے نا حلیمہ؟؟

حلیمہ: ہاں...... ہاں...... زبیر جانتی ہوں مگر!!

زبیر: (بات کاٹتے ہوئے) جلتے تندور میں چھلانگ مارنے کا نتیجہ جانتے ہوئے بھی یہ ضد کیوں؟

حلیمہ: زبیر؟ سچی محبت نے تو نارِ نمرود کو بھی گلزار کر دیا تھا۔

زبیر: یہ جنون، ہم دونوں کی زندگی کو برباد کر دے گا حلیمہ؟

حلیمہ: (بے ساختہ روتے ہوئے) اگر واقعی آپ کی زندگی میری وجہ سے خطرے میں ہے تو...... مجھے بھی قسم ہے میری سچی محبت کی......زندگی بھر آپ کی راہ میں نہ آؤں گی......(روتے ہوئے جانے لگتی ہے)

(زبیر حلیمہ کو بازو سے پکڑ کر روک لیتا ہے۔ حلیمہ کو کرنٹ سا لگتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں...... دونوں کے چہروں پہ حسرت بھری مسکراہٹ جھلکتی ہے۔)

(بیک گراؤنڈ سے گانے کی آواز)

میں ہوں مانگن ہاری مولا، تو ہے دیون ہارا
تو ہی تو ہے۔ تو ہی دے دے، میں ہوا وگن ہارا

سین......۴

(اس تمام منظر کو لالہ کے جاسوس چھپ کر دیکھتے ہیں۔ زبیر چلا جاتا ہے۔ حلیمہ کو پکڑ کر لالہ کے پاس لایا جاتا ہے۔ لالہ اپنی اکلوتی بیٹی کی اس حرکت سے آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور مہر بخش کو گرفتار کر کے لایا جاتا ہے۔)

لالہ: جب تک یہ اپنے اُس حرام خور بیٹے کو حاضر نہیں کرتا، تب تک اسے یہیں باندھے رکھو......اور اتنا مارو کہ اس کو لالہ کے ساتھ کی گئی گستاخی کا احساس ہو جائے۔

(لالہ کے چیلے مہر بخش کو بے رحمی سے مارتے ہیں)

مہر بخش: (دوہائی دیتے ہوئے) مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں جنگل میں تھا۔ میں مزدور ہوں۔ مجھے معاف کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔

حلیمہ: بابا جانی؟؟؟ (زور زور سے پکارتی ہوئی اور بھاگتی ہوئی آتی ہے) بابا جانی......اسے نہ مارو......اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔

لالہ: حلیمہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے۔ خاموش...... بے حیا......دور ہو جا میری نظروں سے۔

حلیمہ: بابا جانی......بابا جانی......میری بات تو سنو......

لالہ: خبردار......اگر وکالت کی کوشش کی۔ میں تیری زبان کھینچ لوں گا......تو نے میری عزت کو پاؤں تلے روندا ہے۔

حلیمہ: (لالہ کے پاؤں پڑھتے ہوئے) بابا جانی......آپ کو اپنے ایمان کی قسم، میری بات تو سنو......

لالہ: بول کیا میری پگڑی کو اتارنا چاہتی ہے تو......اسی لئے تجھے میں نے اتنے پیار سے پالا تھا۔

حلیمہ: نہیں نہیں۔ بابا جانی......میں قربان ہو جاؤں آپ کی شان کے۔ آپ یقین کیجئے......آپ کی یہ بیٹی آپ کی عزت کی محافظ ہے۔

لالہ: اچھا بول......کیا کہنا چاہتے ہے تو؟

حلیمہ: بابا جانی...... پہلے آپ مہر بخش چاچا کو کھولو......اسے چھوڑ دو۔ آپ کو زبیر چاہیئے نا؟ میں وعدہ کرتی ہوں......زبیر کو میں حاضر کروں گی۔

لالہ: (خطرناک نظروں سے سب کی طرف دیکھتے ہوئے) چلو!! کھول دو اس کے ہاتھ۔ (سبھی لوگ حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)۔

حلیمہ: بابا جانی......اب میں اکیلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

لالہ: سبھی لوگوں کو جانے کا اشارہ کرتے ہیں۔ سبھی لوگ چلے جاتے ہیں۔ لالہ اور حلیمہ اکیلے رہ جاتے ہیں

حلیمہ: ایک چھری نکال کر لالہ کو دیتے ہوئے۔

بابا جانی؟ یہ لو...... آپ کی یہ گستاخ بیٹی...... اپنی گستاخی کی سزا پانے کو اپنے باپ کے قدموں میں حاضر ہے......

لالہ کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے۔

حلیمہ: بابا جانی......؟ ایک طرف آپ کی بے شمار دولت کے سائے میں پلنے والی آپ کی غیرت...... اور...... دوسری طرف آپ کی اس بدنصیب بیٹی کا پیار؟...... میں ہی نہیں...... سارا عالم جانتا ہے۔ اس زمانہ کی دولت کے سامنے سچا پیار بے بس ہوتا ہے۔ لیکن...... ہاں......... بابا جانی...... جھکنا آپ کی زندگی کا مقصد نہیں...... اور...... اور...... ٹوٹنا میرے پیار کا......

لالہ: (بات کاٹتے ہوئے) کیا مطلب ہے تمہارا......؟ کیا میں اپنی عزت......

حلیمہ: (بات کاٹتے ہوئے) میں حاضر ہوں آپ کے قدموں میں اور چھری آپ کے ہاتھوں...... بچالو...... بابا جانی...... بچالو اپنی عزت کو۔

لالہ: سوچ لو...... کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔؟؟؟

حلیمہ: جی، بابا جانی...... مگر ایک شرط پہ۔

لالہ: کون سی شرط۔

حلیمہ: میری یہ قربانی میرے سچے پیار کی خاطر ہے...... اس لئے میرے مرنے کے بعد آپ زبیر اور اُس کے کنبہ پہ کوئی ظلم نہیں کریں گے...... ورنہ...... ورنہ میں قیامت کے دن اللہ کی بارگاہ میں آپ سے پوچھوں گی......

لالہ: (ٹھنڈی آہ بھر کر پریشانی کی حالت میں ٹہلنے لگتا ہے۔)

خاموشی توڑتے ہوئے......میں بھی تیرے پیار کی خاطر قربانی دے سکتا ہوں۔مگر......میری بھی ایک شرط ہے۔

حلیمہ: جی، بابا جانی؟؟

لالہ: میں تیری خاطر زبیر اوراس کے کنبہ کے لئے سب کچھ کروں گا۔تمام آرائشیں مہیا کرواؤں گا......مگر شرط یہ ہے کہ تو زبیر کو بھول جائے گی......

حلیمہ پہ جیسے آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔

لالہ: ورنہ......میں زبیر کے خاندان کے ایک ایک شخص کو چن چن کے ماروں گا اور کتے اور چیلوں کے سامنے پھینک دوں گا۔

حلیمہ: (آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔گلا بھر آتا ہے) ہاں......اگر زبیر مصیبتوں سے بچ جائے تو...... میں جی لوں گی......سل پتھر بن جاؤں گی......قربان کردوں گی اپنی خواہش......مگر زبیر......(......کہتے کہتے رونے لگتی ہے)

لالہ: بول......کیا مانگنا چاہتی ہے......جو مانگنا ہے مانگ لے......

حلیمہ: روتے روتے مہر بخش کے کنبہ کی خیر......اور......اور......دس ہزار روپے زبیر کی پڑھائی کی خاطر......

لالہ اپنی جیب سے پچاس ہزار نکال کر کہتا ہے......

لالہ: دس نہیں...... پچاس ہزار......میں اپنی لاڈلی بیٹی کی خاطر دے رہا ہوں......

حلیمہ پیسوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے۔دعائیہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھتی ہے......

(بیک گراؤنڈ سے گانے کی آواز)

میں ہوں مانگن ہاری مولا، تو ہے دیون ہارا

تو ہی تو ہے، تو ہی دے دے، میں ہوا دگن ہارا

سین ۵

لالہ اور اُس کے لوگ باتیں کرر ہے ہیں۔

لالہ: دیکھئے حلیمہ نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی زبیر سے نہیں ملے گی اور مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی مجھ سے وعدہ خلافی نہیں کرے گی۔

ایک آدمی: حضور یہ بالکل سچ ہے۔ اس آدمی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ سارے ماجرے کا چشم دید گواہ ہے۔

لالہ: (اُس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا یہ سچ ہے؟

آدمی: جی......جی حضور......یہ سچ ہے......

لالہ: کیا دیکھا تو نے اور کہاں۔

آدمی: جی۔جی۔وہ۔وہ۔حلیمہ......آپا اور زبیر وہاں......

(Flash Back)

حلیمہ: زبیر، تم پر یہ پینٹ کوٹ کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔

زبیر: جی۔حلیمہ۔مگر......

حلیمہ: اگر مگر کچھ نہیں......سیدھا شہر چلے جاؤ اور پڑھائی مکمل کر کے لوٹنا......یہ لو پچاس ہزار روپے۔تمہاری تعلیم کا خرچہ......

زبیر: (حیران ہوتے ہوئے) یہ...... یہ...... اتنے پیسے؟ تم مجھے کیوں...... دے رہی ہو......اور لائے کہاں سے۔

حلیمہ: (بات کاٹتے ہوئے) زبیر کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا۔

زبیر: (مسکراتے ہوئے) ہاں !! کوئی شک؟

حلیمہ: (جذباتی ہو کر) تو......تم کو قسم ہے اپنی محبت کی......میں نے کسی سے وعدہ کیا ہے......میرے وعدہ کو وفا کرنا......(کہتے کہتے رونے لگتی ہے)

زبیر: حلیمہ......رو ؤ نہیں......آج میں تم کو روتے ہوئے چھوڑ کر شہر نہیں جانا چاہتا......میں وعدہ کرتا ہوں کے جو کہو گی وہی کروں گا۔ مگر مسکرا کے مجھ کو الوداع کہو......اور بتاؤ کیا وعدہ ہے۔

حلیمہ: (اپنے دکھ پہ ضبط کرتے ہوئے) بس مجھے یاد نہیں کرنا......اور اپنی پڑھائی پہ دھیان دینا......(زبیر حلیمہ سے اجازت لے کر چلا جاتا ہے) حلیمہ دور تک زبیر کو دیکھتی ہے۔

Flash Back Off

لالہ: (آگ بگولہ ہو کر)......اچھا؟؟؟ تو یہ بات ہے؟؟؟ اس کا مطلب کہ حلیمہ پیٹھ پیچھے مجھے دھوکہ دے رہی ہے اور سچ چھپانا چاہتی ہے اور زبیر بھی میری دولت کے چکر میں ہمیں دھوکہ دینے پہ ہی تلا ہی ہوا ہے......(چلاتے ہوئے)

بہت کوشش کی تھی کہ ایک بد بخت غریب کی جان بچ جائے۔

لالہ: (اپنے چیلوں سے مخاطب ہوتے ہوئے)

جاؤ ؤ و......جاؤ......اُس حرام زادے کو شہر پہنچنے سے پہلے پہلے پکڑو......اور جان سے ماردو......تاکہ مہر بخش سمجھے کے اس کا بیٹا شہر میں پڑھائی کر رہا ہے......اور اُسے دفن کردو۔

سارے آدمی: بالکل......بالکل......حکم کی تعمیل ہوگی، حضور۔

سارے لوگ غصہ میں بھاگتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

سین......٦

(زبیر ایک جنگل والے راستے سے شہر کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ راستے میں اُسے لالہ کا بیٹا اور اُس کا دوست ملتے ہیں جو کہ نہایت بگڑے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔

وہ زبیر کو اتنے اچھے ڈریس میں دیکھ کر برداشت نہیں کرتے......اور زبیر کے کپڑے زبردستی اتار کر لالہ کا بیٹا خود پہن لیتا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ زبیر کو یہ کپڑے اُسی کی بہن حلیمہ نے تحفہ میں دیئے ہیں۔

سین......۷

لالہ کے آدمی جنگل میں گھات لگا کر زبیر کو مارنے کے لئے چھپے ہوتے ہوئے ہیں۔ادھر سے لالہ کا بیٹا دلاور زبیر کے کپڑے پہنے ہوئے آرہا ہوتا ہے۔

ایک: ارے آگیا۔ آگیا...... وہ دیکھو...... (دھیرے دھیرے اپنے ساتھیوں سے بات کرتا ہے)۔

دوسرا: (دبی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے) بڑا (Suited Booted) ہے......جیسے لالہ کا بیٹا یہی ہے۔

تب تک دلاور نزدیک آجاتا ہے۔ سبھی لوگ دیوانہ وار دلاور پہ حملہ کر کے ڈھیر کر دیتے ہیں۔ جب وہ مر جاتا ہے تو سبھی دیوانہ وار قہقہے لگا کر ہنسنے لگتے ہیں۔

ایک آدمی غور سے لاش کے چہرے پہ غور کرتا ہے......

ارے......ارے...... مارے گئے......ہم تو لٹ گئے......(دونوں ہاتھ سر میں مارتے ہوئے رونے لگتا ہے)

دوسرا: ارے کیا ہوا؟ (حیرانگی کے ساتھ)۔

آدمی: ارے...... بدنصیبو غور سے دیکھو...... ہم نے زبیر کو نہیں......دلاور کو مار دیا ہے......

(سبھی غور سے دیکھتے ہیں......)

سبھی لوگ: اب؟؟ اب کیا کریں؟

آدمی: ارے لاش چھپا دو......اور بولنا کہ ہم نے زبیر ہی کو مارا ہے۔ وہ ویسے بھی کئی سالوں تک شہر سے لوٹنے والا نہیں۔ تب تک بات پرانی ہو جائے گی۔

سبھی لوگ: بالکل...... بالکل...... ایسا ہی کرو۔

سبھی لوگ لاش کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

لالہ مہر بخش کے گھر میں۔

لالہ: دیکھ مہر بخش...... میں زیادہ باتیں نہیں کرتا...... تیرا بیٹا تبھی شہر گیا ہے جب اُس نے پچاس ہزار روپے مجھ سے لئے تھے۔ اب زیادہ باتیں مت کر......

مہر بخش: (ہاتھ جوڑتے ہوئے) جی۔ حضور...... مگر مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جب زبیر پڑھائی مکمل کر کے آئے گا تو ضرور لوٹا دے گا......

لالہ: (قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے) وہ...... وہ اب قیامت کو آئے گا۔

مہر بخش: لالہ جی...... انشاءاللہ وہ ضرور آئے گا...... ضرور آئے گا۔

لالہ: فالتو بکواس بند کر...... یا میرے پچاس ہزار روپے نکال یا اپنی بیٹی کو میرے حوالے کر دے...... بس!!!

نوراں: (سر سے دوپٹہ اٹھا کر لالہ کے پاؤں میں ڈالتے ہوئے۔)

لالہ...... جی...... آپ کو اللہ کی ذات کا واسطہ، ہم پہ یہ ظلم نہ کرو۔

لالہ: (غرور کے ساتھ پاؤں سے دوپٹہ کو ہٹاتے ہوئے) بند کرو یہ مگر مچھ کے آنسو...... بول مہر بخش...... کیا کرنا ہے۔

مہر بخش: (اپنے سر سے پگڑی اتار کر لالہ کے پاؤں میں ڈالتے ہوئے)

ہمیں...... مہلت دو۔ معاف کر دو۔

لالہ: (گرجتی آواز میں) پکڑو اس مہر بخش کو اور مارو...... اتنا مارو کے یہ اپنی لاڈلی بیٹی کو خود بلائے...... اور میرے حوالے کر دے۔

سبھی لوگ: (مہر بخش کو باندھتے ہیں) مارنے لگتے ہیں۔ اتنے میں مہر بخش کی بیٹی نوراں خونخوار شیرنی کی طرح گرجتی ہوئی سامنے آتی ہے۔

نوراں: رک جاؤ؟؟ بھیڑیئے...... (اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر سامنے آجاتی ہے)۔

نوراں: لالہ؟؟؟...... ہوس کے بھوکے...... خونخوار بھیڑیئے...... حرام کی دولت کے اندھے...... (چھاتی تان کے لالہ کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے)

یہ لے...... ایک غریب باپ کی بے بس بیٹی اپنے مظلوم باپ کی خاطر...... اپنی جان کی قربانی دینے کو حاضر ہے۔ (لالہ کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے۔)

بے غیرت انسان؟؟ چل، لے جا مجھے...... میں تیار ہوں...... مگر یہ یاد رکھنا ۱۰ سال ہو گئے زبیر کو شہر گئے ہوئے...... اور دس سال سے تو میرے غریب باپ پہ ظلم کر رہا ہے......

اتنے میں حلیمہ ایک نقاب پوش پولیس آفیسر کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔

حلیمہ: لالہ......؟؟

لالہ: (حیرانگی کے ساتھ)...... حلیمہ؟؟؟ بیٹی تو یہ کیسی بہکی باتیں کر رہی ہو...... میں آپ کا بابا جانی ہوں...... لالہ نہیں۔

حلیمہ: (غراتے ہوئے) کوئی بابا جانی نہیں...... شرم آتی ہے مجھے...... تیرے جیسے ظالم انسان کو اپنا باپ کہتے ہوئے۔

(سارے لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔)

حلیمہ: (نوراں کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر دلاسہ دیتے ہوئے)

نوراں...... اللہ نے تیری مصیبتوں کو ختم کر دیا ہے...... جھوٹ کے بل بوتے پہ چلنے والا ظلم آخر انتہا کو پہنچتا ہے...... آخر سچ کی جیت ہوتی ہے......

لالہ: (غصہ میں) تو کیا بکواس کر رہی ہے۔ حلیمہ؟؟

حلیمہ: لالہ؟؟...... خدا کے قانون سے تجھے خوف نہیں آیا۔ اب...... (انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تیرے سامنے کھڑی ہے تیری موت......

لالہ: (ڈرتے ہوئے) یہ...... یہ...... کو...... کو...... کون؟

حلیمہ: یہ میری زندگی اور تیری موت...... (انسپکٹر کے منہ سے نقاب اٹھاتے ہوئے) نام ہے...... ان کا زبیر......

(لالہ پاگل سا ہو جاتا ہے......)

لالہ: مگر...... مگر...... زبیر تو؟؟...... وہ...... وہ......؟

حلیمہ: ہاں...... ہاں...... زبیر کو تو آپ نے قتل کروادیا تھا...... یہی نا؟؟

لالہ: (گھبراتے ہوئے) ہاں...... نہیں...... نہیں...... میرا مطلب ہے وہ مر گیا تھا......

حلیمہ: (لالہ کے ایک چیلے کو پکڑ کر سامنے لاتے ہوئے)

پوچھ اُسے...... وہ زبیر نہیں...... بلکہ...... تیرا بیٹا تھا...... تو نے دولت کے نشے میں اپنے ہی بیٹے کو قتل کروایا تھا۔

نوراں اور مہر بخش زبیر کے گلے سے لپٹ جاتے ہیں۔ لالہ زبیر کے پاؤں پڑ جاتا ہے۔

...........☆☆☆...........

☆......عارض ارشاد

ریڈیائی ڈرامہ

آخری ثبوت

فہرست کردار

نام	عمر
۱۔نوید	۲۵سے ۳۰سال
۲۔سمیر	۲۵سے ۳۰سال
۳۔برہان	۲۵سے ۳۰سال
۴۔انسپکٹر	۴۰سے ۴۵سال
۵۔حوالدار	۳۵سے ۴۰سال
۶۔جاوید	۳۵سے ۴۰سال
۷۔نجمہ	۴۰سے ۴۵سال
۸۔عرفان	۲۵سے ۳۰سال

سین ۱

(سین کا آغاز ایسے میوزک پیس کے ساتھ جس سے سنجیدہ ماحول کا تاثر پیدا ہو......میوزک پیس fade out ہوتے ہوئے اور پھر رات کا سماں...... مختلف کیڑوں کی آوازیں پسِ منظر میں)

انسپکٹر: حوالدار

حوالدار: جی انسپکٹر صاحب

انسپکٹر: کیا لگتا ہے تمہیں، کون ہوسکتا ہے ان ساری واردات کے پیچھے؟

حوالدار: جناب......میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا......مگر جو کوئی بھی ہے، کم بخت نے جینا حرام کرر کھا ہے......

انسپکٹر: صحیح کہا تم نے......ایسا کیس اپنے پورے career میں نہیں دیکھا ہے میں نے......تھک چکا ہوں میں اپنے seniors کو جواب دے دے کر...... پچھلے پورے دو سالوں سے اس کیس میں الجھا ہوا ہوں......

حوالدار: صاحب آپ مایوس نہ ہوں......

انسپکٹر: مایوس......! میں مایوس نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ میری مایوسی میں ان مجرموں کی جیت ہے...... ہاں مگر کسی حد تک پریشان ضرور ہوں کیونکہ اس کیس نے ڈپارٹمنٹ میں میرا وقار، میری قابلیت، میرا رتبہ......سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔۔

حوالدار: جناب، میں آپ کی بات سمجھتا ہوں......آپ اطمینان رکھیئے......آج وہ لوگ یہاں سے بچ کر نہیں جاسکتے...... بس آپ دعا کیجئے کہ ہمیں جو خبر ملی ہے اور جس کی وجہ سے ہم اتنی رات کو اس سنسان راستے پر گھپ اندھیرے میں ان جھاڑیوں کے پیچھے گھات لگائے بیٹھے ہیں، وہ سچ ہو......

انسپکٹر: امید تو......

(گاڑی کی آواز......دور سے نزدیک آتی ہوئی)

حوالدار: (دبی دبی آواز میں) صاحب لگتا ہے ہمارے صبر کا پھل ملنے والا ہے......

انسپکٹر: او۔ فوووو! کام پہ دھیان دو...... یہ وہی گاڑی معلوم ہوتی ہے...... تیزی سے اسی طرف آ رہی ہے......آ آ...... یہ کیا...... آ...... نمبر......آ......آ...... ہاں...... بالکل......نمبر بھی گاڑی کا وہی ہے......حوالدار!!! جلدی......کیلیں پھینکو راستے پر......

(کیلوں کی آواز اور پھر گاڑی کے ٹائر پنکچر ہونے کی اور گاڑی کے رکنے کی آواز)

انسپکٹر: حوالدار، جلدی چلو انہیں دبوچ لیتے ہیں......

(اختتامی موسیقی)

change over

سین......۲

(قدموں کی آواز مدھم سے تیز ہوتی ہوئی......پھر پولیس انسپکٹر کے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز......کرسی کھسکانے کی اور بیٹھنے کی آواز)

انسپکٹر: (آہ بھرتے ہوئے) بہت......! بہت شاطر ہیں یہ تینوں۔

حوالدار: صاحب، بجا فرما رہے ہیں آپ......سارے آزمائے ہوئے پینترے ناکام ہو گئے......وہ تینوں تو اپنا جرم ماننے کو تیار ہی نہیں اور دیکھا نہیں آپ نے نوید نام کے مجرم نے کس طرح بے باکی سے ہماری ساری تحقیقات کو بے معنی قرار دیا......

انسپکٹر: (غصے سے) ہاں! ہاں! حوالدار دیکھا میں نے! دیکھا میں نے کہ کس طرح ان تینوں نے ہماری دو سالوں کی کڑی محنت پہ سوالیہ نشان کھڑے کر دیئے...... ان کی وہ ہنسی اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے......

(ایسا میوزک پیس جس سے flash back آنے کا پتہ چلے)

سین......۳

نوید:

سمیر: (تینوں ایک ساتھ) ہاہاہاہا......ہاہاہاہا

برہان:

انسپکٹر: Oh! shut up! فضول ہنسنا بند کرو......تم لوگوں کو اپنے جرم کی سنجیدگی کا کچھ احساس نہیں......تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنا جرم قبول کرلو......

نوید: جرم! ہاہاہا......کون سا جرم......کس جرم کی بات کر رہے ہیں آپ؟

انسپکٹر: نوید میں اس جرم کی بات کر رہا ہوں جس کے یہ ثبوت سامنے اس ٹیبل پر پڑے ہیں......

سمیر: انسپکٹر صاحب ان کاغذ کے چند ٹکڑوں کو آپ ثبوت کہتے ہیں......آخر ہیں کیا یہ......کچھ bank accounts اور کچھ phone numbers کی details ......ان سے ہمیں مجرم ثابت نہیں کیا جا سکتا......اتنا قانون تو ہم بھی جانتے ہیں......ہاہاہا......ہاہاہا

انسپکٹر: ہاہاہا......ہاہاہا......سمیر......جانے کس خوش فہمی کے شکار ہو تم......یہ سارے Document تم تینوں کے ناموں سے منسوب ہیں۔

برہان: ہوں گے......مگر آج کے digital اور technological دور میں کسی کے نام پہ یہ ساری چیزیں بنوانا کوئی بڑی بات نہیں......

انسپکٹر: مگر......ہمہ......آ......کیا نام ہے تمہارا!

برہان: برہان نام ہے میرا......

انسپکٹر: ہاں وہی......برہان......تمہیں یہ تو پتہ ہی ہوگا کہ بنک Account تب تک نہیں کھلتا ہے جب تک کہ Customer خود موجود نہ ہو......اور ایسا ہی Procedure فون کا Sim نکالنے کے لئے بھی ہے......اس لئے یہ ثبوت تم لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لئے کافی ہیں......

نوید: ہاہاہا......یہ کافی نہیں ہیں انسپکٹر صاحب......آج کے دور میں پیسہ سب کچھ ہے، پیسے سے کچھ بھی ہوسکتا ہے اور جن کو آپ ثبوت کہتے ہیں ایسی چیزیں پیسے سے بہ آسانی بنوائی جاسکتی ہیں اور ہمارے لئے یہ ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ سمیر نے خود بھی وکالت میں ڈگری حاصل کی ہے۔

سمیر: بالکل......اور اپنے Batch کا Topper بھی رہا ہوں......

انسپکٹر: او! اب میں سمجھا کہ تم لوگ اتنا کیوں اچھل رہے ہو......کوئی بات نہیں......تم لوگوں کی باتیں سن کر مجھے یہ تو یقین ہو چکا ہے کہ تم تینوں ہی مجرم ہو......

نوید: آپ کے یقین یا شک پہ قانون فیصلے نہیں کرتا......قانون کو ثبوت چاہئیے اور وہ بھی پختہ......

انسپکٹر: صحیح کہا تم نے نوید، مگر اس کمپیوٹر کے بارے میں کیا خیال ہے تمھارا جو ہمیں تم لوگوں کے ٹھکانے سے برآمد ہوا ہے؟

(فون کے بجنے کی آواز)

انسپکٹر: یہ لو ہمارے Expert کا فون بھی بالکل صحیح وقت پہ آ گیا......

Hello ہاں جاوید بولو۔

جاوید: سر جو Computer آپ نے بھجوایا تھا اس کا Password Crack کرنے میں ہم کامیاب رہے......

انسپکٹر: Good, very good

جاوید: مگر سر!

انسپکٹر: مگر، مگر کیا؟ جلدی بتاؤ

جاوید: مگر سر Password کو Crack کرتے ہی System نے دوسرا Password مانگا...... اس کو جب ہم نے crack کرنے کی کوشش کی تو System کی Hard drive crash ہوگئی......

انسپکٹر: کیا! Oh no!......Hard Drive Crash!

نوید: کیوں انسپکٹر صاحب مل گیا آپ کو اپنے سوال کا جواب...... ہاہاہا...... میں ایک Software Engineer ہوں...... اپنے Data کو ضرورت پڑنے پر Destroy کرنا بھی جانتا ہوں......اور کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟

(نوید، سمیر اور برہان کے ہنسنے کی آواز)

(scene number 2 resumes again with same characters)

(ہنسنے کی آواز دھیمی ہوتی ہوئی)

حوالدار: صاحب، صاحب

انسپکٹر: ہاں...... ہاں

حوالدار: کن خیالوں میں کھو گئے تھے آپ......

انسپکٹر: (آہ بھرتے ہوئے) یہی سوچ رہا ہوں کہ ان تینوں کا جرم ثابت کریں تو کیسے کریں......

حوالدار: صاحب...... مجھے پورا بھروسہ ہے آپ کی قابلیت پر......

انسپکٹر: شکریہ تمہارا......تم ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھاتے ہو......وہ شاطر ہیں تو کیا ہوا، آخر ہیں تو مجرم ہی......ہم بھی ہار نہیں مان سکتے......

حوالدار: صاحب چھوٹا منہ بڑی بات، بچپن میں ایک کہانی سنی تھی چار بھائیوں کی......

انسپکٹر: ہاہاہا...... یہاں ہم ایک سنجیدہ Case کی بات کر رہے ہیں اور تم کہانیوں کی دنیا کی سیر کرنے نکلے ہو......

حوالدار: نہیں نہیں صاحب۔۔میرے ایسا کہنے کا مقصد کچھ اور ہے......

انسپکٹر: اچھا اچھا! بولو تم کیا کہنا چاہتے ہو......

حوالدار: صاحب اس کہانی کے مطابق اتحاد میں طاقت ہے......

انسپکٹر: تو اس میں انوکھی بات کیا ہے۔ یہ تو ہم بھی اپنے بچپن سے سنتے آئے ہیں بلکہ یہ تو زندگی کی ایک نمایاں حقیقت ہے...... مگر اس بات کا اس کیس کے ساتھ کیا تعلق ہے بھلا!

حوالدار: تعلق ہے صاحب...... کیا آپ نے ان تینوں کا اتفاق نہیں دیکھا۔ آپ کے ہر سوال پر......

انسپکٹر: تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟

حوالدار: صاحب...... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک وہ ایک ساتھ ہیں......

انسپکٹر: واہ! حوالدار، واہ! تم نے میرے ذہن کے دریچے کھول دیئے اور میری سوچ کا دائرہ اور بھی وسیع کر دیا۔

(اختتامی موسیقی)

change over

سین......۴

(آغاز میں Suspense سے بھرا میوزک پیس جو کہ ڈائیلاگ شروع ہوتے ہی پسِ منظر میں جاری رہے گا)

برہان: نوید، مجھے نہ جانے کیوں ایک عجیب سا ڈر کھائے جا رہا ہے۔

نوید: گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں برہان، ہم نے سب کچھ اتنی صفائی سے کیا ہے کہ ہمارا کوئی بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔

سمیر: ہاہاہا......اور وہ قانون سے ہمیں ڈرانے کی کوشش کرنے والا بے چارہ انسپکٹر خود ہی ہمیں چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائے گا۔

نوید: ہاہاہاہا......

برہان: وہ سب تو ٹھیک ہے مگر تم لوگ اس انسپکٹر کو کم آنکنے کی غلطی مت کرو......جس طرح سے وہ اس Investigation Room سے چلا گیا، مجھے نہیں لگتا کہ چھان بین میں وہ کسی بھی طرح کی کوتاہی برتے گا......

سمیر: برہان مجھے لگتا ہے کہ تم اس انسپکٹر کی تعریف کی آڑ میں دراصل اپنی بزدلی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے ہو......ہاہاہا

برہان: ایسا نہیں ہے دوستو میں تو......

نوید: ٹھیک کہا سمیر نے......تم بزدل ہو...... بزدل......وہ انسپکٹر چاہے زمین آسمان ایک کردے مگر اس کے ہاتھ کبھی بھی ہمارے گریبانوں تک نہیں پہنچ سکتے......

برہان: اگر واقعی ایسا ہوتا تو آج ہم یہاں قید نہیں ہوتے......

نوید: تم شاید صحیح ہو۔ یہاں اس قید خانے میں ہم پہنچے تو اسی انسپکٹر کی وجہ سے مگر......

سمیر: مگر......مگر کیا

نوید: مگر اس سب میں مجھے اس کی قابلیت نہیں بلکہ کہیں نہ کہیں اپنی کوتاہی معلوم ہوتی ہے......

سمیر: اور ویسے بھی ہم کو گرفتار کر کے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے اپنے ہاتھ قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں......ہاہاہا......ہمیں مجرم ثابت کرانے کے لئے اس کو ٹھوس ثبوت چاہیئے......اور ویسے ثبوت ملنے کا تو سوال ہی نہیں......ہاہاہا......کیونکہ......

برہان: کیونکہ کیا؟

نوید: کیونکہ ہم نے ایسا کوئی بھی ثبوت چھوڑا ہی نہیں...... ہاہاہا

سمیر: ہاہاہا

برہان: ہاہاہا

(Background Music پسِ منظر سے پیشِ منظر میں اور ساتھ ہی سین کا اختتام)

Change Over

سین...... ۵

(سین کا ابتدائی میوزک پیس)

برہان: انسپکٹر صاحب ایسا نہیں ہوسکتا...... کسی بھی صورت میں...... نہیں ہوسکتا...... میں اپنے دوستوں کے ساتھ غداری نہیں کرسکتا......

انسپکٹر: برہان، تم نے میری بات کو غلط سمجھا ہے...... میں تمہیں ان سے غداری کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا بلکہ تمہیں اپنی زندگی کو سدھارنے کا ایک سنہرا موقع دے رہا ہوں...... بات سمجھنے کی ہے ایسا کرنے سے تم اپنے دوستوں کی بھی مدد ہی کروگے۔

برہان: وہ کیسے؟

انسپکٹر: وہ ایسے کہ انہیں بھی سدھرنے کا موقع ملے گا ورنہ وہ جرم کی دلدل میں اتنا ڈوب جائیں گے کہ ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا......

برہان: مگر......

انسپکٹر: اگر مگر کچھ نہیں...... تمہیں یہ...... منظور ہے تو بولو ورنہ ہم اُن دونوں میں سے کسی اور کو یہ offer دے دیں گے اور تم جیل کی چاردیواری میں پچھتاتے رہوگے کہ کاش اس موقع کا میں نے فائدہ اٹھایا ہوتا......

برہان: مجھے سوچنے کا تھوڑا وقت دیجئے......

انسپکٹر: کم بخت وقت ہی تو نہیں ہے ہمارے پاس......حوالدار......

حوالدار: جی صاحب

انسپکٹر: لے جاؤ اسے......شاید اس کے مقدر میں قید خانے کی سختیاں ہی لکھی ہیں...... ہم تو اس بے وقوف کو بچنے کا موقع دے رہے تھے......

برہان: ا......بہ......بہ......مہ

حوالدار: چلو چلو یہاں سے......

برہان: ا...... ا...... اے...... ایک......ایک منٹ حوالدار جی...... میری بات تو سنیے......انسپکٹر صاحب......

انسپکٹر: (خود کلامی) لگتا ہے کہ اب جا کے تیر صحیح نشانے پہ لگا......

برہان: انسپکٹر صاحب......میری بات تو سنیے

انسپکٹر: ا......آ......رک جاؤ حوالدار......

بکو جلدی......

برہان: میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوں لیکن میں کیسے مان لوں کہ آپ مجھے چھوڑ دیں گے......

انسپکٹر: وہ دیکھنا میرا کام ہے......ویسے بھی offer میرا ہے اس لئے شرطیں بھی میری ہی ہوں گی......تمہیں منظور ہے تو بیٹھ جاؤ، نہیں تو تم جا سکتے ہو......

برہان: ٹھیک ہے......میرے پاس کوئی اور راستہ بھی تو نہیں بچا ہے......

انسپکٹر: تو بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کہ اتنی بڑی ہیرا پھیری کرنے کا خیال تم لوگوں کو آیا کہاں سے......

برہان: انسپکٹر صاحب کالج کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد ان دونوں نے University میں داخلہ لے لیا مگر گھریلو پسماندگی کی وجہ سے میں نے نوکری کی تلاش شروع کی۔اس طرح سے ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔وہ پڑھائی میں مشغول رہے اور میں تلاش روزگار میں۔

پھر آج سے تقریباً دو سال پہلے، میں اپنی پریشانیوں کے بوجھ کو لادے ہوئے کہیں جا رہا تھا کہ اسی وقت......

(Flash back آنے کا میوزک)

سین......٦

(کسی راستے کا منظر......گاڑیوں کا شور......Horn بجنے کی آوازیں......اسی کے ساتھ کار کے بریک کی زوردار آواز......پھر گاڑی کے دروازے کھلنے کی آواز)

نوید: ارے مرنے کے لئے ہماری ہی گاڑی ملی تھی تجھے......

برہان: معاف کرنا بھائی دراصل ٹھوکر لگنے سے تمہاری گاڑی کی طرف......

سمیر: ارے، برہان...... یہ تم ہی ہو نا

برہان: سمیر......نوید......تم دونوں!

نوید: ہاں بھئی ہاں......ہم دونوں

(گاڑیوں کی مختلف ہارنوں کی آوازیں مسلسل)

سمیر: ارے......ارے دیکھو سارا Traffic رک گیا......اس سے پہلے کہ لوگ اتر کر ہماری حجامت بنا دے، چلو یہاں سے۔

نوید: ہاں ہاں چلو جلدی...... برہان تم بھی آجاؤ۔ راستے میں بات بھی ہو جائے گی اور پھر تمہیں گھر بھی Drop کر دیں گے

برہان: ٹھیک ہے بھئی چلو......

(گاڑی کے دروازے بند ہونے کی آواز......گاڑی start ہونے کی اور چلنے کی آواز......اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی موسیقی......
موسیقی کے اختتام پر پھر سے گاڑی کے رکنے کی آواز......پھر بند ہونے کی آواز)

نوید: ہمہ!! تو یہ بات ہے......اس کا مطلب یہ ہوا کہ جستجوئے روزگار نے تمہارا حال بُرا کر کے رکھا ہے

برہان: صحیح سمجھے تم نوید...... مگر تم لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ کافی اچھی نوکریاں پا گئے ہو......

سمیر: ہاہاہاہا

نوید: ہاہاہاہا

سمیر: نوکریاں نہیں پا گئے بس یوں سمجھ لو کہ مال بنانے کا ہنر سیکھ گئے ہیں......

برہان: میں کچھ سمجھا نہیں!

نوید: سمجھ جاؤ گے، دھیرے دھیرے...... ہاہاہا

سمیر: ہاہاہا...... یہ...... یہ لو...... یہ پتہ لے لو...... کل شام کو اس Address پہ آ جانا......

برہان: مگر وہاں کیا ہے؟

نوید: تمہاری تقدیر کے بند دروازوں کی چابیاں...... ہاہاہاہاہا

سمیر: ہاہاہاہاہاہا

(اختتامی موسیقی)

Change Over

سین......۷

(دروازہ کھلنے کی آواز اور پھر بند ہونے کی آواز)

برہان: یار سمیر...... یہ جگہ تو کسی Science Fiction Movie کے Set جیسی ہے......
کیا کہتے ہیں اس کو...... انہ...... ہمہ......
ہاں...... یاد آیا Command Centre...... ہاہاہا

نوید: ہاہاہاہا

سمیر: ہاہاہاہا...... چلو بھئی اب کچھ کام کی بات کرتے ہیں...... برہان، دراصل ہم یہاں رات کو کام کرتے ہیں کیونکہ ہمارے Client یورپ میں رہتے ہیں جہاں اس وقت دن ہوتا ہے......

برہان: مگر تم انہیں بیچتے کیا ہو؟

نوید: ہم انہیں Online سروس پروائڈ کرتے ہیں۔

برہان: میں کچھ سمجھا نہیں۔

نوید: دراصل وہ لوگ Internet کے دیوانے ہیں اور اسی چیز کا فائدہ اٹھا کر ہم مختلف Viral Programme بناتے ہیں اور Internet پر ڈال دیتے ہیں ......ایسی فائل جب کوئی download کرتا ہے تو وہ virus اس کے Gadget میں خرابی پیدا کر دیتا ہے جس کا علاج صرف ہمارے پاس ہوتا ہے......اور......

برہان: اور تم اس خرابی کو دور کرنے کے لئے اس کا توڑ انہیں بیچتے ہو......مگر تمہیں نہیں لگتا کہ یہ Illegal ہے......

سمیر: لگتا نہیں ہے میرے بھائی...... جانتے ہیں کہ یہ غیر قانونی کام ہے......مگر دولت کمانے کے لئے risk تو اٹھانا ہی پڑتا ہے......

نوید: اور ویسے بھی تمہاری طرح در در کی ٹھوکریں کھانے سے تو بہتر ہی ہے......تھوڑی سی ہیرا پھیری کرتے ہیں ہم...... کسی کا قتل نہیں......

برہان: مگر......!

سمیر: مگر کیا؟......سوچ لو برہان...... ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے...... یہ تو صرف دوستی کا فرض ہے جس کو نبھانے کے لئے ہم تمہیں اپنے ساتھ شامل کرنے کو راضی ہو گئے......اب مرضی تمہاری ہے......چاہو تو یہاں سے لوٹ کر پھر سے اسی بے بسی، لاچاری اور ذلت کی زندگی میں واپس چلے جاؤ اور چاہو تو ہماری دنیا میں آ جاؤ، جہاں پر سنہرا مستقبل بانہیں پھیلائے تمہارے انتظار میں ہے۔

برہان: (خود کلامی) یہ دونوں شاید صحیح ہیں......آخر اصولوں نے مجھے دیا بھی کیا...... مفلسی نے تو پڑھائی بھی ٹھیک سے ہونے نہیں دی...... یہ دونوں کس ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور میں...... میں کس بے بسی کے عالم میں جیتا ہوں...... یہ دنیا فقط ایک ہی زبان سمجھتی ہے......ہاں...... ایک ہی زبان......دولت کی زبان......دولت ہے تو عزت ہے، دولت ہے تو سب اپنے ہیں......

نوید: کہاں کھو گئے میاں؟

برہان: کھویا نہیں تھا بس سوچ رہا تھا کچھ......

سمیر: تو کیا فیصلہ ہے تمہارا؟

برہان: فیصلہ!! میرا فیصلہ یہی ہے کہ مجھے دولت کمانی ہے...... چاہے جیسے بھی ہو......

نوید: میرے دوست بس اب دیکھتے جاؤ کہ دولت کیسے تمہارے قدم چومتی ہے......

ہاہاہاہاہا

سمیر: ہاہاہاہاہا

برہان: ہاہاہاہاہا

(تھوڑی سی موسیقی اور اس کے بعد)

(Scene No. 5 resumes with same characters and same place)

انسپکٹر: Oh my God...... تمہارے اس بیان نے تو اس کیس کی نوعیت ہی بدل دی......

برہان: وہ کیسے؟

انسپکٹر: وہ تم بعد میں خود سمجھ جاؤ گے...... آگے بولو......

برہان: اس کے بعد ہم لوگوں نے دولت کمانے کے لئے technology کا اور طریقوں سے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا......

انسپکٹر: وہ کیسے؟

برہان: ہم نے مختلف نمبروں سے لوگوں کو Message کرنا شروع کیا اور پھر......

(ایسی موسیقی جس سے Flash Back آنے کا اندازہ ہو)

سین......۸

(فون کی Vibration اور Message Tone کی آوازیں)

نجمہ: عرفان...... بیٹا تمہارا فون بج رہا ہے......

عرفان: ارے آپا Message ہے یہ فون نہیں آیا...... (فون کے بٹن دباتے ہوئے)...... یا اللہ...... میں خواب تو نہیں دیکھ رہا......

ہا...... ہاہا...... ہاہاہا...... ہاہاہا

نجمہ: عرفان...... کیا ہوا...... کیا لکھا ہے اس میں ایسا کہ تم یوں ہنس رہے ہو......

عرفان: آپا...... آپا مت پوچھو...... بس یہ سمجھو کہ ہمارے دن پھر گئے ہیں...... ہم امیر ہو گئے...... آپا میں پورے تیس لاکھ کی لاٹری جیتا ہوں......

نجمہ: یہ تو بڑی اچھی بات ہے...... مگر وہ لاٹری کا ٹکٹ کہاں ہے...... سنبھال کے تو رکھا ہے نا......

عرفان: نجمہ آپا میں نے کوئی ٹکٹ نہیں خریدا تھا......

نجمہ: (حیرانگی سے) تو پھر یہ لاٹری......!

عرفان: میں بتاتا ہوں...... آپ نے Simsam موبائل کمپنی کا نام سنا ہے نا......

نجمہ: ہاں بالکل سنا ہے...... اُس کمپنی کو کون نہیں جانتا...... تمہارا فون بھی تو اسی کمپنی کا ہے......

عرفان: بالکل صحیح...... یہ SMS اسی کمپنی کی طرف سے آیا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے کاروبار کو مزید فروغ دینے کے لئے ایک Lucky Draw کا انعقاد کیا تھا جس میں انہوں نے ملک بھر سے مختلف فون نمبر چن کر ایک Computer میں ڈالے اور اس میں میرا نمبر اول آیا ہے اور اس طرح سے میں تیس لاکھ کی رقم جیت چکا ہوں......

نجمہ: مگر بیٹا ایسا بھی ہوتا ہے بھلا!

عرفان: آپا یہ اکیسویں صدی ہے اور یہاں کچھ بھی ممکن ہے...... ہاہاہا

نجمہ: ہاہاہا...... ارے یہ تم باتوں باتوں میں ہی کہاں جا رہے ہو اٹھ کے......

عرفان: (آواز Fade Out ہوتی ہوئی) آپ Processing Charges کمپنی کے کھاتے میں جمع کرنے اور اپنا انعام پانے......

(Scene No. 5 resumes with same characters and same place)

انسپکٹر: اور کتنے لوگ تمہارے اس جال میں پھنسے......

برہان: انگنت......یوں کہہ لیجئے کہ لوگ پھنستے گئے اور ہم دولت کماتے گئے......

انسپکٹر: اور تم لوگوں کی دولت کی بھوک بھی بڑھتی چلی گئی......

برہان: شاید......کیونکہ جب آسانی سے دولت ہاتھ آتی ہے تو جتنی بھی ہو کم ہی لگتی ہے......

انسپکٹر: خیر!......اور بتاؤ کہ کہاں کہاں ہاتھ صاف کیئے......

برہان: اس کے علاوہ ہم لوگوں کو مختلف Insurance کمپنیوں کے Representative بن کے فون پر Policies کرواتے تھے...... ایسی ایسی Offers اور Schemes بتاتے تھے کی وہ فون پر ہی اپنی ساری Details بتا دیتے تھے جن کا استعمال کر کے ہم ان کے بنک اکاؤنٹ صاف کر دیتے تھے......

انسپکٹر: اور اسی وجہ سے پولیس تم لوگوں کے پیچھے پڑ گئی......

برہان: جی ہاں......اور جس دن پولیس نے ہمارے ٹھکانے پر ریڑ ماری یہ سارے کام ہم نے اسی دن بند کر دیئے......

انسپکٹر: یعنی تم لوگ سدھر گئے......

برہان: ہاہاہا......سدھر نہیں گئے کیونکہ دولت کا بھوت سر سے اترا ہی نہیں......بس ہم نے اپنی Line of Action یعنی حکمت عملی ہی بدل دی۔

انسپکٹر: مطلب!

برہان: مطلب یہ کہ ہم نے ایسے سرمایہ داروں کو لوٹنا شروع کیا جن کے پاس کالے دھن کے ڈھیر ہیں......

انسپکٹر: مگر تمہیں ان کا پتہ کیسے چلا اور ان لوگوں کو ہی اپنا مخصوص نشانہ کیوں بنایا؟

برہان: ان تمام لوگوں کا پتہ ہمیں بیرون ملک کے مختلف بنکوں کے Data کو Hack کرنے سے چلا...... بہت مشقت اٹھانا پڑی......

انسپکٹر: یہ تو سمجھ میں آ گیا مگر تم نے میرے دوسرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ ان لوگوں کو ہی......

برہان: ہاہاہاہا...... انسپکٹر صاحب وہ اس لئے کہ ایسے لوگ اپنے لٹنے کا ماتم تو کر سکتے ہیں مگر اظہار نہیں...... ہاہاہاہاہاہا

(اختتامی موسیقی)

Change Over

سین...... ۹

(دروازہ کھلنے کی اور مسلسل قدموں کی آواز...... کردار چلتے چلتے بات کرتے ہوئے)

حوالدار: جناب

انسپکٹر: بولو حوالدار

حوالدار: کچھ سوال ہیں میرے ذہن میں...... کیا میں پوچھنے کی گستاخی کر سکتا ہوں۔

انسپکٹر: ہاں ہاں کیوں نہیں...... پوچھو۔

حوالدار: جناب آپ نے ان تینوں مجرموں سے الگ الگ پوچھ تاچھ کیوں کی؟ کیا ان میں سے کسی ایک کا بھی بیان ان سب کو مجرم ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں تھا؟

انسپکٹر: حوالدار اگر وہ تینوں عام مجرموں جیسے ہوتے تو شاید ہاں...... مگر تم نے شاید ان کو ٹھیک سے نہیں سمجھا ہے...... ان تینوں کے پاس سیار جیسا تیز دماغ ہے...... اور اگر ان کو شکست دینی ہے تو ہمیں حالات کو ان کے نظریئے سے دیکھنا اور سمجھنا ہوگا تاکہ ہم ان سے ایک قدم آگے رہ سکیں......

حوالدار: صاحب آپ کی باتیں تو میری سمجھ سے باہر ہیں مگر اتنا تو سمجھ ہی گیا کہ وہ اگر سیر ہیں تو آپ......

انسپکٹر: سوا سیر...... ہاہاہاہا

حوالدار: ہاہاہاہا

Change Over

سین......۱۰

(آغاز میں تھوڑی سی سنجیدہ موسیقی)

نوید: انسپکٹر یہ...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا!

سمیر: بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔

برہان: ہمیں پتہ چل چکا ہے کہ بچانے کے نام پر تم نے ہم تینوں کو ٹھگا ہے......

انسپکٹر: Oh shut up منہ سنبھال کر بات کرو...... میں نے تو صرف تم لوگوں پر تمہارا ہی نسخہ آزمایا...... لالچ...... لالچ کا نسخہ...... ہاہاہا تم لوگوں کو کیا لگا تھا کہ قانون کی گرفت سے چھوٹ جاؤ گے۔

نوید: انسپکٹر تمہارے قانون کی گرفت اتنی مضبوط نہیں کہ ہمیں پکڑ کے رکھ سکے......

انسپکٹر: اچھا!...... رسی جل گئی پر بل نہیں گیا...... ہاہاہا...... ویسے تم لوگوں کو بتانا چاہوں گا کہ ہم صرف تم لوگوں کے Insurance گھپلے کی تحقیقات کر رہے تھے مگر اس کے علاوہ جتنے جرائم کا تم لوگوں نے اعتراف کیا ہے اس سے اتنا تو صاف ہے کہ آگے کی زندگی جیل میں ہی کٹے گی تمہاری...... ہاہاہا

سمیر: تم کیا سمجھتے ہو انسپکٹر بیان پہ ہمارے دستخط لینے سے تم جیت گئے...... ہم عدالت میں یہ کہہ دیں گے کہ تم نے زبردستی ہم سے بیانات لکھوائے......

برہان: اور تمہارا یہ ثبوت بھی بے معنی ہو کے رہ جائے گا...... ہاہاہاہا...... ہاہاہاہا

نوید: ہاہاہاہا...... ہاہاہاہا

سمیر: ہاہاہاہا......ہاہاہاہا

انسپکٹر: ہاہاہاہا......ہاہاہاہا

حوالدار: (پسِ منظر میں قہقہے جاری) (خود کلامی) انسپکٹر صاحب سچ کہتے تھے یہ تینوں تو بہت ہی شاطر ہیں...... بے چارے انسپکٹر صاحب!!!!! ان کی تو ساری محنت پر پانی پھر گیا......اسی لئے شاید اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھے ہیں......نہیں تو...... نہیں تو ان مجرموں پر برسنے کے بجائے ان کے سر میں سر ملا کر قہقہہ کہاں لگاتے......

انسپکٹر: (اب ہنسنے کی آواز پیش منظر میں) ہاہاہا...... ہاہاہا...... مہ...... مجھ...... مجھ...... مجھے تم لوگوں سے ایسی ہی امید تھی...... ہاہاہا

حوالدار: شکر ہے اوپر والے کا کہ آپ ٹھیک ہیں......ورنہ ایسے حالات میں آپ کی ہنسی نے تو میرے ہوش ہی اڑا دیئے تھے......

انسپکٹر: ہاہاہا......ہاہاہا......حوالدار ہوش تو اب ان تینوں کے اڑنے والے ہیں تھوڑی ہی دیر میں......ہاہاہاہا......

(نوید، برہان اور سمیر کی ہنسی تھمتے ہوئے)

حوالدار: وہ کیسے صاحب......

انسپکٹر: وہ......اَ......آ......یہ......یہ......ایسے

حوالدار: ارے، ارے صاحب......یہ...... یہ آپ اپنی قمیض کے بٹن کیوں کھول رہے ہیں

نوید:

سمیر: (تینوں ایک ساتھ) Button Camera!!!!!

برہان:

انسپکٹر: ہا...... ہا...... ہا...... صحیح پہچانا...... ایک بٹن کیمرہ...... جس کو تم جیسے technology کے دیوانے Spy Cam بھی کہتے ہو......ہاہاہا

............☆☆☆............

☆......ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

جموں و کشمیر میں اُردو تھیٹر اور ڈراما

اردو کا پہلا ڈراما ''رادھا کنہیا کا قصہ'' (واجد علی شاہ ۱۸۴۳) ہے، جبکہ ''اندر سبھا'' (امانت لکھنوی) اور ''راجہ گوپی چند اور جلندھر'' (۱۸۵۳) بعد کی چیزیں ہیں۔ دوسری طرف خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر مسیح الزماں، سید حسن اور محمد افضل الدین اقبال نے بھی چند اور ڈراموں کو مرتب کر کے اولیت کا دعویٰ کیا۔

واجد علی شاہ کو اولیت حاصل تو ہوئی ہے، جبکہ امانت کا اثر اردو ڈرامے پر زیادہ رہا، جس کی وجہ سے ایک تو بہت ساری ''سبھائیں'' لکھی گئی اور اردو تھیٹر لکھنؤ سے نکل کر بنگال اور پھر بمبئی تک پہنچ گیا۔ بمبئی میں پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے تجارتی بنیادوں پر کافی ترقی کی اور آغا حشؔر جیسے نامور ڈراما نگار پیدا کیا۔

منشی پریم چند کے ''کربلا'' اور امتیاز علی تاج کے ''انارکلی'' یا پھر رسوؔا، شرر، محمد حسین آزاد اور کیفی وغیرہ کے ادبی ڈراموں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ دوسری طرف کرشن چندر، بیدی اور منٹو وغیرہ نے ریڈیو کے لئے بھی اچھے خاصے ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد اردو ڈراما اسٹیج، ریڈیو اور ٹی وی پر بھی چلتا رہا اور ساتھ ہی کتابی صورت میں بھی چھپتا رہا۔ جس طرح اردو کی دیگر اصنافِ ادب میں تکنیک کے نئے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں، ٹھیک اسی طرح اردو ڈرامے میں بھی ایپک، ابسرڈ سے لے کر نکڑ تھیٹر تک کئی کامیاب تجربے کئے گئے۔ موضوعات میں تبدیلی آتی رہی۔ ترقی پسندی، جدیدیت کے بعد آج کل مابعد جدیدیت کے تحت بھی باضابطہ طور پر اردو ڈراما لکھا جا رہا ہے۔

غرض یہ کہ اردو ڈراما کے متعدد فن پارے سامنے آئے جنہیں ہم World Drama کے معیار پر کھرا اُترتے دیکھتے ہیں۔

جموں وکشمیر میں ہمیں کلہن پنڈت کی ''راج ترنگنی'' میں ڈراما کا تذکرہ ملتا ہے۔ کلہن یہاں کے ایک ڈراما نگار چنڈک کا ذکر کر کے اس کو ''مہا بھارت'' کے مصنف کے ہمسر بتاتے ہیں۔[1]

کلہن کے مطابق یہاں مذہبی تہواروں کے موقعے پر ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ خطہ جموں میں رام لیلا کھیلنے کا رواج برسوں سے چلا آیا ہے۔ اسی طرح لداخ میں بھی مذہبی ناچ کی روایت بہت ہی قدیم ہے۔ کشمیر میں ایک طرف ہندو مندروں میں ڈرامے کھیلے جاتے تھے اور دوسری طرف یہاں کا عوامی تھیٹر جسے عرفِ عام میں ''بانڈ پأتھر'' کہتے ہیں، کی مقبولیت صدیوں سے چلی آ رہی ہے اور اس کی اہمیت وافادیت کسی بھی دَور میں کم نہیں ہوئی ہے۔ کشمیر کے ایک نامور قلم کار سید رسول پونپر نے راجہ شنکرورمن (۸۸۳۔۹۲) مصنف ڈراما رام ابھنودیا، راجہ کلش (گیارہویں صدی عیسویں) ابھنو گپت (ناٹیہ شاستر کا مفسر) سلطان زین العابدین بڈشاہ (۱۴۲۰۔۷۰) وغیرہ جیسے بادشاہوں کا ذکر اپنے مضمون میں کیا جنہوں نے اپنے دورِ حکومت میں تھیٹر کی سرپرستی کی اور وہ اس فن سے خود بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔

ریاست جموں وکشمیر میں باضابطہ پیشہ ورانہ تھیٹر کی تاریخ کا سہرا مہاراجہ سرکار کے ہی سر باندھا جاتا ہے، کیونکہ ڈوگرہ بادشاہوں نے چند ڈراما کمپنیوں کی سرپرستی کی۔ ان کمپنیوں نے نہ صرف خود ڈرامے لکھے بلکہ مختلف یورپی اور ہندوستانی زبانوں کے ڈراموں کو بھی اُردو رہندوستانی میں پیش کیا۔ ایک ماہرِ فنِ ڈراما اور تھیٹر موتی لال کیمو کے مطابق مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اپنے جانشین مہاراجہ ہری سنگھ کی تاج پوشی (۱۹۲۵) کے جشن کے سلسلے میں ممبئی کی الفرائیڈ تھیٹریکل کمپنی کو یہاں آنے کی دعوت دی[2] چنانچہ اس کمپنی سے آغا حشر کاشمیری جیسے ڈراما نگار کا تعلق تھا، تو اسطرح نہ صرف اس کمپنی نے یہاں کے لوگوں کو پہلی بار اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے محظوظ اور متعارف کروایا بلکہ انہوں نے براہ راست

یہاں کے ڈراما خاص کر اُردو ڈراما کے لئے ایک خوشگوار ماحول عطا کیا۔

پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کا اثر صرف جموں خطے پر ہی نہیں پڑا، بلکہ کشمیر میں بھی انہوں نے ڈرامے دکھانے شروع کئے۔ گاؤ کدل سرینگر میں پہلے سے ہی ایک تھیٹر قائم تھا اور مہاراجہ نے بھی بسنت باغ سرینگر میں ایک نئے طرز کا تھیٹر بنوایا۔ یہ تھیٹر وسیع رقبے پر تھا اور مہاراجہ اپنی فیملی کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر خود بھی ڈراما دیکھتے تھے[۳] اس کے بعد مہاراجہ نے ''میجور ڈرامائک کلب'' کی بنیاد رکھی اور اس میں فن ڈراما اور تھیٹر سے متعلق پیشہ ور افراد کو باضابطہ طور پر ملازمت دی۔ اس کے دس سال تک یہ تھیٹر بڑی شدومد سے جاری رہا۔ آخر کار ۱۹۳۷ء میں یہ کلب دم توڑ بیٹھا۔ اس دور کے جموں وکشمیر کے دیگر تھیٹر گروپوں میں رام ناٹک کمپنی، فرینڈس کلب، سرسوتی کلب، نیشنل تھیٹریکل کمپنی، کشمیر تھیٹرس وغیرہ خاص اہم نام ہیں۔

موتی لال کیمو کے مطابق ''کشمیر تھیٹرس'' ریاست کی واحد ایسی کمپنی ہے، جس کے ساتھ سرمایہ دار لوگ وابستہ تھے، جنہوں نے اس کمپنی پر کافی روپیہ صرف کیا اور ایک شاندار عمارت تعمیر کی اور اسی کمپنی نے سب سے پہلے یہاں دو زنانہ اداکاروں سکھ بدن اور بسم اللہ کو دہلی اور لکھنؤ سے بلا کر یہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ کشمیر کے ایک سرگرم تھیٹر شناس بھوانی بشیر یاسر نے اُس دور کے ڈراما تحریک سے وابستہ افراد کی فہرست یوں مرتب کی ہے:

''......ویدلال وکیل، رام کشن، کشن نرائن دھر، سدھاما جی کول، کاشی ناتھ بھان، پریم ناتھ جتو، جگر ناتھ ساقی، مادھولال داس، کاشی ناتھ ایم، جگن ناتھ سوپوری، حسن شاہ انجینئر، محمد حسن، گوپی کشن مدن، ٹھاکر داس، پری ولاس، ایس این نندہ، بابو کشن داس، شمبھو ناتھ، رام ناتھ پوری، سرواند دخشو، محمد شعبان، نندلال کیرا، گوری کنٹھ وغیرہ[۴]۔ اسی دور میں ترقی پسند تحریک (بانی سجاد ظہیر ۱۹۳۶) سرگرم ہوئی، تو انہوں نے اسکے الگ الگ شعبے قائم کئے، جن میں تھیٹر سے وابستہ شعبے کو IPTA (Indian Peoples Theatre Association) کا نام دے دیا گیا۔ اس کی ایک الگ تاریخ ہے، مگر یہاں یہ بات بھی

واضح رہے کہ ترقی پسند تحریک نے ریاست میں بھی اپنے بال و پر پھیلا دیئے۔خوش قسمتی یہ ہے کہ ریاست میں مشہور ڈراما نگار اور فلم ساز بلراج ساہنی نے (۱۹۳۸) IPTA سے متعارف کروایا۔ یہ اپٹا کی تحریک کا ہی اثر ہے کہ یہاں کلچرل فرنٹ وجود میں آ گیا۔ یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں ڈراما کلب بنتے گئے جن میں اسلامیہ ہائی اسکول، ایس پی کالج اور امر سنگھ کالج خاص شامل ہیں۔ وجے سمن سوسن کے مطابق جموں میں لالہ رام کشن غافل ایک کامیاب ایکٹر اور ڈائیریکٹر تھے اور انہوں نے ''اُچھوت اُدھار'' (مہاتما گاندھی کی آئیڈیالوجی پر مبنی) جیسا کامیاب ڈراما پیش کیا۔ اسی ڈرامے سے متاثر ہو کر مہاراجہ ہری سنگھ نے روگناتھ مندر میں اچھوتوں کے داخلے پر لگی پابندی کو ختم کیا۔ ان ہی دنوں پرتھوی تھیٹر نے یہاں آ کر اُردو ڈرامے کیلئے نئے نئے دروازے وا کیئے۔

یہاں کے اُردو ادیبوں کے ڈرامے مختلف رسالوں میں چھپتے رہے۔ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آتے رہے اور ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو ڈراما میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا نام محمد عمر نورالہٰی کا آتا ہے۔ انہوں نے 1924 میں عالمی ڈراما کی تاریخ پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔

محمد عمر (۱۸۸۵۔۱۹۴۶) اگرچہ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے، لیکن انہیں ڈراما نگاری کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ ڈراما لکھنے کے سلسلے کو نورالہٰی کے ساتھ آگے بڑھا کر اُردو ڈراما کی تنقید پر سب سے پہلی کتاب ''ناٹک ساگر'' کے عنوان سے وجود میں آگئی اور اس کتاب کے منظرِ عام پر آتے ہی پنجاب یونیورسٹی، انجمن ترقی اُردو ہند حیدر آباد اور مہاراجہ ہری سنگھ نے اسے انعامات سے نوازا۔ اس کتاب نے مہاراجہ کو تھیٹر سے دلچسپی بڑھا دی اور انہوں نے ڈرامے کے فروغ کیلئے ''رایل امیچور ڈرامیٹک کلب'' قائم کر کے محمد عمر کو اس کا نگران مقرر کر لیا[۵]۔ یہ کتاب اُردو میں آج بھی ایک حوالہ جاتی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

دونوں مصنفین نے مشترکہ طور پر کئی ڈرامے بھی لکھے، جن میں کچھ طبع زاد ہیں، کچھ ترجمہ ہیں اور کچھ ماخوذ ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ان کے ڈراما کے مجموعوں کی نشاندہی درج ذیل عنوانات کے تحت کرتے ہیں۔

تین ٹوپیاں (ماخوذ فرانسیسی ادب)، بگڑے دل (ترجمہ)، ظفر کی موت، سکندر، قزاق، موجودہ لندن کے اسرار روحِ سیاست (ابراہم لنکن کی زندگی کے متعلق ایک طویل ادبی ڈراما)، پہلی پیشی (مختصر ڈراما)، ڈرامے چند (سات ڈراموں کا مجموعہ)، ناٹک کتھا (قدیم ہندوستانی ڈراموں کا اُردو روپ)۔ اس کے علاوہ انہوں نے ریڈیو کے لئے بھی ڈرامے لکھے۔ نور الٰہی محمد عمر کے رشتہ دار تھے اور Co-Author بھی۔ اسی لئے اکثر کتابوں پر دونوں کا نام مشترکہ طور پر آتا ہے۔ محمد عمر کے انتقال کے بعد بھی نور الٰہی نے جو کام کیا، اس میں بھی محمد عمر کا نام آ گیا۔

ان ڈراموں میں ہمیں مغرب کے مشاہیر ڈراما نگاروں کے طرزِ نگارش کے نمونے ملتے ہیں۔ مصنفین نے صرف ان کے زاویہ نگاہ سے کام لے کر اُردو زبان اور ہندوستانی تمدن میں منقلب کیا ہے۔ ہر ڈرامے کا موضوع اور مواد جداگانہ ہے اور ہر ڈراما اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں ڈراما لکھنے اور پھر انہیں مختلف رسالوں یا کتابی صورت میں شائع کروانے کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم ڈاکٹر پریمی رومانی کی بات کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔ انکے مطابق شاہد کاشمیری (۱۹۴۷ء سے قبل) کا لکھا ہوا ایک ڈراما ''رکمنی ہرن''[6] کے عنوان سے اخبار مارتنڈ میں شائع ہوا تھا۔ یہ ڈراما اگرچہ اُردو رسم الخط میں ہے، لیکن اس کی زبان سنسکرت اور ہندی آمیز ہے اور یہ ایک سماجی ڈراما ہے، جس میں مہاراجہ بھیشک اور مہارانی سوشیلا پریشان ہوتے ہیں، کیونکہ انکی بیٹی کی عمر سولہ سال ہوئی ہے اور انہیں ایک بر کی تلاش ہوتی ہے۔ یہ ڈراما اندرونی تصادم سے بھرپور ہے۔ اور تصادم کے بغیر ڈراما بن نہیں سکتا۔

پروفیسر محمود ہاشمی (سلطان محمود) برسوں تک سرینگر کے کالجوں میں پڑھاتے رہے اور بٹوارے کے بعد پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد لندن میں مقیم ہوئے۔ انہوں نے افسانوں اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ انارکلی کی واپسی اور آنکھ کے عنوان سے ڈرامے لکھے۔ ڈاکٹر برج پریمی اور ڈاکٹر پریمی رومانی کے مطابق پروفیسر محمود ہاشمی کے ڈرامے ''کشمیر

یہ ہے'' سے یہاں نئے تھیٹر کا آغاز ہوتا ہے، کیونکہ اس میں زنانہ کردار تھے اور اس کی اسٹیج کاری کو راجندر سنگھ بیدی اور شیر جنگ جیسے لوگوں نے کافی سراہا۔

پریم ناتھ پردیسی (۱۹۰۹۔۱۹۵۵) کا نام پورے اُردو افسانے کی تاریخ میں ہمیں سرخیوں میں ملتا ہے۔ وہ منشی پریم چند سے زبردست متاثر تھے۔ انہوں نے ڈرامے کو بھی اپنے اظہار کا خاص وسیلہ بنا دیا۔ چونکہ وہ ترقی پسند خیالات سے وابستگی رکھتے تھے اور نیک بختی یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں بلراج ساہنی نے کشمیر میں ترقی پسند مصنفین کو جمع کر کے یہاں بھی دیگر ادبی کاروائیوں کے ساتھ ساتھ کشمیر پیپلز تھیٹر قائم کیا۔ ان دنوں کشمیر میں سخت غذائی بحران تھا، تو پردیسی نے اس موضوع پر پہلے ''ان کوٹ'' نام کا ایک افسانہ لکھا اور بعد میں اس کو ڈرامائی روپ میں پیش کر کے کشمیری میں اس کا نام ''بت ہر'' رکھا، لیکن اس وقت کے گورنر مہاراج کشن کول نے اس ڈرامے کو ضبط کیا اور یہ ڈراما اسٹیج ہونے سے رہ گیا۔ پردیسی کے زمانے میں یہاں کوئی اخبار یا رسالہ نہیں چھپتا تھا، اس کے باوجود ان کے افسانے اور دیگر لٹریچر ریاست سے باہر تقریباً ہر بڑے رسالے میں چھپتا رہا۔

پردیسی کے ڈرامے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے، افسوس ابھی تک کتابی صورت میں یکجا ہو کر وہ منظرِ عام پر نہ آسکے۔

(۱) بتہ ہر (کشمیری) (۲) مجاہد شیروانی (۳) جوابی حملہ (ریڈیائی فیچر) (۴) سوالی (۵) قدہ گوجواری (۶) سنگتراش (۷) معتصم کی ایک رات (۸) سانکرات۔ [۷]

وجے سمن سوسن خطہ جموں سے تعلق رکھتے تھے اور صحافت ان کا پیشہ رہا۔ ہندی اُردو میں لکھتے تھے۔ صحافت اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی وہ لکھتے رہے۔ انہوں نے ''انگمان'' کے عنوان سے ایک ادبی ڈراما لکھا، جس کا موضوع ہندوستان پر چینی حملہ ہے۔ انگمان اس ڈرامے کی ہیروئن اور مرکزی کردار بھی ہے۔ اس لداخی لڑکی کے دو بھائی چینیوں کے ساتھ لڑتے لڑتے مرتے ہیں اور انگمان کو چینی فوجیوں نے اپنی ہوس کا شکار بنا لیا، جس کے نتیجے میں وہ ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے، لیکن یہاں مصنف نے وطن پرستی کو ماں کی ممتا پر ترجیح دی۔ اس لئے انگمان اپنے بچے کو پانی میں ڈبو کر مار دیتی ہے۔ اس بچے کو مار کر مصنف نے

یہاں ایک چونکا دینے والا پیغام دیا ہے اور یہی چیز اس ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ویدراہی ایک پیدائشی اور خاندانی قلم کار تھے اور رنبیر اخبار کے بانی لالہ ملک راج صراف کے بیٹے ہیں۔ افسانہ نگاری اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ البتہ ان کا اصل میدان صحافت، فلم اور ڈراما ہے۔ انہوں نے کئی کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔

پران کشور (۱۹۲۵) کا تعلق ریڈیو کشمیر سے رہا اور انہوں نے اُردو اور کشمیری میں بہت سارے ڈرامے لکھے۔ اپنے اور دوسروں کے ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی کئے۔ کلچرل فرنٹ اور کلچرل کانگرس سے وابستہ رہے اور IPTA کی کشمیر شاخ کے بانی بھی ہیں۔ کشمیر پر بنائی گئی فلم کے معاون ہدایت کار بھی رہے۔

دیانند کپور پیشے سے صحافی تھے اور وہ ڈراما بھی لکھتے تھے۔ ان کا ایک ڈراما ''تاج'' کے عنوان سے ہے۔ ان کے بیٹے موتی لال کپور کا تعلق بھی ڈرامے سے رہا۔ وہ چراغ حسن حسرت کے شاگرد تھے۔ ''حرف آخر'' کے عنوان سے ان کا ڈراما نند گوپال باوا کے مجموعے میں شامل ہے۔

گوپی ناتھ کوشک (۱۹۱۶ء) ریڈیو کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اُردو، ہندی اور پنجابی میں متعدد ڈرامے لکھے۔

شری رام شرما ماتری بھگت کا مشہور ڈراما ''امر جیوتی'' کے عنوان سے ہے۔ اس ڈرامے میں شعبۂ تعلیم میں انتظامی سطح پر ہو رہی رشوت خوری کو نشانہ بنایا گیا۔ یہاں فن پر کم بلکہ موضوع پر زیادہ توجہ دی ہے۔

دینو بھائی پنت (۱۹۱۷) ایک ترقی پسند قلم کار تھے۔ ہندی، اُردو اور ڈوگری میں لکھتے تھے۔ ''سورگ کی کھوج'' ڈرامے کی شہرت نے انہیں بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے مواد پرانوں اور لوک روایتوں سے اخذ کیا ہے۔ یہ ڈراما کشمیر کی روایتی لوک کہانی (کشپ رشی) کے ارد گرد گھومتا ہے اور یہاں مصنف نے زبان فارسی اور سنسکرت آمیز رکھی ہے۔ اس ڈرامے کے بارے میں پروفیسر سروری نے کیا خوب لکھا ہے:

''ڈراما عہد کی ملامت، موضوع کی دلکشی اور پیش کشی کے انداز کی وجہ سے ایک نیم کلاسیکی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ڈراما کئی دفعہ اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا اور ۱۹۶۳ء میں ڈوگری سنستھا کی جانب سے شائع ہوا ہے''[8]

جتیندر شرما کا تعلق ریڈیو کشمیر اور کلچرل اکیڈیمی سے رہا اور ڈراما بھی لکھتے تھے۔ خود بھی اداکاری کرتے تھے۔ ڈوگری فلم ''گلاں ہواں بیتیاں'' میں ہیرو کا کردار انہوں نے ادا کیا۔

نرہری رائے زادہ[9] مولانا آزاد میموریل کالج جموں میں پڑھاتے تھے اور انہوں نے پُرانے دیپ نئے اُجالے، اُردو ڈرامے (یکبابی پانچ ڈرامے) پُرانے خدا نئے لوگ، پنجرا (پنجابی ڈرامے)، بہادر شاہ کی آخری رات (تین ایکٹ کا مکمل ڈراما) جیسے ڈراما لکھے۔ پُرانے دیپ نئے اُجالے نرہری رائے زادہ کا لکھا ہوا ایک مکمل اسٹیج ڈراما ہے، جو ۱۹۶۵ء میں شائع بھی ہوا اور جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی نے مصنف کو انعام سے بھی نوازا۔ عوامی زندگی سے اپنے کردار تخلیق کرتے تھے۔ ان کے ڈراموں میں ایک طرف زندگی سے بھرپور حسین اور دلکش کردار ملتے ہیں اور دوسری طرف شاہی محلات کی تھکی بوجھل زندگی کے گہرے نقوش بھی ظاہر ہوتے ہیں، مگر دونوں صورتوں میں ہندوستانی معاشرت کی زندہ تصویریں اُجاگر کرتے ہیں۔

متذکرہ بالا مجموعے کے علاوہ ''اُردو ڈرامے'' کے عنوان سے نرہری رائے زادہ کا ایک اور مجموعہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں ایک پتھر، ایک محل، شمع جلاؤ شمع بجھاؤ، ہار کی پرچھائیں، تاش کا گھر اور پنجرا کے عنوان سے پانچ ڈرامے شامل ہیں، جن میں پہلے تین ڈراموں کا تعلق ہندوستان کی قدیم تاریخ سے ہے اور آخری دو ڈرامے ہمارے عہد کے سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

رام کمار ابرول اُردو اور ڈوگری میں لکھتے تھے۔ پہلے آل انڈیا ریڈیو جموں میں ملازم تھے۔ محکمہ اطلاعات حکومتِ جموں و کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ سماجی زندگی کے بارے

میں ڈوگری زبان میں ایک فلم بنائی۔ ابروؔل کے ڈرامے اسٹیج اور شائع بھی ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں ''انسان جیت گیا'' ایک کامیاب ڈراما لکھا۔ اسکے علاوہ ''دھرتی اور ہم'' (۱۹۶۵) اور چکی کے پاٹ بھی انکے مقبول ڈرامے ہیں۔ انہوں نے اپنے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''زندگی اور عورت'' بھی چھاپا ہے۔

ابروؔل اصل میں ایک ترقی پسند قلم کار تھے۔ اسی لئے سماجی بیداری، کاشت کاری جیسے مسائل وہ اپنے ڈراموں میں بیان کرتے تھے۔ ساتھ ہی رجعت پسند طاقتوں سے ٹکر بھی ان کے ڈراموں میں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔

''انسان جیت گیا'' ایک کمیونسٹ اپروچ کا ڈراما ہے، جو جاگیرداری نظام کے خلاف اعلان بغاوت کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک جاگیردار غریب کسانوں کا استحصال کرتا ہے، تو ڈرامے کا ہیرو یعنی نوجوان رام اس کے مدِ مقابل کھڑا ہو کر لوگوں کو ان کا حق دلاتا ہے۔ اسطرح آخر کار جاگیردار کو ہار مان کر جیل جانا پڑتا ہے۔ یہ ڈراما اسٹیج کاری کو مدِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔

سی پروانہؔ (۱۹۳۴) اُردو ہندی، ڈوگری اور پنجابی میں لکھتے تھے۔ ان کا ایک ڈراما ''نیم حکیم'' کے عنوان سے بہت مقبول ہوا۔

زیڈ سیمیؔ نے مختلف اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی اور ان کا ایک ڈراما مجموعہ، جھنکار، کے عنوان سے چھپا، لیکن ان کا کامیاب ڈراما ''جہانگیر کی موت (۱۹۶۲) ہے، جو ڈراما در ڈراما کی تکنیک پر لکھا گیا ہے، جس طرح شیکسپیئر نے Mid Summer Nights Dream لکھا ہے۔ اس ڈرامے کی دو بڑی خوبیاں ہیں کہ ایک اس میں کشمیر کے تئیں مغلیہ شہنشاہ جہانگیر کی والہانہ محبت دکھائی گئی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اس ڈرامے کے مکالمے قدرے دلچسپ اور ادبی زبان میں لکھے گئے۔

نریندر کھجوریہ نے ۱۹۶۴ء میں ''راستے کانٹے اور ہاتھ'' کے عنوان سے ایک ڈراما مجموعہ شائع کیا۔ اس مجموعے میں شامل پہلا ڈراما جو کہ اس کا عنوان بھی بنا، ایک اسٹیج ڈراما ہے،

جبکہ ''گہری ندیا کی دھار'' اور پیسہ دھرتی'' دو ریڈیائی ڈرامے بھی اس میں شامل کئے گئے۔

چونکہ مصنف ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، اسلئے انہوں نے ان ہی موضوعات کو یہاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً پہلے ڈرامے میں مُفاد پرستوں کے خلاف پنچایت کا رول موضوع بنایا گیا۔ اس ڈرامے کے سبھی کردار اسم با مسمیٰ ہیں۔ یعنی جیسے نام رکھے گئے، ویسے ہی وہ کام کرتے ہیں اور پلاٹ، زبان و بیان وغیرہ سب کچھ اس میں سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ ''گہری ندیا کی دھار'' کا موضوع بھی سماجی اصلاح ہے، جس میں سماج کا ایک نہایت پسماندہ طبقہ یعنی ہانجی (مانجھی) اپنے ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے شخص یعنی ''رمیا'' کے ظلم کے شکار ہوتے ہیں، تو شہر سے ایک پڑھا لکھا نوجوان ''بابو'' آکر ان کی زندگی کو تبدیل کرنا چاہتا ہے، لیکن رمیا اس نیک کام میں کافی روکاوٹیں حائل کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں دو طبقوں کے بیچ میں زبردست تصادم پیدا ہو جاتا ہے، جسکے بیچ میں رمیا کی منگیتر پھولن کو اپنی جان گنوا دینی پڑتی ہے، کیونکہ وہ بے چاری اس خلیج کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس مجموعے میں شامل آخری ڈراما ''پیسہ دھرتی'' بھی ایک سماجی اور ترقی پسند ڈراما ہے، جس میں جموں خطے کے پہاڑی علاقوں میں مروج ایک سماجی بدعت یعنی ''دوہری'' کی نقاب کشائی کی گئی۔ اس رسم کے مطابق لڑکیوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے اور کسی نوجوان کنواری لڑکی کو بوڑھے کے گلے باندھا جاتا ہے۔ اسی ڈرامے کی بنیاد پر پہلی ڈوگری فلم ''گلاں ہووے بیتیاں'' بنائی گئی۔

بنسی نردوش (۱۹۲۹ء) کے والد کا نام پنڈت شیام لال ولی تیرتھ کاشمیری تھا اور بنسی نردوش کو علم و ادب ورثے میں ملا۔ اُردو اور کشمیری کے جانے مانے ادیب تھے۔ ریڈیو کشمیر میں ملازم تھے اور ترقی پسند تھے۔ انہیں مختلف تنظیمیں بنانے کا بے حد شوق تھا۔ افسانہ نگار تھے، ساتھ ہی کئی ڈرامے بھی لکھے، جو نشر ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف رسالوں میں چھپ بھی گئے۔ ''ایک رات کا مہمان'' ان کا لکھا ہوا ایک مشہور ریڈیائی ڈراما ہے اور یہ ڈراما اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔ اس ڈرامے کا موضوع چین میں عوام کے

ساتھ کمیونسٹ حکومت کی طرف سے ہو رہی زیادتی ہے۔ جس کو فسطائی نظام کہتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ یہاں ہر کسی کے پیچھے سرکاری مخبر لگا رہتا ہے اور ہر فرد کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شاعروں اور دانشوروں کو بھی نہیں بخشا جاتا ہے۔ لوہ سانگ کو ان کی شاعری پر (جس میں انہوں نے انسان کی آزادی کے گیت گائے تھے) سزا دی جاتی ہے، لیکن وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جس پر نگران پولیس کو سزا دی جاتی ہے۔ اب جبکہ لوہ سانگ برسوں بعد اپنی بیوی اور بچے سے ملنے جاتا ہے، تو وہاں اس کا بیٹا بھاشاں ان کی خبر کیمپ والوں کو دینا چاہتا ہے، لیکن اپنی ماں کے سمجھانے پر وہ رُک تو جاتا ہے، مگر اس سے پہلے ہی سپاہی اس گھر کو گھیر لیتے ہیں۔ اس ڈرامے کے مکالموں میں جگہ جگہ چین میں بدلتے ہوئے نظام پر طنز کی گئی ہے۔

پشکر ناتھ (۱۹۳۲ء۔۲۰۰۵ء) جموں و کشمیر کے ایک اہم افسانہ نگار کا نام ہے اور انہوں نے اندھیرے اُجالے، ڈل کے باسی، عشق کا چاند اندھیرا اور کانچ کی دنیا جیسے افسانوی مجموعے شائع کئے۔ ساتھ ہی وہ ایک اچھے ڈراما نگار بھی ہیں اور ان کے بیشتر ڈرامے ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں سے نشر ہوئے۔ پروفیسر ظہور الدین ان کے ڈراموں کی تعداد تین سو سے زائد بتاتے ہیں۔ پروفیسر ظہور الدین نے (شیرازہ. ''پشکر ناتھ نمبر''، کلچرل اکیڈیمی) اپنے ایک طویل مضمون ''پشکر ناتھ بحثیت ڈراما نگار'' میں جن ڈراموں پر بات کی، وہ سبھی ریڈیائی ڈرامے ہیں، جو مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہوئے۔ ان ڈراموں میں ساون چلے بھادوں چلے، دل کی وادیاں اور ایک لکیر درد کی ہے۔ موصوف نے یہاں زیادہ تر ان ڈراموں کا خلاصہ اور ان کا تجزیہ ہی پیش کیا ہے۔ راقم الحروف نے اسی شمارے میں پشکر ناتھ کے ایک ریڈیائی ڈرامے ''ڈیرا'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے کا پلاٹ مصنف نے روایت سے ہٹ کر تیار کیا تھا اور تمام ڈرامائی عناصر کو اپنے انداز میں برتنے کی سعی کی تھی۔ پشکر ناتھ نے اس ڈرامے میں کسی بات پر فوکس نہیں کیا تھا، جس کی وجہ سے کرداروں کا بھی کوئی خاص ارتقا نہیں ہو پایا ہے۔[۱۰]

علی محمد لون (۱۹۸۷-۱۹۲۶) کشمیری زبان کے جانے مانے ادیب کا نام ہے، جن کا کشمیری فوک ڈراما "سیا" شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی یہاں کی روایتی کہانی (کشپ رشی کے متعلق) پیش کی گئی ہے۔ کشمیری کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی ڈرامے لکھتے رہے۔ ان کے اُردو ڈرامے نشر ہوئے، اسٹیج کئے گئے اور شائع بھی ہوئے۔ انہوں نے کچھ ڈرامے ترجمہ بھی کئے اور ان کے کچھ اُردو اور کشمیری ڈرامے دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ روسی ڈراما نگار واستو ویسکی کے ڈرامے My Uncles Dream کا اُردو ترجمہ "خالو جان کا خواب" کے عنوان سے کیا اور یہ ڈراما مختلف کلبوں نے اسٹیج بھی کیا۔ ۱۹۵۴ء امر سنگھ کالج میں طلبہ نے انکا ڈراما "چٹان" اسٹیج کیا۔ ۱۹۵۶ء میں کلچرل کانگریس نے ان کا ڈراما "دیوانے کا خواب" اسٹیج کیا۔ ان کا مشہور ڈراما "گھروندے" ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا۔

کلچرل اکیڈیمی کے انتخاب اُردو ادب میں انکا ڈراما "گھروندے" کے عنوان سے شامل کیا گیا اور اس ڈرامے کو جموں و کشمیر کے ادبیات پر کام کرنے والے لوگوں نے کافی سراہا ہے۔ لون صاحب کے اس ڈرامے کا موضوع ڈل جھیل میں رہنے والے ہانجی لوگوں کی سماجی زندگی اور ان کے معاشی مسائل ہیں۔

کشمیر کے ایک جانے مانے براڈ کاسٹر قیصر قلندر نے اُردو کشمیری ریڈیو ڈرامے لکھے، اوپیرا اور ریڈیو فیچر بھی لکھے جو نشر ہو کر کافی مقبولیت بھی پا گئے۔ انہوں نے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کی وساطت سے جگدیش چندر ماتھر اور موہن راکیش کے ڈراموں کے ایک مجموعے کو "پہلا راجا اور آدھے ادھورے" کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں اُردو میں منتقل کر کے اسے منظرِ عام پر لایا۔

نور شاہ پچاس سال سے اردو ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ انہوں نے افسانہ، ناول اور ڈراما تینوں اصناف پر طبع آزمائی کی ہیں۔ ان کا ایک ڈراما "سفر زندگی کا" پیش نظر ہے۔ یہ ڈراما روایتی سماج پر مبنی ہے۔ ڈرامے کے آخری حصے میں مصنف نے کشمیر میں موجودہ حالات کی عکاسی کی ہے۔

یہاں ڈرامے کا خاتمہ روایتی طور پر نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ موجودہ فکشن میں خاص کر ایک افسانے میں The End یا کسی خاص نتیجے کے بدلے میں ایک سوال کھڑا کیا جاتا ہے یا کسی بات کی طرف ایک Direction دی جاتی ہے یا کہیں کہیں Vague situation پیدا کی جاتی ہے، تاکہ قارئین/سامعین کچھ اور سوچنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ تو اس طرح کہیں کہیں کسی ایک متن پر دوسرا متن بھی کھڑا کیا جاتا ہے، جسے مابعد جدیدیت والے Intertextuality بین المتونیت کہتے ہیں۔

اس ڈرامے کا پلاٹ بہت مختصر ہے نور شاہ نے کرداروں کی اندرونی کشمکش اور اپنا نظریہ پیش کرنے کے لئے اسے (ریڈیو کے لئے آدھے گھنٹے کا ڈراما اور اسٹیج پر تقریباً ۴۵ منٹ سے زائد وقفہ) کے لئے تخلیق کیا ہے۔ اس ڈرامے کی Location کے لئے دو ہی جگہوں کا انتخاب کیا گیا ہے یعنی پاپا (ایک رئیس) کا گھر اور آنٹی کا گھر (پرانے وضع کا کشمیری پنڈتوں کا گھر) اب اگر پارٹی گھر کے بدلے میں کسی ہوٹل میں رکھی جائے گی، تو اس کے لئے الگ ایک (Location) (ٹی وی کی صورت میں) یا سیٹ (اسٹیج ڈرامے کی صورت میں) کی ضرورت پڑے گی۔

غرض کہ اس مختصر سے ڈرامے میں اور بھی بہت سارے چھوٹے چھوٹے مسائل اُبھارے گئے ہیں، جن میں زیادہ مصروفیت کی وجہ سے Hypertension کا ہونا، اپنے بچوں کو ڈرپوک بنانا، گھر کے معاملات میں صاحب خانہ یا باپ کی چودھراہٹ شوہر اپنی بیوی کا Mental Torchar کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر جوگندر سنگھ سُودن کی تخلیق ''چار چکر'' کے عنوان سے ہے جو کہ اصل میں ان کی آپ بیتی ہے، لیکن انہوں نے اس کو ڈرامائی روپ میں پیش کیا۔ چار چکر کا موضوع ۱۹۴۷ء، بٹوارہ، فسادات، ہجرت اور پھر کشمیر پر پاکستانی قبائلوں کا حملہ ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل سُکھدیو سنگھ ہندوستانی آرمی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور تقسیم کے وقت انہیں تین سال بحیثیت جنگی قیدی جیل میں گزارنے پڑے۔ جہاں انہوں

نے تخلیقی ادب لکھنا شروع کیا۔ رہائی پانے کے بعد سرینگر میں پوسٹنگ کے دوران ان کی کہانیاں اور نظمیں ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوئیں۔ فوجی اخبار نے انہیں شائع کیا۔ اپنی ریٹائیرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات کو سمیٹ کر ڈراما لکھنا شروع کیا اور ان کے بہت سارے ڈرامے ریڈیو کشمیر جموں سے نشر ہوئے۔ اسکے بعد ۱۹۸۲ء میں کلچرل اکیڈیمی کے مالی تعاون سے ان کے پانچ ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ ''جہاں دھرتی ملے آکاش سے'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ ان سبھی ڈراموں میں مصنف نے اپنے تلخ اور شیریں تجربات کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

اکبر جے پوری کہنہ مشق شاعر تھے ۲۰۱۳ء میں انکے وارثین نے ''ملاپ'' کے عنوان سے ان کا ایک طویل ریڈیائی ڈراما منظر عام پر لایا۔ یوں تو اکبر جے پوری نے غزل، مرثیہ، سلام و دیگر شعری اصناف کے ساتھ ساتھ بہت سارے ریڈیو ڈرامے اور فیچر بھی لکھے ہیں جو ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر بھی ہوئے، مگر بد قسمتی سے ان کے مسودات محفوظ نہ رہ سکے۔

سجود سیلانی (۱۹۳۶) کشمیری اور اُردو میں لکھتے ہیں۔ ''شاہکار'' کے عنوان سے ان کے اُردو ڈراموں کا ایک مجموعہ ہے، جس میں پانچ مختصر مزاحیہ ڈرامے پیش کیے گئے۔ اس مجموعے کا حرفِ اول ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور تعارف پران کشور نے لکھا ہے۔[۱۱] پہلا ڈراما مجنوں کا مقدمہ ایک طنزیہ ڈراما ہے اور اس میں مزاحیہ انداز میں زندگی کے بدلتے ہوئے رنگوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ''شاہکار'' آرٹسٹوں کی زندگی کے مسائل پر لکھا گیا ایک ڈراما ہے۔ اس مجموعے میں شامل تمام ڈراموں کے موضوعات ہلکے پھلکے ہیں مگر کسی مخصوص طبقے یا کلچر کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں، البتہ یہاں مجموعی طور پر انسانی نفسیات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مکالموں میں مزاح اور طنز کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ صرف تین سے چھ کردار ان ڈراموں میں پیش کیے گئے ہیں۔ زبان شستہ اور موزوں استعمال کی گئی۔

''جلترگ'' سجود سیلانی کا لکھا ہوا تین ایکٹوں پر مشتمل ایک مکمل ڈراما ہے، جسے انہوں نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔

سجود سیلانی نے اس ڈرامے کا مرکز ایک گاؤں چمن پور بنایا ہے۔ یہ دراصل کوئی

مخصوص گاؤں نہیں ہے، بلکہ مجموعی طور پر یہ سارا بھارت ہے، جہاں مختلف طبقوں، نسلوں، مذہبوں اور ذاتوں کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے زندگی کے بیشتر معاملوں میں مختلف ہونے کے باوجود بھی انکی روایتیں یکساں ہیں۔ قدریں یکساں، غرضیکہ وہ ایک دوسرے سے کندھا سے کندھا ملا کر چلتے ہیں۔

چوپال اس گاؤں کا مرکز ہے، جہاں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں یا گاؤں کی برادری اکٹھا ہوتی ہے۔

''جلترگ'' ایک مکمل ڈراما ہے اور اس میں مختلف طبقوں کی آپسی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے سترہ سے زائد کردار ہیں، اس کے علاوہ کئی خاموش کردار بھی ہیں، جنہیں صرف ہجوم کو دکھانے کیلئے اسٹیج پر لایا جاسکتا ہے۔ اسٹیج کے ساتھ ساتھ معمولی تبدیلیوں کے بعد اسکو اسکرین پر بھی بہ آسانی دکھایا جاسکتا ہے۔ اس ڈرامے کا ہیرو اگرچہ ندیم ہے، لیکن مرکزیت ملنگ باوا کو ہی حاصل ہے۔ ملنگ باوا کی زبان صوفیانہ ہے۔ کبھی وہ خالص اُردو زبان بولتا ہے اور کبھی ہندی آمیز۔ لاجونتی کے مکالمے اس ڈرامے میں اسکے کردار کے مطابق بھوجپوری میں لکھے گئے۔ وہ خالص ایک دیہاتی ہندو لڑکی ہے۔ اسکے ساتھ ڈاکو بھی اُسی لہجے میں بات کرتے ہیں۔ کرتار سنگھ اور اسکا بیٹا امر سنگھ پنجابی آمیز اُردو بولتے ہیں۔

بشیر شاہ بنیادی طور ایک کہانی کار ہیں۔ ان کے افسانوں مجموعہ ''شب کے سمندر میں'' اور ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ''بارش کا پہلا قطرہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی کیلئے بھی بہت سارے ڈرامے اور فیچر لکھے۔ ''میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی'' اور ''سفرِ زندگی'' ان کے دو اہم ڈرامے ہیں۔

ویریندر پٹواری (۱۱ر ستمبر ۱۹۴۰) کا تعلق ایک کشمیری اہل علم پنڈت گھرانے سے ہے۔ اور انہیں علم و ادب ورثے میں ملا۔ پیشے سے ایک انجینئر اُردو، ہندی اور کشمیری میں لکھتے ہیں۔ انکے ادبی کارناموں کی تفصیل ہمیں دیپک بدکی یوں فراہم کرتے ہیں۔

''پٹواری نے ۱۳ ریڈیو ڈرامے ۶ اسٹیج ڈرامے، ۷ ٹیلی ویژن

ڈرامے، ۶ ٹیلی فلمیں اور ۴ ٹیلی سیریل بھی قلم بند کیے ہیں۔ انہوں
نے کشمیری میں بھی ۹ ٹیلی سیریل لکھے ہیں۔ ایک فلم اور دو
ڈوکیومنٹری کے خالق بھی ہیں''۔[12]

''آخری دن'' ویریندر پٹواری کے ان ۶ ڈراموں کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے ٹی۔وی اور ریڈیو کیلئے لکھے ہیں، مگر پھر بھی ان میں سے اگر چند ڈراموں کی کچھ کاٹ چھانٹ کی جائے گی، تو انہیں اسٹیج پر بھی کھیلا جا سکتا ہے۔

یوں تو یہ سبھی ڈرامے بڑے سنجیدہ ہیں اور موجودہ دَور کے معاشی، معاشرتی اور سماجی حالات کی حقیقت پیش کرتے ہیں، مگر اس مجموعے میں شامل دوسرا ڈراما ''گھر'' کچھ اس قدر سنجیدہ اور فنکارانہ طور پر لکھا گیا ہے، جسے ہم جدید یورپی طرز یعنی ''ایپک تھیٹر'' کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔ یہ ڈراما اس دور کا رزمیہ پیش کرتا ہے، جس میں ایک طرف لوگ گھر میں بسنے کیلئے تڑپ رہے ہیں، تو دوسری طرف ان گھروں کے موضوع پر فلسفہ جھاڑا جاتا ہے۔ ان کے آرکی ٹیکچر پر تھیسس لکھا جاتا ہے۔ گھر کے سماجی پہلوؤں پر بحث ہو رہی ہے۔ گھر کے نام پر یا رہنے کیلئے بڑے بڑے ہوٹل، سرائے، دھرم شالہ اور نہ جانے کیا کیا بنایا جاتا ہے، اس کے باوجود یہ حال کہ بہت سارے لوگوں کو فٹ پاتھ پر سونا پڑتا ہے۔ یہی رزمیہ ہے اس ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل باقی ڈراموں کی تکنیک ٹیلی ویژن ڈراما کے فن کے مطابق ہے۔ ان ڈراموں کے موضوعات دل دہلانے والے ہیں۔ پہلا ڈراما ''ماں'' کے عنوان سے ہے، جس کی کہانی ایک ''پگلی عورت'' ''ماں'' کے اردگرد گھومتی ہے۔ ڈرامے کا ہیرو ڈاکٹر آنند ہے۔ یہاں مصنف نے ایک خاص نظریہ کا تجزیہ کیا ہے اور ہماری توجہ بھی ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کرائی ہے، جس میں ہم کسی آوارہ یا بے کس ابنارمل انسان کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں۔

تیسرا ڈراما ''کوئی نہیں میرا'' بھی ایک ٹی وی ڈراما ہے، جس کے بیشتر مناظر فلش بیک میں پیش کیے گئے۔ یہ ایک ایسے شخص کا المیہ ہے، جو بھائی، بیوی، والد اور سبھوں کا

ہمیشہ مخلص اور سب کا ہمدرد ہوتا ہے، لیکن بد قسمتی سے غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا ''آندھیاں'' ہمارے اس معاشرے کے پھوڑے پر نشتر چبھوتا ہے، جو مغرب زدگی کا شکار ہو گیا ہے۔ جہاں وہ باپ اب بے بس ہے، جس نے خود اپنے ہاتھوں سے زہر کے پودے کو سینچا ہے۔

ڈراما ''پاگل منوا پیاسی آنکھیں'' میں سنگیت کی اہمیت کو دکھایا گیا ہے۔ یہ ڈراما اصل میں پٹواری کی ایک مطبوعہ کہانی (فلمی تصویر اپریل ۱۹۸۳ حیدر آباد) بہ عنوانِ پیاسی آنکھیں'' پر مبنی ہے۔

اس مجموعے میں شامل آخری ڈراما ''آخری دِن'' کے عنوان سے ہے، جو اس کتاب کا Title بھی بنا۔ یہ ایک ریڈیائی تمثیل ہے، جس میں اندھی لڑکی (دنیا) بوڑھا (وقت) بڑھیا (زندگی) ایک راجہ (حال) دوسرا راجہ (حال) پہلا نمائندہ (پہلے راجہ کا نمائندہ) دوسرا نمائندہ (دوسرے راجہ کا نمائندہ) ایک بچہ (مستقبل) دوسرا بچہ (مستقبل) تیسرا بچہ (مستقبل) اور بھی مختلف آوازوں کو علامتی طور پر پیش کیا گیا ہے، جس میں ملکی و بین الاقوامی حالات اور جنگ و جدل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے مقصد جب فن پر غالب آگیا، تو یہاں کوئی منظم پلاٹ واضح نہ ہو سکا۔ مظہر امام نے ویریندر پٹواری کے بارے میں کیا خوب رائے دے دی ہے:

> ''پٹواری کے افسانوں اور ڈراموں میں اُس انسان کی روح کا اضطراب ملتا ہے، جو حالات اور حادثات کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے، لیکن پھر بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کو آمادہ نظر نہیں آتا۔ اس کا آخری دن بھی ایک نئی کشاکش کا پہلا دن ہے۔ پٹواری کی علامتیں کہیں سورج کی دوسری کرن کی طرح روشن ہیں اور کہیں یہ علامتیں کہساروں کے درمیان ڈوبتی شام کے عکس کی طرح دھندلکوں کی چادر میں لپٹی ہوئی ہیں''۔[۱۳]

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کشمیری ادب میں ہیرا لال کول کافر ایک اہم نام ہے۔ ان کے بہت سارے افسانے شائع ہوئے اور ٹی وی کیلئے بھی انہوں نے کچھ ڈرامے

لکھے۔ وہ بڑے مزاحیہ انداز میں اپنی عصری زندگی کی ناہمواری پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔ ''رام بھروسے'' کے عنوان سے ان کا ایک ٹیلی ویژن سیریل ۲۰۰۴ء میں کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ گیا۔

اس کتاب میں بہت سارے چھوٹے چھوٹے مزاحیہ ٹی وی ڈرامے ہیں جن میں ''رام بھروسے'' مرکزی کردار ادا کرتا ہے اور ہر ڈرامے کے پلاٹ میں ان سے متعلق واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سیریل یا مجموعہ ہمیں فسانہ آزاد (پنڈت رتن ناتھ سرشار) اور چچا چھکن (سید امتیاز علی تاج) کی یاد دلاتا ہے۔ اس مجموعے کے پہلے ڈرامے میں ''رام بھروسے'' کو ان کے بچے ایک کتا لانے کیلئے مجبور کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ کتے کی جگہ گھر میں بھینس لانے کا مشورہ اپنے گھر والوں کو دیتا ہے تاکہ انہیں تازہ دودھ ملے، مگر گھر میں ان کی کسی نے نہ سُنی۔ کتا لا کر وہ اپنے لئے پریشانی مول لیتا ہے، کیونکہ وہ کتا انہیں کاٹتا ہے۔

دوسرے ڈرامے میں وہ اپنی زندہ ماں کا بت بنانا چاہتا ہے۔ تو ماں کو اپنے پاس بٹھا کر وہ اس پر پلاسٹر چڑھا دیتا ہے۔ وقت پر قینچی نہ ملنے کی وجہ سے وہ پلاسٹر سیٹ ہو جاتا ہے۔ اتنے میں انکے گھر میں ان کا ماموں جان اپنی بہن سے ملنے کیلئے آ جاتا ہے۔ اسی کشمکش میں ڈراما آگے بڑے مزاحیہ انداز میں بڑھتا ہے۔ پھر بڑی مشکل سے ماں کی جان بچائی جاتی ہے۔

اس مجموعے میں شامل ایک اور سیریل میں ''رام بھروسے'' اپنی بیوی بچوں سے تنگ آ کر موت چاہتا ہے، جب یم دوت آ کر اسے کہتے ہیں کہ تمہارے مرنے کا ٹائم آ گیا ہے۔ رام بھروسے ان کو باتوں میں اُلجھاتا ہے۔ اسی اثنا میں اس کا وقت نکل جاتا ہے اور وہ بچ جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں انہوں نے زیادہ تر اس دنیا میں ہو رہی رشوت خوری اور لالچ کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں شامل آخری ڈراما بھی بڑا دلچسپ ہے، جس میں ''رام بھروسے'' کے گھر میں چوری ہو جاتی ہے، تو وہ اپنے دوست شیام لال (جو کہ ان ڈراموں میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے) سے صلح و مشورہ کر لینے کے بعد پولیس تھانے رپوٹ

لکھوانے کیلئے جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ایک تو پولیس اس چوری کا الزام شیام لال کو دیتے ہیں، دوسرا یہ کہ اسی وقت پولیس کو فون آجاتا ہے کہ میڈم کا کتا غائب ہو گیا ہے، تو وہ لوگ رام بھروسے کو چھوڑ کر میڈم کا کتا ڈھونڈنے کے لئے جاتے ہیں۔

ہیرالال کافر کے ان سبھی ڈراموں میں انکے مرکزی کردار یعنی ''رام بھروسے'' کی زندگی کے بہت سارے پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے، جن میں انکی نا تجربہ کاری، زندگی کی تلخی، اس کا چڑچڑاپن، سماج کی ناہمواری وغیرہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر تھیٹر یا فن ڈراما کے نقطۂ نظر سے ہم ان ڈراموں پر ایک نظر ڈالیں گے، تو یہاں ہم انہیں کسی بھی زمرے میں فِٹ نہیں پاسکتے ہیں۔ نہ یہ یک بابی اسٹیج یا ریڈیو ڈرامے ہیں، نہ یہ ایک مکمل ٹی وی سیریل ہے، جس کا پلاٹ منظّم ہے۔ یہ الگ الگ اسٹیج شوز بھی نہیں ہو سکتے ہیں۔

یہ ڈرامے کتابی صورت میں چھپ کر قارئین کو ضرور فرحت پہنچا سکتے ہیں اور سماج کے چھوٹے چھوٹے مگر سنجیدہ مسئلوں پر غور و خوض کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے کتابی صورت میں انہیں چھاپ کر مصنف نے ایک اہم کام سرانجام دے دیا ہے اور ڈرامے کی ایک نئی تکنیک سے بھی ہمیں متعارف کروایا۔ ریاست جموں وکشمیر میں ایسے بھی بہت سارے اُردو ڈراما نگار ہیں، جنہوں نے یوں تو بہت سے ڈرامے لکھے ہیں، پھر ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج پر بھی انہیں پیش کیا اور کہیں کہیں رسالوں میں بھی وہ چھپ گئے، لیکن کتابی صورت میں ان کے ڈراما مجموعے نہیں چھپ سکے۔ اس قسم کے ڈراما نگاروں کی فہرست بہت لمبی ہے، البتہ یہاں اختصار سے ہی کام لیا جائے گا تاکہ مضمون زیادہ طویل نہ ہو جائے۔

پروفیسر ظہور الدین (پیدائش: 1994) کی ڈراما تنقید پر دو کتابیں جدید ڈراما اور حقیقت نگاری حوالہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ڈراما سے متعلق ان کے متعدد تنقیدی مضامین بھی موقر رسالوں میں شائع ہوئے۔ انہوں نے کل ملا کر اُردو میں دس کے قریب ڈرامے لکھے ہیں، جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے اور کچھ ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

ظہور الدین کے ڈراموں کی تکنیک اور ان کے موضوعات دوسروں سے کچھ ہٹ

کر ہوتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے اُردو کے ساتھ ساتھ یورپی ڈراما کا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان کے فن کو اُردو میں اپنی کتابوں اور مضامین میں متعارف بھی کروایا ہے۔ اس لئے ان کے ڈراموں کو ہم بریخت (ایپک تھیٹر) اور بیکٹ (ایبز ڈتھیٹر) کی نظروں سے بھی دیکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنے ڈراموں میں کہیں کہیں اساطیری اور دیو مالائی عناصر بھی ملاتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم ان کے ڈرامے موت کا جریدہ، لندن اور عبرت خیز ہے تیرا افسانہ پیش کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف انکا ایک طویل ڈراما ''نئی دنیا'' کے عنوان سے ہے جس میں سائنس فکشن کے تحت وہ حیرت انگیز باتوں کو پیش کرتے ہیں۔ جہاں آج کا افسانہ قدرت کا مقابلہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔

ظہور الدین کا ڈراما ''بریف کیس'' ''رنگ رس، جلد:۱، سال 2013، شمارہ:۲ لٹل تھیپین'' میں (صفحہ ۷۱ تا ۱۰۳) میں شائع ہوا ہے۔ یہ ڈراما ہمارے سماج میں پھیلی بدعنوانیوں اور اساتذہ کی یونینوں کے بارے میں ہے۔ ان اساتذہ کو کن نظروں سے دیکھا جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیے یہ مکالمہ:

> ٹائمز آف انڈیا کا نمائندہ: آپ کو نہیں لگتا ہے کہ آپ کے ان اقدامات کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان ان بچوں کا ہوگا جو زیر تعلیم ہیں اور ان کے والدین کا جو نہ جانے کس کس طرح سے تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ ان کا تو کوئی قصور نہیں۔ انہیں آپ لوگ کیوں سزا دینا چاہتے ہیں۔ (صفحہ ۸۱)

یہ سوال آج ایک اُستاد سے ہر کوئی کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں ڈراما در ڈراما کی تکنیک بھی ہے۔ پندرھویں منظر میں اُستاد اپنے مسائل کو منوانے کے لئے نکڈ کھیلتے ہیں۔ 26 منظروں پر مشتمل اس ڈرامے میں موصوف نے اس Issue پر اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔

ریاض معصوم قریشی ریاست کے محکمہ اعلیٰ تعلیم میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں اور اصل میں وہ کامرس کے طالب علم اور اُستاد ہیں، لیکن اُردو ادب سے انکار لگاؤ کالج کے

زمانے سے ہی رہا۔ 1977ء میں افسانہ نگاری شروع کی اور کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ 1984ء میں ریڈیو سے بھی وابستہ ہوئے اور پران کشور کی تربیت میں آ گئے۔ 1984ء میں ناول ''خیالوں کے قفس میں'' شائع ہوا، جس کا ریڈیو ڈرامائی روپ بھی نشر ہو چکا تھا۔ اردو میں انہوں نے پچاس کے قریب ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے لکھے۔

ان کے ڈرامے اکثر نفسیاتی ہوتے ہیں۔ سماجی موضوعات، طبقاتی کشمکش اور جدیدیت کے حوالے سے کرب ذات کے مسائل بھی چھیڑتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا مشہور ڈراما ''وہ اجنبی اور کتا'' پیش کیا جاسکتا ہے۔

ریاض معصوم قریشی کا ڈراما سفر جاری ہے، اس لئے توقع ہے کہ وہ عنقریب اپنی ڈراما تخلیقات کو کتابی صورت میں بھی منظر عام پر لائیں گے۔

وادی کشمیر کے ایک معروف ڈراما نگار شوکت شہری ہیں جن کو ڈراما نگاری کا فن اپنے والد بجود سیلانی سے ورثے میں ملا ہے۔ ان کے ڈرامے تقریباً پچھلے تیس برسوں سے ریڈیو اور ٹی وی کی زینت بنے ہیں اور کئی ڈرامے سٹیج بھی ہوئے مگر بدقسمتی سے ان کا کوئی بھی مجموعہ ابھی تک منظر عام پر نہ آسکا۔ ان کے ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ہم زندہ ہیں، ایک پوٹلی ارمانوں کی اور منٹو کا فارمولہ بہت مقبول ہیں۔ شوکت شہری زیادہ تر کشمیر کی سوسائٹی سے زندہ کردار تخلیق کرتے ہیں اور عام حالات کو ہی موضوع بناتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ عنقریب ان کے اُردو ڈراموں کا مجموعہ شائع ہوگا۔

کشمیر کے ایک اہم قلم کار، ادبی صحافی اور آرٹسٹ زاہد مختار نے اُردو میں کئی ڈرامے لکھے ہیں اور ساتھ ہی اپنا رسالہ لفظ لفظ بھی نکالتے ہیں۔

مشتاق مہدی نے ۱۹۷۱ء میں لکھنا شروع کیا۔ اُنہوں نے کئی افسانوں کے ساتھ ساتھ چند کامیاب ڈرامے بھی لکھے۔ ''خواب'' اور ''کالے نگر'' کے عنوان سے ان کے دو ڈرامے فنی اعتبار سے اہم تصور کئے جاتے ہیں۔

دبستان جموں و کشمیر میں شیام سندر آنند لہر کا نام بڑا اہم ہے۔ لہر صاحب اُردو کیلئے ایک تحریک سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے افسانہ اور ناول نگاری میں ان مٹ نقوش

چھوڑے۔نروان کے بعد ان کا ڈراما ''تپسوی کون'' بھی منظر عام پر آکر داد حاصل کر گیا۔

ادارہ فکر جدید نئی دہلی کی وساطت سے ۱۹۹۴ء میں یہ ڈراما شائع ہوا۔ یہ سماجی موضوعات پر ایک فکر انگیز ڈراما ہے، جس میں ایک ہی گھر میں ایک بھائی ایماندار ہے اور دوسرا اپنی بے ایمانی سے زندگی میں ترقی کرتا ہے۔اب یہاں کشمکش یہ دکھائی گئی ہے کہ سماج کسی بھی صورت میں حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔جس کی وجہ سے ایک ذی حس انسان کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہی تصادم اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے۔

انیس ہمدانی (۱۹۵۶ء) کا پہلا افسانہ روزنامہ آفتاب میں ۱۹۷۲ء میں ''کشمکش'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسکے بعد وہ ڈرامے لکھنے لگے۔زیادہ تر ریڈیو ڈرامے لکھتے تھے اور اس فن پر کافی گرفت حاصل تھی۔افسوس ۱۹۸۹ء میں اس ڈراما نگار کا انتقال ہوا۔

نذیر جہانگیر تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُردو، انگریزی اور کشمیری میں لکھتے ہیں۔شاعری، افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ''بہتے جسم'' کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی سے مالی امداد لے کر اپنا ایک ٹی وی ڈراما (گیارہ مناظر پر مشتمل) منظرِ عام پر لایا۔

زیرِ نظر ڈراما ایک مزاحیہ ڈراما ہے، لیکن اس میں انہوں نے ایک ایسا موضوع چُنا ہے۔جو مزاحیہ عناصر کے باوجود بھی وہ ایک ایسا سنجیدہ ڈراما معلوم ہوتا ہے، ہمیں نہ صرف ہماری سوسائٹی میں پنپ رہے مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں بلکہ وہ ان مسائل کا حل بھی اپنے نظریئے کے تحت بتاتے ہیں۔

ڈاکٹر عزیز حاجنی کشمیری زبان وادب کے ایک نامور قلم کار ہیں۔ کشمیری زبان کی مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور میڈیا کیلئے بھی لکھتے ہیں اور خود بھی کشمیری زبان وثقافت سے متعلق مختلف پروگرامز کرتے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے ''وتستا کی سیر'' عنوان سے اُردو زبان میں ۱۱ قسطوں اور کئی مناظر پر مشتمل ایک طویل ٹی وی سیریل دور درشن کیندر سرینگر کیلئے لکھا، جو ٹیلی کاسٹ ہونے کے بعد کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔

ہمعصر کشمیری ڈراما میں ایک اہم نام محمد امین بٹ کا آتا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج کے لئے بھی لکھتے ہیں اور خود انہیں پروڈیوس بھی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں ڈراموں میں اداکاری بھی کرتے ہیں۔ کشمیری کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار اپنے مُنہ کا مزہ بدلنے کے لئے اُردو میں بھی لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے قابل ذکر ہیں جن میں سحر ہونے تک، کرن کرن اُجالا، نئی صبح، تلاش، فیصلہ محفوظ ہے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غلام نبی شاہد وادی کشمیر کے ایک معروف افسانہ نگار کا نام ہے اور اِن کا افسانہ ''آجادی'' پچھلے چند برسوں میں اکثر موضوع بحث بنا۔ انہوں نے اُردو اور کشمیری میں ڈرامے لکھے۔ اُردو ڈراما نگاری میں انہوں نے ایک ٹی وی پلے پچاس ہزار، خواب سراب اور زندگی جیسے کامیاب ڈرامے لکھے۔ ریڈیو ڈراما نگاری 1979ء میں پران کشور کی نگرانی میں شروع کی اور کشمیری فلم ''پرتو'' بھی لکھی۔ اس کے علاوہ ان کے ریڈیو پروگراموں میں ڈاکٹر بغیر سرحد (سریل) ''اَنہٕ ڈب'' وغیرہ مقبول ہوئے۔ پران کشور کے ساتھ ساتھ ان کے ڈرامے جاوید اقبال اور ارشد مشتاق جیسے ہدایت کاروں کی ہدایت میں پیش کئے گئے۔ شاہد صاحب نے کشمیری زبان میں متعدد ڈرامے لکھے۔

مجید ارجمند وادی نے بھی کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ ''ابابیلوں کی واپسی'' میں افسانے اور ڈرامے موجود ہیں۔ ''دو بہو ہیں'' سماجی موضوع پر ایک مختصر ڈراما لکھا۔

پرویز ملک کا تعلق درہال راجوری سے ہے۔ جموں یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا اور محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ ادبی زندگی کی شروعات شاعری سے کی اور اپنا شعری مجموعہ ''تہہ برف'' شائع کیا ہے۔ ریڈیو ٹی وی اور اسٹیج کے لئے کئی ڈرامے لکھے۔ پہاڑی فیچر فلم ''رقیب'' بھی لکھی۔ ان کے ڈراموں میں فرصت کے رات دِن، ایک چاند دو راتیں، اونچے دروازے، اور ڈراما ''وہ دروزہ کھل جائے گا'' قابل ذکر ہیں۔ ''وہ دروازہ کھل جائے گا'' پر 2014ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے انہیں Best Play کا انعام دے دیا۔ انہوں نے ڈی ڈی اُردو کے لئے کئی ڈراموں کے لئے گیت بھی لکھے، جن میں نیلما (شفقت حبیب کا) وردی، ریکھا (ونود زتشی کا) وغیرہ خاص اہم ہیں۔

اشرف عادلؔ (۱۹۶۶ء) کشمیر کے ایک اُبھرتے ہوئے شاعر اور ڈراما نگار ہیں۔ وادی میں اسٹیج کی عدم موجودگی کے پیش نظر انہوں نے زیادہ تر ریڈیو اور ٹی وی کیلئے ہی ڈرامے لکھے۔ ان کے تین درجن کے قریب (اُردو، کشمیری) ڈرامے ریڈیو کشمیر سے نشر ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا ڈراما ۱۹۹۲ء ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا۔ انہوں نے کشمیر کے روایتی ڈرامے سے انحراف کر کے عالمی سطح کے مسائل پر اپنے ڈرامے رقم کیے جن میں بھوک، عالمی امن، عالمی جنگ اور ایڈس جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ تاریخی موضوعات کو بھی چھیڑتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف انہوں نے اُردو میں حضرت محل (یعنی اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ کی بیگم) جیسا ڈراما لکھا، تو دوسری طرف انہوں نے ''حکم حاکم''، شخصی راج (کشمیر کے حوالے سے) کے ظلم پر بھی ایک ڈراما لکھا۔ انہوں نے فلموں اور ٹی وی چینلوں سے متاثر ہو کر جاسوسی ٹائپ کے ڈرامے لکھے۔ دوردرشن کے لئے اشرف عادلؔ نے بیس سے زائد ڈرامے اور سیریل لکھے، جن میں سفید خون، مسیحا، سودا، اعتبار، انصاف، سایہ وغیرہ اہم ہیں۔

''تمثیلِ داغ'' کے عنوان سے اشرف عادل کا ایک ریڈیائی ڈراما ۲۰۱۲ء میں منظرِ عام پر آ گیا۔ یہ ڈراما بیشتر داغؔ دہلوی کے ہی کردار کے اردگرد گھومتا ہے۔ مصنف نے اس ڈرامے میں راوی کے عمل دخل سے ایکشن کی رفتار کو تیز کر کے ایک تو داغؔ کی زندگی کے اور بھی مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اس میں ہمیں اس دور کی تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی تصویر کی مختلف جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس ڈرامے کا نقطۂ عروج بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

راجہ یوسف کا تعلق کشمیر کے ضلع اننت ناگ سے ہے اور انہوں نے تھیٹر اور ڈراما سے اپنا رشتہ 1986ء میں جوڑا۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں اور افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ کاغذی پیرہن 1988ء میں منظر عام پر آ گیا۔ آج کل ان کے ڈراموں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ ساتھ ہی شاہین اور کنول تھیٹر سے وابستہ ہے۔ ریڈیو ٹی وی اور اسٹیج کے لئے اردو کشمیری میں متعدد ڈرامے پیش کیے۔ ان کے ڈراموں میں زمانے کی ہوا، حساب ماسٹر، سنہرے ورق، آبشار، ست رنگ، رنگ بہ رنگ، وغیرہ خاص اہم ہیں۔ وہ اکثر

تاریخی موضوعات پر کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مجید کا نام ابھی غیر مانوس ہی ہے۔ انہوں نے شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی سے اُردو کے مشہور ڈراما نقاد ڈاکٹر اخلاق آثر کی حیات اور ادبی کارناموں پر Ph.D کیا اور تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا تخلیقی ذہن بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے "دیئے جلتے رہے" کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں اپنے دس افسانوں کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کیا۔ اسکے علاوہ اسی سال "ادھورے خواب" کے عنوان سے ایک مکمل ریڈیو ڈراما بھی کتابی صورت میں منظرِ عام پر لایا۔ کتاب کے حرفِ اوّل میں اجمالاً ڈراما کا تعارف، ریڈیو ڈرامے کی تاریخ اور فن سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ مصنف کو اگرچہ بچپن سے ہی اس فن سے خاص لگاؤ تھا، البتہ ان کی خوش بختی یہ ہے کہ انکے ریسرچ گائیڈ ڈاکٹر وجے دیو سنگھ نے انہیں ایسے موضوع پر کام کرنے کا موقع دے دیا، جس سے وہ اس فن پر ماہرانہ قدرت حاصل کر گئے، ساتھ ہی انہیں ڈرامے لکھنے پر بھی اُکسایا، جسکے نتیجے میں انہوں نے زیرِ نظر ڈراما یعنی "ادھورے خواب"، فنی اور تکنیکی طور پر ایک مکمل ڈراما لکھا۔

ریڈیو ڈراما کی تکنیک کے پیشِ نظر مصنف نے تمام تر اصوات کا اُتار چڑھاؤ موسیقی وغیرہ کا خاص خیال رکھا ہے۔ یہاں ہر کردار اس کی آواز سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

آج کل ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ڈراما لکھنے کی روایت قائم ہے۔ نئے پرانے لوگ مختلف میڈیموں کیلئے ڈرامے لکھتے ہیں۔ ان کے ڈرامے ریڈیو، ٹی وی اور حسب مقدور مختلف اسٹیجوں سے بھی لوگوں تک پہنچائے جاتے ہیں اور مختلف رسالوں یا کتابی صورت میں بھی شائع کئے جاتے ہیں۔

متذکرہ بالا ڈراما نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت سارے ڈراما نگار ہوں گے، جنہوں نے ریاست میں اُردو میں ڈرامے لکھے ہوں گے، مگر مضمون کی ضخامت کے پیشِ نظر اور مواد نہ ملنے کے سبب، ہم اس فہرست کو آگے نہیں بڑھا سکتے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے سے منسلک ہو کر یہاں اُردو دنیا کے اہم لوگوں کو اپنی خدمات انجام دینے کا موقع نصیب ہوا، جن میں

بیرون ریاست کی شخصیات میں خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی، کمال احمد صدیقی، رافعہ منظور الامین، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، کرتار سنگھ دگل، ڈاکٹر محمد حسن، راہی معصوم رضا، آفاق احمد، دانش اقبال وغیرہ چند اہم نام ہیں۔ ریڈیو کشمیر سرینگر سے پہلا اُردو ڈراما خواجہ احمد عباس کا ''چودہ گولیاں'' نشر ہوا[14] ریڈیو کشمیر سرینگر کے ساتھ ہی جموں اور لداخ میں بھی ریڈیو اسٹیشنز قائم کیئے گئے۔ اسی طرح ۱۹۷۳ء میں دوردرشن کیندر سرینگر اور پھر جموں اور لداخ میں بھی ریڈیو اسٹیشنز کی طرح اپنے اپنے دوردرشن کیندر قائم کیئے گئے۔ تینوں خطوں میں مقامی زبانوں کیساتھ ساتھ اُردو ڈرامے بھی نشر اور ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔ کئی مقامی لوگ بھی یہاں کے الیکٹرانک میڈیا کیلیئے ڈرامے لکھنے لگے۔ ان میں سے کچھ نام یوں پیش کیئے جاتے ہیں: ویدراہی، پشکرناتھ، قیصر قلندر، علی محمد لون، بنسی نردوش، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، رام کمار ابرول، لفٹنٹ کرنل سکھ دیو سنگھ، مہیش شرما، جتیندر شرما، سومناتھ زتشی، شبنم قیوم، ستار احمد شاہد، حامدی کاشمیری، شمس الدین شمیم، نریندر کھجوریہ، بشیر شاہ، نور شاہ، وجے سوری، بجود سیلانی، شوکت شہری، ہری کرشن کول، آنند لہر، موہن لال کول، ہردے کول بھارتی، فاروق مسعودی، اشوک جیل خانی، تریلوک داس، مکھن لال صراف، سی ایل شرما، پیارے لعل رازدان، ریاض معصوم قریشی اشرف عادل وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔[15]

۱۹۵۸ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی اس غرض کے ساتھ قائم کی گئی کہ ریاست کے کلچر کو مجموعی طور پر فروغ اس ادارے کے ذریعے دیا جائے۔ جہاں اس موقر ادارے میں مختلف زبانوں کے تصنیفی اور تالیفی شعبۓ قائم کئے گئے ہیں، وہاں کلچر کے فروغ کیلیئے بھی ایک بڑا شعبہ ہے جو فنون لطیفہ سے متعلق مختلف سرگرمیاں انجام دیتا ہے ۱۹۶۳ء سے کلچرل اکیڈیمی ہر سال یہاں مختلف ریاستی زبانوں کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان اردو میں بھی میں ڈراما فسٹول منعقد کرتی آ رہی ہے۔ یہ فسٹول ٹیگور ہال سرینگر اور ابھینو تھیٹر جموں میں بڑی شان سے منعقد کئے جاتے ہیں۔ اس سے یہاں ریاست میں مختلف تھیٹر گروپس وجود میں آ گئے۔ جس کے نتیجے میں اچھے اچھے ڈراما نگار اور اداکار پیدا ہوئے گے ۱۹۶۰ میں کشمیر

میں کشمیر کلا کیندر ایک تھیٹر گروپ وجود میں آگیا اور اس کے ساتھ بڑے بڑے ڈراما نگار وابستہ ہو گئے۔

۱۹۶۱ء میں سرینگر میں ٹیگور ہال تعمیر کیا گیا۔ اس سے کشمیر میں تھیٹر کے حوالے سے خاص تبدیلی آگئی، کیونکہ پہلی بار یہاں ڈرامے کو جدید سائنسی تکنیک پر کھیلا اور دیکھا گیا۔ اب باضابطہ طور اسٹیج، پردہ، پروسینیم، گرین روم، لائٹ میوزک سسٹم، آواز کے لئے مائک اور حاضرین کے بیٹھنے کیلئے نشستیں وغیرہ موجود ہیں۔ جموں میں بھی ابھینو تھیٹر قائم کیا گیا۔

کلچرل اکیڈیمی نے تھیٹر اور ڈراما کے حوالے سے کئی ورکشاپ اور سمینار منعقد کئے اور آج بھی ہر سال تھیٹر فسٹول اور ہر سال یکم مارچ ولڈ تھیٹر ڈے بڑی شان سے اکیڈیمی منا رہی ہے۔ جہاں مباحث ہوتے ہیں اور ڈرامے بھی کھیلے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں سرینگر میں Song and Drama Division کی ریاستی شاخ قائم کی گئی جس نے شہروں اور گاؤں میں بھی عوامی بیداری کی مہم چلائی۔

متذکرہ بالا ثقافتی ادارے کے ساتھ ساتھ بہت سارے ادارے اور بھی ہیں، جو ریاست میں ڈراما کے فروغ کیلئے کام کر رہے ہیں۔ مثلاً انفارمیشن، فیلڈ پبلٹی محکمہ، محکمہ پولیس، محکمہ سیاحت، محکمہ صحت اور دیگر محکمہ جات بھی عوام تک ڈرامے کے ذریعے پیغام پہنچاتے ہیں۔

بھوانی یاسر بشیر کشمیر کے چند اور تھیٹر گروپوں کی یوں نشاندہی کرتے ہیں۔ نورنگ ڈرامیٹک کلب سرینگر، درشک ڈرامیٹک کلب سرینگر، جواہر ڈرامیٹک سرینگر، رائل تھیٹر اننت ناگ، نیشنل تھیٹر بڈگام، رنگ منچ سرینگر، سنگم تھیٹر سرینگر، انڈین نیشنل تھیٹر سرینگر، وسنت تھیٹر سرینگر، کامیشور کیندر سرینگر، سنگر مال تھیٹر سرینگر، نٹراج تھیٹر سرینگر، آرٹ تھیٹر، ہمالیہ تھیٹر، کمل تھیٹر، شاہ ڈرامیٹک کلب، کشمیر کلچرل سوسائٹی، پراگاش ڈرامیٹک کلب، شاہین ڈراماٹیک کلب، کشمیر تھیٹر انورتن سٹار، ابھینو بھارتی ڈرامیٹک کلب، ینگ ڈرامیٹک سوسائٹی، کالیداس تھیٹر، منصور ڈرامیٹک کلب، کشمیر ویلی تھیٹر، ممتا تھیٹر، النکار تھیٹر، بھارتیہ کلا منچ، سٹیج

کرافٹ، کشمیر کلا منچ، ایکٹرس کریٹیو تھیٹر، انڈین تھیٹر الائنس، آزاد ڈرامیٹک کلب گاندربل، کنول تھیٹر، کشمیر وجے تھیٹر ساگام، مراز کلچرل اینڈ آرٹ سینٹر شاہ آباد ڈورو، اننت کلا کیندر، مقبول تھیٹر کرالہ واری بڈگام، یاتری تھیٹر بادی پورہ، گلشن ڈرامیٹک کلب چرار شریف، محبوب کلچرل سوسائٹی، مانسبل ڈرامیٹکس صفاپورہ، وہاب ڈرامیٹک کلب حاجن، فردوس گوجری ڈرامیٹک کلب، پہاڑی کلچرل کلب کرناہ، گلشن تھیٹر بالپورہ، بزم ثقافت شوپیان، رزاق ڈرامیٹک کلب ریشی نگر وغیرہ۔[16] اسی طرح جموں میں بھی اس وقت بہت سارے تھیٹر گروپس سرگرم عمل ہیں مثلاً بھورنگی، اجیکا، ڈگر منچ، پنچم، امیچور تھیٹر گروپ (مشتاق کاک) سمو تھیٹر گروپ، ڈوگری سنستھا جموں، نٹ رنگ (بلونت ٹھاکر) وغیرہ[17] تھیٹر کے زوال کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ اور یہی باتیں جموں و کشمیر تھیٹر اور یہاں اُردو ڈراما و تھیٹر کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے: طارق احمد بٹ کا بیان ہے:

" Time was when 'Stage Drama' was the Jewel in Theatres Crown in Kashmir. During the 1980 and 90's, however, the form went into decline as brodcasters dished out series or serials on Radio and TV. After 1980 due to the threat from electronic mediá, theatre started struggling for its survival. Many of the renowned theatre artists switched over to films and TV serials. Many of the traditional art forms vanished. This appeared to sound the death knell for the stage drama. But the genre never quite disappeared. Perhaps most importantly, the stage Drama, at its height, encompassed a huge diversity of themes and styles, beyond the endlessly reworked formulae that have come a long way along the revolution of mainstream Tv drama today.(۱۸)

یہ کچھ باتیں اُوپر پیش کی گئی ہیں۔ تھیٹر ڈراما کا زوال کچھ تو ریڈیو اور ٹی وی کی وجہ سے ہوا اور تھیٹر والوں نے پھر ٹی وی کا رُخ کیا۔ ڈراما ختم نہیں ہوا۔ ڈراما اسٹیج کیلئے ہو، نکڑ کیلئے ہو، ریڈیو ٹی وی کیلئے ہو یا پھر کتابی صورت میں چھپنے والا Closet Drama ہو۔ ہر کسی کا اپنا اپنا معیار اور مقام ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آج بھی ایسے تھیٹر موجود ہیں، جہاں تماشابین پیشگی اسٹیج ڈراما دیکھنے کیلئے ٹکٹ لیتے ہیں اور اسٹیج نے ہی نصیر الدین شاہ جیسے فلم

کرافٹ، کشمیر کلا منچ، ایکٹرس کریٹیو تھیٹر، انڈین تھیٹر الائنس، آزاد ڈرامیٹک کلب گاندربل، کنول تھیٹر، کشمیر وجے تھیٹر ساگام، مراز کلچرل اینڈ آرٹ سینٹر شاہ آباد ڈورو، انت کلا کیندر، مقبول تھیٹر کرالہ واری بڈگام، یاتری تھیٹر بادی پورہ، گلشن ڈرامیٹک کلب چرار شریف، محبوب کلچرل سوسائٹی، مانسبل ڈرامیٹکس صفاپورہ، وہاب ڈرامیٹک کلب حاجن، فردوس گوجری ڈرامیٹک کلب، پہاڑی کلچرل کلب کرناہ، گلشن تھیٹر بالپورہ، بزم ثقافت شوپیان، رزاق ڈرامیٹک کلب ریشی نگر وغیرہ۔[16] اسی طرح جموں میں بھی اس وقت بہت سارے تھیٹر گروپس سرگرم عمل ہیں مثلاً بھورنگی، اجیکا، ڈگر منچ، پنچم، امیچور تھیٹر گروپ (مشتاق کاک) سمو تھیٹر گروپ، ڈوگری سنتھا جموں، نٹ رنگ (بلونت ٹھاکر) وغیرہ[17] تھیٹر کے زوال کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔اور یہی باتیں جموں وکشمیر تھیٹر اور یہاں اُردو ڈراما و تھیٹر کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے: طارق احمد بٹ کا بیان ہے:

" Time was when 'Stage Drama' was the Jewel in Theatres Crown in Kashmir. During the 1980 and 90's, however, the form went into decline as brodcasters dished out series or serials on Radio and TV. After 1980 due to the threat from electronic media, theatre started struggling for its survival. Many of the renowned theatre artists switched over to films and TV serials. Many of the traditional art forms vanished. This appeared to sound the death knell for the stage drama. But the genre never quite disappeared. Perhaps most importantly, the stage Drama, at its height, encompassed a huge diversity of themes and styles, beyond the endlessly reworked formulae that have come a long way along the revolution of mainstream Tv drama today.(۱۸)

یہ کچھ باتیں اُوپر پیش کی گئی ہیں۔ تھیٹر ڈراما کا زوال کچھ تو ریڈیو اور ٹی وی کی وجہ سے ہوا اور تھیٹر والوں نے پھر ٹی وی کا رُخ کیا۔ ڈراما ختم نہیں ہوا۔ ڈراما اسٹیج کیلئے ہو، نکڑ کیلئے ہو، ریڈیو ٹی وی کیلئے ہو یا پھر کتابی صورت میں چھپنے والا Closet Drama ہو۔ ہر کسی کا اپنا اپنا معیار اور مقام ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آج بھی ایسے تھیٹر موجود ہیں، جہاں تماشا بین پیشگی اسٹیج ڈراما دیکھنے کیلئے ٹکٹ لیتے ہیں اور اسٹیج نے ہی نصیر الدین شاہ جیسے فلم

ایکٹر ہمیں دیئے۔ اس ریاست نے مکیش رشی جیسے فلم اسٹار پیدا کیئے۔[19]

جموں وکشمیر میں تھیٹر کی مجموعی طور پر صورت حال قدرے اطمینان بخش ہے۔ یہاں ڈرامے لکھے جاتے ہیں اور وہ حسب مقدور کھیلے بھی جاتے ہیں، ریڈیو ٹی وی سے نشر کئے جاتے ہیں۔ یہاں کلچرل اکادمی کی طرح دُور درشن کیندر سرینگر نے پہلا تھیٹر فسٹول ۲۰۰۵ء میں منعقد کیا۔ پچھلے کئی برسوں سے ریڈیو اور دیگر سرکاری رغیر سرکاری ادارے SKICC و دیگر جگہوں پر تھیٹر فسٹول منعقد کرتے ہیں۔ ڈرامے یہاں چھپتے ہیں اور تھیٹر اور ڈراما پر یہاں تحقیقی وتنقیدی کام کیا جاتا ہے۔ نہ ہم ماضی میں پیچھے تھے اور نہ حال میں سست ہیں اور مستقبل میں بھی اسکے روشن امکانات ہمیں نظر آجاتے ہیں۔ آج بھی یہاں اچھے ڈراموں اور ڈرامانگاروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

مشتاق کاک (۱۹۶۱ء) ریاست کے ایک ہونہار با صلاحیت اور قومی و بین الاقوامی سطح کے ڈرامانگار مانے جاتے ہیں۔ ڈراما سے متعلق کئی قومی اداروں سے وابستہ ہیں اور بڑے بڑے ڈراما فیسٹولز میں انہوں نے اپنے ڈرامے پیش کئے اور ملکی سطح کے بہت سارے انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں۔

دسمبر ۲۰۰۶ء میں کلچرل اکیڈیمی ڈراما فیسٹول کے سلسلے میں شوکت شہری کا لکھا ہوا اور مشتاق علی احمد خان کی ہدایت کاری میں انڈین تھیٹر ایلائنس نے ٹیگور ہال سرینگر میں ایک کامیاب اُردو ڈراما "ایک پوٹلی ارمانوں کی" پیش کیا۔ ۱۵رجنوری ۲۰۱۳ء کو جنرل زور اور سنگھ آڈیٹوریم جموں یونیورسٹی میں ایک ڈوگری Docu Drama سیف الملوک شری بوپندر سنگھ کی ہدایت کاری میں ڈوگری سنتھا جموں (۱۹۶۶ قائم شدہ) کی وساطت سے پیش کیا گیا۔ اسکی زبان Mixed تھی۔ اسلئے اُردو والے اسکو ٹھیک طرح سے سمجھ سکے۔[20]

یہ تو ہے جموں وکشمیر میں حال اُردو ڈرامے کا آج تک، لیکن آخر پر یہاں کے اُردو ڈرامے کے حوالے سے میں یہ چند باتیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کشمیر میں فکشن اور ڈراما اکثر چند ہی موضوعات کے ارد گرد گھومتا ہے۔ مثلاً جہیز، جنگل سمگلروں، گاؤں میں نمبردار یا امیر کا عوام کے ساتھ استحصال، پیروں فقیروں کی اچھائیاں اور برائیاں، شہر میں

بے روزگاری، ساس بہو کا جھگڑا، سوتیلی ماں کا رویہ، پہاڑوں یا ڈل میں رہنے والے لوگوں کے مسائل، غریبی، سیاست، وطن پرستی اور قومی یکجہتی وغیرہ۔ ان موضوعات میں سے کچھ موضوعات اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اسلئے بار بار ان کا پیش کرنا کچھ زیادہ دلچسپی پیدا نہیں کرسکتا ہے۔ آجکل انسان گلوبل ویلیج میں رہتا ہے۔ اسلئے اُسے عالمی سطح کی خبر چاہیئے۔

ہمارے اُردو ڈرامے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی طرف کوئی مخصوص ڈراما نگار یا گروپ یا ادارہ توجہ نہیں دیتا ہے۔ یہاں جتنے بھی تھیٹر گروپس ڈراما کھیلتے ہیں، وہ اولین ترجیح مقامی زبانوں کو ہی دیتے ہیں اور کبھی کبھار چند مجبوریوں، ضرورتوں یا پھر شوق کیلئے اُردو ڈرامے بھی کھیلتے ہیں۔ اس بات کے پیشِ نظر اگرچہ یہاں کی مقامی زبانوں کے ڈراما نگار ملکی و بین الاقوامی مسائل کے ساتھ ساتھ جدید تر یورپی طرز کے ڈراموں کا اثر بھی لیتے ہیں۔ اس لئے لایعنی تھیٹر، ایپک تھیٹر، حقیقت نگاری، فیمی نسٹ تھیٹر، آزاد تھیٹر، اسٹریٹ پلے، وغیرہ جیسے ڈرامے ہمیں یہاں کی مقامی زبانوں میں ضرور ملتے ہیں مگر افسوس اُردو میں ابھی بھی ایسے ڈرامے مفقود ہیں۔ اسی طرح یہاں کے مقامی ادیبوں نے اپنی اپنی زبانوں میں سوفوکلیز، شیکسپیئر، بریخت سے لے کر آسبرن Load back anger تک اور بھی بہت سارے یورپی ڈراما نگاروں کے ساتھ ساتھ ٹیگور، کالیداس، اتپل دت، موہن راکیش، بادل سرکار وغیرہ جیسے ہندوستانی ڈراما نگاروں کو بھی منتقل کر کے ان سے اپنے اپنے ڈراموں کیلئے تحریک پائی مگر اُردو والے ابھی بھی اُردو ادیبوں پر ڈرامے لکھتے ہیں یا اُردو کہانیوں کا ڈرامائی روپ پیش کرتے ہیں۔

الغرض اُردو میں ان روایتوں سے ہٹ کر جدید طرز کے بین الاقوامی مسائل و موضوعات اور تکنیک پر ڈرامے ہوں، تب ہمارا اُردو ڈراما پورے اُردو ورلڈ میں سر اُٹھا کر چل سکتا ہے۔[۲۱]

میں نوجوان تھیٹر رائٹر جگل کول کی بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں، ان کے مطابق:

"Present threatre community owes a lot to the ancient masters and contemporary theatre personalities who have propelled this wonderful legacy of Kashmir through tyrannical times and

transitions with eloquent ancient sensibility and exciting panorama around; theatre in Kashmir has a great scope to reach its zenith if not hoarded as a commodity but taken up as a challenging art form."(۲۲)

یہاں ہمارے لئے یہ بھی لازمی بنتا ہے کہ ہم ریاست کی موجودہ تھیٹر سے وابستہ اہم شخصیات کا بھی ذکر کریں:

بھوانی یاسر بشیر ہمعصر تھیٹر میں ایک اہم نام ہے، جنہوں نے نیشنل اسکول آف ڈراما سے تعلیم حاصل کر لی، پھر کلچرل اکیڈیمی سے وابستہ ہوئے۔ مگر چند برس بعد ہی انہیں کسی وجہ سے یہ نوکری چھوڑنی پڑی۔ انہوں نے ایکتا Essemble Kashmir Theatre Akademi کی بنیاد 1988ء میں ڈالی۔ 1990ء میں یہ بند ہوگئی، لیکن بھوانی کی انتھک کوششوں سے 2004ء میں اس کی تجدید نو ہوئی۔ ایکتا آج تک ریاست کے ڈراما کو ملکی سطح پر پیش کر رہی ہے اور یہاں تھیٹر کرنے کے ساتھ ساتھ نئے اداکاروں کے لئے تربیت گاہ کا کام بھی کرتے ہے۔ یعنی یہ کشمیر Theatre in Education(TIE) کا کام بھی دیتی ہے۔

کشمیر کے دوسرے مشہور ڈراما نگار پدم شری موتی لال کیمو ہیں۔ کیمو اصل میں کشمیری ڈراما نگار ہیں اور وہ بھی NSD سے تربیت یافتہ ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی میں انڈیشنل سیکریٹری رہے اور ڈراما نگاری میں کئی انعامات حاصل کئے۔ انہوں نے ''بھانڈ دُہائی'' کے عنوان سے ایک کشمیری فوک ڈراما لکھا، جس کو بعد میں ہندی اور اُردو میں بھی منتقل کیا ہے۔ جسے اُردو میں ''رنگ رس'' کلکتہ نے اپنے (جنوری تا مارچ ۲۰۱۱) شمارے میں شائع کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ بھوانی یاسر نے اس ڈرامے کو ایکتا کے بینر تلے 27 مارچ 2014 کلکتہ کے Sarat Sadan Hawrah میں پیش کر کے داد حاصل کر لی۔ یہ ڈراما کشمیر کے فوک فارم میں تیار کیا گیا ہے۔ مگر اس کا موضوع کشمیر کی ملٹینسی اور اس سے پیدا شُدہ صورتحال ہے۔ اس کے کرداروں میں ماگن (بھانڈ سردار) نندا (ماگن کا بیٹا ملیٹنٹ) بھانڈن (ماگن کی بیوی) مما مسخرا، کمال شیر، سازندے، نٹوے، مسخرے، نقاب پوش وغیرہ

ہیں۔

یہ ڈراما کشمیری تھیٹر میں اپنا منفرد تجربہ ہے۔ یعنی کشمیری تھیٹر فارم اور یہاں کے حالات کو بڑے پُرکشش انداز میں پیش کیا گیا اور یہ کمال ان دونوں کہنہ مشق ڈراما نگاروں کا ہے۔

Amateur Theatre Group کو 1980ء میں آنجہانی رتن کالسی نے جموں میں قائم کیا، جو کہ ایک تجربہ کار فنکار تھے۔ اس تھیٹر کے بارے میں درج ہے:

> "The group is a Laboratory of theatre activities consisting of people from various professional backgrounds namely painters, musicians, actors, film makers and writers."(Little Thspian's 5th National Theatre Festival Kolkata, P-07)

آج اس تھیٹر گروپ کو ریاست جموں وکشمیر کے ایک مصروف ڈراما ڈائریکٹر مشتاق کاک چلا رہے ہیں، جو خود شری رام سنٹر نئی دلی کے ہدایت کار بھی رہ چکے ہیں۔ مشتاق کاک نے اپنے ڈرامے ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پیش کر کے کافی انعامات حاصل کر لئے۔ انہوں نے منٹو کی کہانیوں پر چند یادگار ڈرامے کھیلے۔ اس کے علاوہ شیکسپیر اور ابسن کو ہندوستانی روپ دے کر اسٹیج کیا۔ سنگیت ناٹک اکیڈیمی، ساہتیہ اکاڈمی، کلا پریشد اور ویسٹ زون کلچر سنٹر جیسے ڈراما اداروں کے منتولز میں وہ اپنے ڈرامے کھیلتے ہیں۔

مشتاق کاک کی بیٹی افراح کاک اس وقت جموں یونیورسٹی میں کلچرل آفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ساتھ ہی انہیں ریاست میں پہلی خاتون ڈراما ہدایت کار ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ جس کے لئے انہیں 2012ء میں JKFMAC ایوارڈ دیا گیا۔ انہوں نے اپنے والد کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بی انتھا کرشن، پروفیسر موہن مہارشی، پروفیسر رام گوپال بجاج وغیرہ جیسے لوگوں سے تربیت پائی۔ انہوں نے دو اہم پروجیکٹوں پر کام کیا۔ Self Stories اور کوٹ بلوال سنٹرل جیل میں تھیٹر کا ورک شاپ منعقد کیا۔

ضمیمہ:

کلچرل اکاڈمی کے تھیٹر فیسٹول سلسلے کے تحت ریاست کی باقی زبانوں کے ساتھ

ساتھ ہر سال اردو میں بھی کوئی نہ کوئی ڈراما ٹیگور ہال سرینگر یا ابھینو تھیٹر جموں میں کھیلا جاتا ہے۔اس کے علاوہ دیگر علاقائی تھیٹر گروپس بھی موقع پا کر ریاست یا ریاست سے باہر اپنے اسٹیج شوز کرتے رہتے ہیں۔البتہ ریاست سے باہر انہیں بھی اردو ہندی دونوں کو ایک ہی نام یعنی ''ہندوستانی'' دینا پڑتا ہے۔ان تھیٹر گروپوں میں مشتاق کاک اور ان کی بیٹی افراح کاک Amateur Theatre Group کے ساتھ بڑے شد و مد سے دیکھے جاسکتے ہیں۔اسی طرح ریڈیو، ٹی وی سے بھی اردو ڈرامے نشر ہونے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ادھر یہاں کے مصنفین اپنے ڈراموں کو نشر کروانے کے ساتھ کتابی صورت میں بھی شائع کرواتے ہیں، جن میں (مجھے دستیاب مواد کے مطابق) مرحوم اکبر جے پوری کا ایک طویل ریڈیائی ڈراما ''ملاپ'' کے عنوان سے ان کے بیٹے سلیم جے پوری نے ۲۰۱۳ (صفحات ۱۲۸) منظر عام پر لایا۔اس ڈرامے کی نوعیت تاریخی ہے اور یہ واجد علی شاہ اور اس کے دور کی بازیافت کرتا ہے۔یہ ڈراما ریڈیو کشمیر سرینگر سے برسوں پہلے کئی قسطوں میں نشر بھی ہو چکا۔ اشرف عادل کے ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں کا مجموعہ (تمثیل داغ کے بعد) ''چاند کا ہم شکل'' ۲۰۱۴ میں منظر عام پر آ گیا۔ اس مجموعے میں شامل چار + چار ڈرامے ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہو چکے ہیں اور ان کے موضوعات بالکل اچھوتے ہیں۔۲۱۲ صفحات والے اس مجموعے کے ساتھ راقم الحروف کا ایک طویل مقدمہ بھی ہے۔۲۰۱۶ میں وادی کے نوجوان قلم کار (جو کہ محکمہ پولیس میں آج کل ایس پی کے عہدے پے فائز ہیں) منوج شیری نے ''بچھڑے بکھرے'' کے عنوان سے اپنے ڈراموں ایک گلدستہ کلچرل اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع کیا۔اس مجموعے کے سبھی ڈرامے ریڈیو اور ٹی وی اور اسٹیج کے ذریعے اشاعت سے پہلے لوگوں تک پہنچ چکے ہیں۔ان کے یہ ڈرامے اکثر کشمیریات کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے کشمیریوں کو نفسیاتی الجھنوں یا trauma سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

غرض کہ اس صورت حال کے پیش نظر ہم ریاست میں اردو ڈرامے کے امکانات کو دور دور تک روشن دیکھتے ہیں۔

بحث و مباحث

مشہور ڈراما نگار شکنتلا کے خالق کالی داس نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ مشاہدۂ فطرت کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں اور اس کی خوبصورتی کا عینی شواہد کی طرح بیان کیا۔ خاص بات یہاں یہ ہے کہ انہوں نے زعفران کے تازہ پھولوں کا ذکر اپنی تخلیقات میں کیا۔ اس سے لگتا ہے کہ انہوں نے باضابطہ طور پر کشمیر کی سیر کر لی ہوگی اور اسی بنا پر یہاں کچھ لوگ اس کا وطن کشمیر کا لارگاندربل کا علاقہ مانتے ہیں۔ جبکہ سنسکرت کے محققین نے کبھی بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ وہ لوگ اس کا وطن اُجین مدھیہ پردیش کا علاقہ مانتے ہیں اور یہ زمانہ راجا وکرمادتیہ کا مانا جاتا ہے۔ غالباً ۱۵۰ قبل از مسیح ہوسکتا ہے۔[۴۷] دوسری بات یہ بھی ہے کہ کالی داس کی تخلیقات میں ہمیں کشمیر ہی نہیں، بلکہ جنوبی ہند یعنی رامیشورم اور مغرب میں کوکن اور مشرق میں آسام بھی ملتا ہے۔ کیا اس بات سے ہم یہ مطلب نکالیں گے، کہ ان کا اصل وطن جنوبی ہند یا آسام رہا ہوگا!

آغا حشر کشمیری تھے!

اُردو تھیٹر اور ڈراما میں سب سے زیادہ شہرت پانے والا نام آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۹-۱۹۳۵) کا ہے اور انہیں یہی مقام ہندی ادب میں بھی دیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ ان کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے۔ انکے والد آغا غنی شاہ وادی لولاب سے بنارس تجارت کے سلسلے میں گئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ آغا حشر نے نویں کلاس میں پہلا ڈراما آفتاب محبت لکھا اور ترقی کرتے کرتے اپنے دور کے سب سے بڑے ڈراما نگار بن گئے۔ تھیٹر کمپنیوں میں کام کیا۔ خود کمپنیاں قائم کیں اور فلموں سے بھی وابستہ رہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آغا حشر بہت بڑے عالم تھے، مقرر تھے اور مختلف علوم وفنون اور زبانوں پر ان کی کافی دست رس تھی۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ مذہب کی طرف لوٹ آئے۔[۴۸]

جموں و کشمیر میں اُردو ڈرامہ پر تحقیق وتنقید

اُردو ڈرامے کی تحقیق اور تاریخ نویسی کا سہرا جموں و کشمیر کے ہی سر باندھا جاتا ہے۔

محمد عمر نورالٰہی کی تصنیف ناٹک ساگر (۴۵۶ صفحات) آج سے تقریباً نوے برس پہلے منظرِ عام پر آئی اور آج بھی اس کی حیثیت برصغیر میں ڈرامہ پر Reference Book کی ہے۔

کشمیر یونیورسٹی میں ڈاکٹر طاہرہ عبداللہ نے ستر کی دھائی میں آغا حشر کاشمیری پر Ph.D مقالہ لکھا، جو ابھی شائع نہ ہوا۔ پروفیسر ظہورالدین کی دو کتابیں ''حقیقت نگاری اور اُردو ڈراما'' اور ''جدید اُردو ڈراما'' اُردو میں پہلی بار جدید یورپی طرز کے ڈراموں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ڈاکٹر وجے دیوسنگھ نے ''اُردو اسٹیج ڈراما'' اور ''پروفیسر محمد مجیب بطور ڈراما نگار'' لکھ کر اس ریاست سے باہر بھی داد حاصل کرلی۔

خاکسار نے ابھی تک تین کتابیں ڈارمے پر شائع کیں، اسکے علاوہ ڈراما سے متعلق متعدد مضامین مختلف رسالوں اور جرائد میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ آبگینے۔ سید رسول پونپر۔ پگاہ پبلشر و یجہ بیور کشمیر ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۹۵

۲۔ ہمارا ادب۔ ہم عصر تھیٹر نمبر ۱۱۔ ۲۰۱۰۔ مدیر اعلیٰ محمد اشرف ٹاک۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر ر جموں۔ صفحہ ۵۵

۳۔ ....ایضاً صفحہ ۵۶

۴۔ ....ایضاً صفحہ ۸۹

۵۔ کشمیر میں اُردو۔ پروفیسر عبدالقادر سروری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز جلد ۲۔ ۱۹۸۴۔ صفحہ ۴۷۳

۶۔ ہمارا ادب، ہم عصر تھیٹر نمبر۔ کلچرل اکیڈیمی ۱۱۔ ۲۰۱۰۔ صفحہ ۲۲۹

۷۔ پریم ناتھ پردیسی۔ عہد شخص اور فنکار۔ ڈاکٹر برج پریمی ترتیب و تہذیب ڈاکٹر پریمی رومانی۔ رچنا پبلی کیشنز۔ جانی پور جموں ۲۰۰۹۔ صفحہ ۲۴۔ ۱۲۳

۸۔ کشمیر میں اُردو۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ جلد ۳۔ کلچرل اکیڈیمی جموں و کشمیر صفحہ ۲۶۵

۹۔ نرہری رائے زادہ ایم اے کا ذکر پروفیسر سروری نے کشمیر میں اُردو حصہ سوم میں صفحہ ۲۶۶ اور ۲۶۷ پر منوہری رائے زادہ کے نام سے کیا ہے اور آگے چل کر باقی مصنفین نے بھی یہی نام اپنایا ہے، جبکہ میں نے جو ڈراما کتابی صورت میں انکا دیکھا، اُس پر تو نرہری رائے زادہ لکھا ہے۔

۱۰۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمائے راقم کا مضمون بشمولہ۔ شیرازہ۔ پشکر ناتھ نمبر۔ جلد ۴۹۔ شمارہ ۸، ۹،

مدیر اعلیٰ محمد اشرف ٹاک جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز صفحہ ۱۵۳۔۱۴۶

۱۱ ملاحظہ فرمائیے: شاہکار سجود سیلانی۔ ناشر وانی آرٹ ڈل گیٹ سرینگر ۱۹۷۳

۱۲ عصری تحریریں۔ دیپک بدکی۔ میزان پبلیشرز بٹہ مالو سرینگر ۲۰۰۶ء صفحہ ۵۵

۱۳ آخری دن۔ ویریندر پٹواری۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۴ء صفحہ فلیپ

۱۴ آگہی۔ شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی شمارہ ۳۔ ۱۹۸۲ء صفحہ ۱۳

۱۵ ریڈیو ٹی وی ڈراما نگاروں یا لکھنے والے کی فہرست کافی طویل ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسلئے یہاں انتخاب سے ہی کام لیا گیا ہے۔ ممکن ہے چند اہم نام چھوٹ گئے ہونگے۔

۱۶ ہمارا ادب ہمعصر تھیٹر نمبر ۲۰۱۱ء کلچرل اکیڈمی (مضمون نگار یاسر بشیر بھوانی) صفحہ ۷۷۔۸۱

۱۷ یہ تفصیل مجھے جموں کے مشہور ڈراما ہدایت کار شری بوپندر سنگھ نے فون پر دے دی۔

۱۸. First Theatre Festival 2005. Doordarshan Srinagar P.12.13.

۱۹ کہا جاتا تھا فاروق شیخ کا تعلق نشاط سرینگر سے تھا اور انہوں نے ''نوری'' جیسی کامیاب فلم بنائی۔ سپر اسٹار سلمان خان کو انہوں نے اپنی فلم ''بیوی ہو تو ایسی'' میں پہلی بار متعارف کروایا۔ لیکن قارئین کی اطلاع کے لیے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اصل میں گجرات کے رہنے والے تھے۔ مکیش رشی (پیدائش کٹھوعہ ۱۹۵۶ء) جموں کے رہنے والے ہیں اور انہیں Greater Kashmir نے Son of Soil کشمیر کی آمد پر لکھا۔ آجکل مقبول عام ویلن ہندوستانی فلموں کے مانے جاتے ہیں۔ امریش پوری کے مرجانے کے بعد انہوں نے انکی کمی فلموں میں پوری کی۔ ہندوستانی فلموں میں کام کرنے والے جموں و کشمیر کے اداکاروں کی فہرست بہت لمبی ہے حال ہی میں، فتور نامی فلم میں سرینگر کے ماسٹر ابرار نے کام کیا۔ اداکار مسرو نے بجرنگی بھائی اور پھینٹم میں اہم رول نبھائے۔ فلم ''حیدر'' میں بھی بہت سارے کشمیری ایکٹروں نے کام کیا۔ عامر خان کی سپر ہٹ فلم ''دنگل'' میں سولہ سالہ زائدہ وسیم خان نے گیتا کا کردار ادا کر کے بالی وڈ میں اپنا خاص مقام حاصل کرلیا۔ اسی طرح فلم ''جب تک ہے جان'' میں پہلگام کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے چند شاٹس دیکر شاہ رُخ اور کیٹرینا کیف کو حیرت میں ڈال دیا۔ غرض کہنے کا یہ ہے کہ کشمیری کسی بھی کام میں پیچھے نہیں ہیں۔

۲۰ اس ڈرامے کا بروشر میرے پاس موجود ہے اور اسکے ڈائریکٹر نے بہت سارے اُردو ڈرامے (خاص کر منٹو کی کہانیوں پر) کھیلے۔ کشتواڑ میں ہم نے ''سوگندھی'' دیکھا۔

۲۱ کشمیر کے موضوع پر غیر کشمیریوں جیسے پروفیسر مجیب، کرتار سنگھ دگل، کشمیری لال ذاکر وغیرہ سے اُردو میں ڈرامے لکھوائے گئے، مگر بدقسمتی سے وہ کشمیر کو سیاست کے علاوہ اور کچھ نہ دے سکے۔

۲۲. Sheeraza English, Editor Abid Ahmad. Vol. V, No. 3-4, July-Dec. 2009. Kashmir Theatre An Enchanting .... P:6.

۲۳ء شکنتلا۔ از شاعر اعظم کالیداس منظوم اردو ترجمہ ساغر نظامی ادبی مرکز نئی دہلی اشاعت دوم ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۱-۴۷۔ مزید معلومات کیلئے ملاحظہ فرمایئے راقم الحروف کی کتاب: ادبی افکار اور اقدار۔ ناشر وطن پبلیکیشنز سرینگر کشمیر ۲۰۱۳ء۔

..........☆☆☆..........

ایک ضروری اطلاع

قلم کار حضرات توجہ فرمائیں ہے کہ
''شیرازہ اُردو'' اور ''ہمارا ادب'' کے لئے
اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات / مضامین ارسال کرتے وقت
مندرجہ ذیل معلومات لازمی طور پر فراہم کریں:

☆...... IFSC کوڈ

☆......سولہ ہندسہ بینک اکاونٹ نمبر

☆...... بینک کا نام مع برانچ

مندرجہ بالا معلومات انگریزی میں تحریر فرمائیں۔

☆☆☆☆

سال نامہ "ہمارا ادب"
کی بعض خصوصی اشاعتیں

- ☆ لوک ادب نمبر
- ☆ مشاہیرِ کشمیر نمبر (۲ جلدیں)
- ☆ شیرازہ، انتخاب نمبر
- ☆ جموں کشمیر نمبر (۵ جلدیں)
- ☆ شخصیات نمبر (۵ جلدیں)
- ☆ اولیاء نمبر (۵ جلدیں)
- ☆ ڈوڈہ نمبر
- ☆ مولانا رومی نمبر
- ☆ ہمعصر تھیٹر نمبر
- ☆ فیض احمد فیض نمبر
- ☆ سعادت حسن منٹو نمبر
- ☆ تنقید نمبر
- ☆ کرشن چندر نمبر
- ☆ جموں و کشمیر معاصر نسائی ادب نمبر

......●●●......

ISS No: 2277-9841

Hamara Adab

(ANTHOLOGY- 2016-17

Hum Asar Drama Number

Chief Editor
M. Ashraf Tak

Published by:

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages